
OSMANIA UNIVERSITY
جامعہ عثمانیہ
10528
مجلّہ عثمانیہ

مجلۂ عثمانیہ

(جلد ۱۶ شمارہ ۱)

طلبۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو

محمد علی نیّر ایم اے (آخری)

نائب مدیر

رحیم الدین کمال بی اے (آخری)

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن

مجلس انتظامی

۱۳۵۲ ف

(صدر)

پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی (کینٹب)
نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصۂ اردو)

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصۂ انگریزی)

مسٹر ایم ایس دورے سوامی بی۔ اے (آکسن) ایم۔ اے، ایل۔ ٹی (مدراس) ریڈر انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمن صاحب بی۔ ایس سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد مجلس مشاورت)

مولوی سید محمد یونس صاحب وفا قانی بی۔ اے (عثمانیہ) ایم۔ ایس سی (ڈھاکہ) اے۔ ایم۔ آئی۔ آر۔ ای (لندن)

(معتمد اعزازی مجلس انتظامی)

محمد علی نیتر ایم۔ اے (آخری) مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو

(اراکین)

مسٹر کے آر۔ ریڈی ایم اے (آخری) مدیر حصۂ انگریزی
رحیم الدین صاحب کمال بی۔ اے (آخری) نائب مدیر حصۂ اردو
سعید احمد صاحب مینائی ایم اے (ابتدائی) نائب مدیر حصۂ انگریزی

مجلس مشاورت

(صدر)

پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب

ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی (کینٹب)
نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصّۂ اردو)

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصّۂ انگریزی)

مسٹر ایم۔ ایس درے سوامی بی۔ اے (آکسن) ایم۔ اے ایل۔ ٹی (مدراس) ریڈر انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمٰن صاحب بی۔ ایس سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد اعزازی)

مولوی سید محمد یونس صاحب وفاقانی بی۔ اے (عثمانیہ) ایم۔ ایس سی (ڈھاکہ) اے۔ ایم۔ آئی۔ آر۔ ای (لندن)

اطّلاع

(۱) تمام مضامین نظم ونثر مدیرین متعلقہ کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔
(۲) خریداری اور دیگر امور کے لئے مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ سے مراسلت کی جائے۔
(۳) چندہ کی تمام رقمیں خازن اعزازی مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کی جائیں۔

چندہ

(۱) موجودہ طلباء جامعہ عثمانیہ سے .... للعہ؍

(۲) طلباء قدیم واساتذہ جامعہ عثمانیہ سے .... صمہ؍

(۳) عام خریداروں سے .... لے؍

(۴) فی شمارہ .... عاں؍

سالانہ اخراجات ڈاک حسب ذیل ہونگے اوربصورت منی آرڈر اخراجات ڈاک میں کمی ہوگی۔

۱۔ بذریعہ رجسٹری ایک روپیہ آٹھ آنہ کلدار ۱۲؍ سکہ عثمانیہ۔
۲۔ بذریعہ سرٹفکیٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کی وی۔پی۔ کے اخراجات ۱۴؍ کلدار، ۶؍ سکہ عثمانیہ۔
۳۔ بذریعہ بک پوسٹ ۹۔آنے کلدار ۶ آنے سکہ عثمانیہ۔

ارشادات ہمایونی

حضرت بندگان عالی مدظلہ العالی

کلیہ مسلّمہ دُنیا

آنان کہ در دماغ خُود مادّۂ تکبّر و نخوت می دارند یا جلب منفعت پیشِ نظرِ ایشان باشد یا خُود را عادی زندگیٔ عیش و عشرت ساختہ اند یا قلوب ایشان از خدمت بنی نوع انسان خالیست یا از جوہر ہمدردی و اعانت محرُوم۔ ہرگز در مقاصدِ خود کامیاب نمی شوند یا خود را برائے خدمتِ خلق اللہ اہل ثابت نمی کنند و اصل سبب ناکامیٔ این امور فقدان استقامت مذہب و ہم عقائد باشد و ہم قصورِ ہمت و جرأت در تکمیل امور دینوی کہ حق و صداقت چہ چیز ہست ازان یک لخت آن ہا ناآشنا کہ نتیجہ اش بجز این چیزے دیگر نیست کہ در راہِ ظلمت منزل مقصود را تلاش کناں سرگردان می باشند ازین سبب گفتہ اند کہ "آب حیوان" را بدست آوردن آسان نیست۔ بجُز رہنمائی خضرؑ یا این آن دُرِ شہوار است کہ در قعرِ دریا بہ بطنِ صدف نشستہ است و تا وقتیکہ غوّاص جوہر شناوری نہ نماید آن در کفش نمی آید کہ بغیر زحمت نوالہ ہم در دہان نمی رسد۔

خلاصہ اینکہ انسان را باید کہ حتی الامکان اوصاف برگزیدہ در خود پیدا کردہ دعویٰ نشستن در صف صاحبانِ ضمیر و کردار بہ کند ورنہ بغیر این شرط دعوی او بلا تدلیل ہیچ وقعت نزدِ منصف مزاجان یا عقلائے جہان نمی دارد۔

بہ بہ چہ کلیۂ زرّین است !!

طبع شدہ در اخبار نظام گزٹ یازدہم ذی قعدہ سنہ ۱۳۶۱ ہجری

مسئلہ علم و فضل

لاریب کہ این شیئے گران بہاست و صرف در حصۂ آن ہا (بہ حصۂ رسدی) می آید کہ فطرتاً برائے این "عطیۂ قدرت" مخلوق گشتہ اند و بہ طرفِ دیگر تکمیل ہمہ امورِ دینی باشند یا دنیوی بر آن منحصر ازین سبب گفتہ اند کہ انسان بغیرِ علم و فضل و ادراک ما فیہا از صفتِ انسانی متصف نمی شود (در صحیح مفہوم) و ہم خدا و رسولؐ را نمی شناسد و آنچہ فرائض کہ بر دوشِ او عائد اند بجائی ایشان از و ناممکن تا وقتیکہ شعورِ نزاکتِ آن ہا بہ ذاتِ خود نمی دارد۔

خلاصہ اینکہ این آن شیئے کمیاب ہست کہ در حصولِ آن تگ و دو بسیار کردنیست تا آنکہ او در دامِن مرادِ بہ افتد۔ دیگر از علم و فضل منصب یا منزلت انسان شناخت کردہ شود کہ او چہ پایہ درمیان ابنائے جنس یا بنی نوع انسان می دارد۔ الحاصل ضرورتِ علم و فضل در این دنیا از حد ضروریست خصوصاً می بینیم کہ حالات عالم را چہ تغیر دامن گیر شدہ است و ہم بہ چہ رنگ واقعاتِ گیتی قلا بازیان می خورند کہ در این سیلاب صرف اقدام آن گروہ بر جادۂ استقامت می مانند کہ دل و دماغ ایشان از ضیائے علم و فضل منور ہست و ہم آن ہا مادۂ غور و فکر یا بالغ نظری در فن رائے زنی بر امورِ متنوعہ می دارند ورنہ ممکن نیست کہ از گرداب انتشار ایشان رہائی یابند کہ طوفانِ باد و باران بہ شدّ و مدّ نمودار شدہ است کہ کشتی بانی بہ پیشِ این موانعات خیلے دشوار می نماید لہٰذا ضرورت است کہ بہ عقل و تدبیر کار کردہ زورق را بہ ساحلِ سلامتی بہ رساند و این خدمتِ مدبّرین یا عقلائے جہان است۔

طبع شدہ در اخبار صبح دکن چہاردہم ذی قعدہ ۱۳۶۰ھ

فہرست مضامین مجلّہ عثمانیہ

جلد (۱۶) شمارہ (۱)

فکر و نظر

اداریہ

حرفِ آغاز

مجلہ عثمانیہ کی عمر کچھ زیادہ نہیں ۱۳۳۶ف میں وہ ترقی پذیر رجحانات کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا تھا۔ زندگی کی ہر منزل میں وہ اربابِ علم و فضل کی توجہات کا مرکز بنا رہا۔ محققین نے اس کے تحقیقاتی کارناموں کا اعتراف کیا، مورخین نے اس کی تنقیدی صلاحیتوں کو سراہا، انشاپردازوں نے اِس کے زاویۂ فکر کی پذیرائی کی، شعراء نے اس کے جمالیاتی احساس کی داد دی ——— غرض یہ کہ اِس نے اس نوعمری میں ترقی کے جو منازل طے کئے اور جو شہرت و مقبولیت حاصل کی وہ ہر طرح قابلِ لحاظ ہے۔ اب وہ نئے عزائم، نئے جوش اور نئی امیدوں کے ساتھ زندگی کی سو طویں بہار آفریں منزل میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کا مستقبل حال سے زیادہ تابناک ہے۔

مضامین

مجلہ کی زیرِ نظر اشاعت میں قابلِ قدر مضامین اور بہترین ادبی کاوشوں کو شریک کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، ساتھ ہی تنوع کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ "سراج اورنگ آبادی" پروفیسر محمد عبد القادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل۔ بی (عثمانیہ) صدر شعبۂ اردو و فارسی جامعہ میسور کا مضمون ہے۔ سراج اُردو کے با عظمت شاعر ولی اورنگ آبادی کے جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا مسلک و مشرب

صوفیانہ تھا۔ پروفیسر سروری صاحب نے سراج پر مکمل تحقیقاتی کام کر کے ادب کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ موصوف کا مرتبہ "کلیات سراج" مجلس دکھنی مخطوطات حیدرآباد کی جانب سے خاص اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔" ادب میں برائی کا عنصر" جناب عبدالقیوم خاں صاحب باقی ایم۔ اے (عثمانیہ) کا معلومات آفریں مضمون ہے۔ ادب کیا ہے؟ کیا برائی خیر سے قوی تر ہے؟ زندگی کے تخریبی عناصر ادب میں کس طرح مقبول بنائے جاتے ہیں؟ یہ وہ امور ہیں جن سے اس مضمون میں نہایت سنجیدگی سے بحث کی گئی ہے۔" ادب" باقی صاحب کا محبوب موضوع ہے اور ان کی فکر کی گہرائی واسلوب بیان کی سنجیدگی پڑھنے والے کے احساس وشعور کو حد درجہ متاثر کرتی ہے۔" ادب اور زندگی" میں جناب سید محمد یوسف صاحب ناظم متعلم ایم۔اے نے ادب سے متعلق مختلف ادیبوں اور شاعروں کے اقوال پیش کرتے ہوئے ادب و زندگی کے باہمی تعلق اور ادب کے جدید رجحانات سے بحث کی ہے۔" توازن تاریخ و حدیث" ایک محققانہ مضمون ہے جس میں شعبۂ دینیات کے ہردلعزیز لکچرار مولانا محمد علی صاحب نے ٹھوس دلائل اور مختلف نظریوں کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ حدیث کو دیگر علوم پر فضیلت و فوقیت حاصل ہے۔ حکمیاتی مضامین میں" فلسفۂ حیاتیات" باوجود فنی ہونے کے عام فہم ہے۔ پروفیسر محمد سعیدالدین صاحب ایم۔اے صدر شعبۂ نباتیات فنی مضامین عام فہم انداز میں پیش کرنے کا سلیقۂ جمیل رکھتے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے یہ ایک قیمتی مضمون ہے۔ دیگر حکمیاتی مضامین میں" مچھلیوں کی دلچسپ آوازیں" اور" سیلیلوز اور اس کی صنعتیں" بھی بے حد دلچسپ ہیں۔" وہ جو حاصل نہیں ہوتا" جناب لطیف احمد صاحب فاروقی ایم۔ اے' ایل ایل۔ بی (عثمانیہ) لکچرار ادبیات فارسی کی نشری تقریر ہے جو انھوں نے کل ہند اردو کانفرنس و مشاعرہ منعقدۂ بنگلور کے سلسلہ میں نشرگاہ میسور سے نشر فرمائی تھی۔ اس تقریر میں موصوف نے اُردو کے تمام

خدمت گزاروں کی توجہ ایک اہم اور ناگزیر ضرورت کی طرف مبذول فرمائی ہے گزشتہ ربع صدی میں گو ہمیں کوئی شکایت نہیں کہ اردو کے مختلف اصناف نظم و نثر میں قابل لحاظ ترقی ہوئی لیکن اس امر کا افسوس ہے کہ سنجیدہ مضمون نگاری کی جانب اب تک کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ چنانچہ فاروقی صاحب نے اس کمی کی طرف لطیف اشارہ کرتے ہوئے اس خصوص میں ایک جامع نمونہ بھی پیش فرمایا ہے ہمیں امید ہے کہ وہ اس ایک ہی نمونہ پر اکتفا نہ فرمائیں گے بلکہ ایسے کئی اور نمونوں سے اس باب میں ادیبوں کی رہنمائی فرمائیں گے۔

ہمیں یقین ہے کہ برادران جامعہ ان تمام مضامین کا دلچسپی سے مطالعہ فرمائیں گے۔

افسانے

حسب روایات قدیم اس سال بھی افسانے کثیر تعداد میں وصول ہوئے بعض افسانوں کے کردار مافوق الفطرت عناصر تھے۔ اور بعض میں طلسماتی ماحول پیش کیا گیا تھا۔ انسانی ذہن نے افسانوں کی تخلیق میں ہمیشہ مسرت محسوس کی ہے۔ قدیم زمانے میں افسانہ نگار کسی خاص اصول کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ زمانہ بدل گیا۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ افسانے کے رجحانات بھی بدل گئے۔ اب ہر بے تکی تحریر پر افسانہ کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ افسانہ نگاری اس قدر آسان نہیں جیسا کہ بالعموم سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک مستقل فن ہے۔ موجودہ زمانے میں طلسمی کرداروں کی کوئی اہمیت نہیں آج افسانہ نگاری کی نگاہوں کا مرکز بھوت اور چڑیل یا جن و پری نہیں بلکہ تمدن و معاشرت کے مختلف پہلو ہیں۔ زندگی کی عکاسی ہی اس کے نزدیک افسانے کا مقصد ہے۔

ہمیں چند ایسے افسانے بھی وصول ہوئے جو آرٹ برائے آرٹ کے ترجمان تھے۔ آرٹ برائے حیات اور آرٹ برائے آرٹ دو مشہور نظریے ہیں جن میں ہمیشہ تصادم ہوتا رہا ہے۔ فن کاروں نے انہی نظریوں کے تحت اپنی ذہنی صلاحیتوں سے ایک طرف نوع انسان کی اخوت و مساوات، اتحاد و ارتباط، ایثار و قربانی، نیکی و بلندی اور اخلاق و روحانیت کی طرف رہنمائی کی ہے تو دوسری طرف سے انھوں نے عریاں نگاری،

لذت پرستی اور صنفی جذبات کو اجاگر کرکے انسانیت کو گمراہ کیا ہے۔

آرٹ میں تعمیر و تخریب کی زبردست قوت ہوتی ہے۔ وہ آرٹ جس کی بنیاد اخلاق یا روحانیت پر ہوتی ہے پیغمبرانہ شان کا حامل ہوتا ہے۔ ایسا آرٹ نوع انسانی کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے، فکر و نظر میں وسعت پیدا کرتا ہے، ایثار و اخوت کے جذبات کو تقویت پہنچاتا ہے اور محبت و مسرت پیدا کرتا ہے۔

وہ آرٹسٹ جو تمدنی اقدار اور اخلاقی ذمہ داریوں کو پورے طور پر محسوس کرکے انسانی زندگی کے سنجیدہ اور مہتم بالشان مقاصد کو ملحوظ رکھکر اپنی الہامی صلاحیتوں، مخفی قوتوں اور تخلیقی استعداد کے ذریعہ تخیلی پیکروں کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے وہ اپنی فنی تخلیق کے ساتھ خود بھی غیر فانی ہو جاتا ہے۔

وہ آرٹ جو روحانیت سے عبارت نہ ہو اور جو متعین اخلاقی مقاصد کا حامل نہ ہو وہ نہ تو بجائے خود کوئی قابل قدر کارنامہ ہے اور نہ اسے ابدیت حاصل ہوسکتی ہے اور نہ یہ انسانیت کے لئے سودمند ہوسکتا ہے۔

افسانوں کے انتخاب میں ہمیں کافی حزم و احتیاط سے کام لینا پڑا۔ "نکتہ چیں ہے غمِ دل" محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی ایم۔اے (عثمانیہ) کی قلم کاری کا نتیجہ ہے۔ یہ افسانہ مغرب کی نام نہاد تہذیب اور نمایشی زندگی پر ایک کاری ضرب ہے۔ محترمہ نقوی صاحبہ جامعہ عثمانیہ کی فارغ التحصیل خواتین میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ ان کا اسلوب بیان شگفتہ اور پاکیزہ ہے۔ "آرٹ اور زندگی" کو جناب امجد یوسف زئی صاحب متعلم ال ال۔بی نے راست مرہٹی زبان سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ اِن افسانے میں آرٹ اور زندگی کے مخصوص تقاضوں سے انوکھے انداز میں بحث کی گئی ہے۔ یہ افسانہ آرٹ کی طرح حسین اور زندگی کی طرح دلچسپ ہے۔

منظومات حصۂ نظم کا آغاز جامعہ کے نامور شاعر جناب صاحبزادہ میر محمد علیخاں صاحب میکش کے ایک شہ پارے سے کیا جا رہا ہے میکش کی شخصیت ہندوستان گیر شہرت کی حامل ہے۔ اس نظم میں انہوں نے حیات اور اسرار حیات کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے دو سالہ بچّے کے توسط سے نئی نسل کو عزم بلند اور سخت کوشی کا پیام دیا ہے۔ یہ نظم حُسنِ تخیل اور حسنِ بیان کے امتزاج کا ایک شاہکار ہے۔ "ستارے" جناب مخدوم محی الدین صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) کی جدت طراز طبع کا ایک مثالی مظہر ہے۔ قلبی واردات و نفسیاتی حقائق اور رومانی و سماجی تصورات کی ترجمانی کیلئے ان کا جدّت آفریں تخیل نئی نئی راہیں پیدا کرتا ہے۔ ان کا مخصوص اسلوب بیان انسانی روح میں ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ جذبات و خیالات کو انوکھے انداز میں پیش کرنا مخدوم کے آرٹ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ "سورج" پنڈت ونشی دھر صاحب ودیالنکار لکچرار ہندی کی پُرکیف نظم ہے۔ موصوف کا شمار بھاشا کے مشاہیر شعرا میں ہوتا ہے انہوں نے طلوع آفتاب کے منظر کو نہایت خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ شگفتہ استعاروں اور دلکش تشبیہوں نے اس نظم میں جان ڈال دی ہے۔ اظہار کی سادگی و پرکاری اور ترنم و موسیقی کے اعتبار سے بھی یہ نظم پر اثر اور کیف انگیز ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی صدر شعبہ فلسفہ کا کلام "قوتِ آرزو" پڑھ کر بے اختیار علامہ اقبال کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان معدودے چند خوش قسمت ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے شاعر مشرق کی داخلی اور خارجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا قریبی اور تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ اقبال کے نظام فکر کی اہمیت اور طرز ادا کی جادوگری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ عصر حاضر کا تقریباً ہر شاعر ان کا طرز اڑانے میں کوشاں نظر آتا ہے۔ لیکن یہ نقالی الہامی کیفیت سے عاری ہوتی ہے۔ خلیفہ صاحب نے اقبال کے رنگ میں کہاں تک

کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کا تصفیہ ہم ناظرین پر چھوڑتے ہیں۔ جناب علی احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) اور جناب وصی احمد صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) کا پُرکیف کلام بھی ہمیں یقین ہے کہ پسند کیا جائے گا۔ ڈاکٹر رگھو نندن راج صاحب سکسینہ ایم۔ بی بی ایس (عثمانیہ) کی اس شمارہ میں دو خاص رباعیات شایع کی جارہی ہیں۔ ڈاکٹر سکسینہ صاحب نے حسن کارانہ مزاج پایا ہے۔ ان میں معنی آفرینی کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ رباعی جیسی مشکل صنف میں انھوں نے ندرتِ فکر کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ ان کے طرزِ ادا کی بے باکی اور احساس کی شوخی پڑھنے والے کے قلب و دماغ پر ایک وجدانی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ اسے پیشہ کی ستم ظریفی کہئے کہ ہمہ وقتی مصروفیات نے انہیں محفل سخن سے بہت دور کر دیا۔ علاوہ بریں طلبا، حال کی دلکش نظمیں و غزلیں بھی شریک اشاعت ہیں۔

مشورۂ نیک اعلیحضرت جلالت الملک نے براہِ خسروانہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے لئے تین فارسی قطعات "مشورہ نیک برائے طلبائے عثمانیہ یونیورسٹی"، "کلیہ مسلمہ دنیا" اور "مسئلہ علم و فضل" عطا فرمائے ہیں۔ اول الذکر قطعہ کا تعلق چونکہ طلبا، جامعہ عثمانیہ سے ہے۔ اس لئے یہاں اس پر اظہار خیال کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔

تاریخ عالم کی ان نازک ترین ساعتوں میں جبکہ کائنات عظیم ترین ذہنی اضطراب معاشی کشمکش، مادی تلاطم اور سیاسی ہیجان کی بدولت ایک اندوہناک دور سے گزر رہی ہے، عثمانیین کے لئے حضرت اقدس و اعلیٰ کی مستقبل ساز رہنمائی باعث صد فخر و مباہات ہے۔ حضرت ظل سبحانی کی فلک مرتبت ذات ستودہ صفات ہمارے جوش عمل کا سرچشمہ ہماری ہمہ جہتی رہنمائی کا ماخذ اور ہمارے اقتدار کا ماویٰ و ملجا ہے حضرت جہاں پناہی کا یہ

"مشورۂ نیک" ان کی عثمانین سے بے پایاں محبت و شفقت کا آئینہ دار ہے۔ یہ مشورۂ جلیلہ اپنی معنوی اہمیت کے لحاظ سے نہ صرف طلباء، جامعہ عثمانیہ بلکہ دنیا کی تمام جامعات کے متعلمین کے لئے شمع ہدایت ہے۔ **حضرت سلطان العلوم** نے طلباء جامعہ عثمانیہ کو ازراہِ عطوفت مخاطب فرماکر نصیحت فرمائی ہے "درخیال ما برائے اینہا دورانِ حصولِ تعلیم حصہ درامور سیاسی ملک گرفتن (یعنے در پالٹیکس) مفید نہ باشد کہ ہر چند نتائج آن در مسائل مقدمات خواہ اندرون ملک باشد یا بیرون بہ وقوع آمدہ اند و آن ہم از چشم ایشاں پوشیدہ نیست بلکہ عالم آشکارا ......" حقیقت یہ ہے کہ طالب علمانہ دور کی اہم ترین اور صبر آزما منازل اسی وقت فیروز مندی کے ساتھ طے کی جاسکتی ہیں جب کہ طلباء گہرے انہماک، بلیغ توجہ اور پورے جوش عمل کے ساتھ اپنے تعلیمی نصب العین کے حصول میں جادہ پیما ہوں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ طلباء جامعہ عثمانیہ کو موجودہ سیاسی تحریکات میں جذب کرنے کی امکانی کوششیں کی جارہی ہیں۔ طلباء کا عملی سیاست سے محترز رہنا ہی عین دانشمندی ہے ان کے روشن مستقبل کا راز **حضرت اقدس و اعلیٰ** کے مذکورہ بالا دور رس ارشاد گرامی میں مضمر ہے۔

آخر میں ہم **حضرت سلطان الحکمت** کی بارگاہ معارف میں اس "مشورۂ نیک" پر اپنے عمیق ترین جذبات احسان مندی کا اظہار کرتے ہوئے اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ ارشادات شاہانہ پر عمل پیرا ہوکر فکر و عمل کی ساری صلاحیتوں اور توانائیوں کو ملک اور مالک کی امیدوں اور خوابوں کو مجسم کرنے کے لئے صرف کرنا ہی ہم عثمانین کا آئین حیات اور پیمان زندگی ہے۔

مجلّہ کا جدید دستور

عالیجناب نائب معین امیر جامعہ کو مجلہ عثمانیہ سے گہری

دلچسپی ہے۔ انھوں نے اس کے صوری و معنوی محاسن میں اضافہ کرنے کے لئے ہمیشہ دوررس رہنمائی فرمائی ہے۔ موصوف کو مجلہ کے عظیم تر مستقبل کی تعمیر کا کامل احساس ہے۔ اس سال انھوں نے مجلہ کے دستور کی بعض کوتاہیوں اور خامیوں کی نہ صرف اصلاح فرمائی بلکہ اس میں جدید اضافے بھی فرمائے۔ بالخصوص مجلس ادارت کے سابقہ مروجہ انتخاب کے طریقے میں اہم تغیرات کئے گئے ہیں۔ اس جدید دستور کا نفاذ سال رواں سے عمل میں آیا ہے۔ چنانچہ ہماری مجلس ادارت کا انتخاب نئے دستور کی روشنی میں فی البدیہہ تحریری مقابلے کی بنیاد پر کیا گیا۔ مدیرین کے انتخاب کے لئے جو دانشمندانہ مسلک اختیار کیا گیا ہے وہ ہر طرح درست اور موثر ہے۔ توقع ہے کہ اس ترقی پذیر راہ عمل کی بدولت علم و ادب کی دنیا میں مجلہ اپنا حقیقی مقام حاصل کرے گا۔ طریقہ انتخاب کی تبدیلی کے علاوہ مجلّہ کے شماروں کی تعداد بھی مستقلاً تین کر دی گئی ہے۔

معتمد مجلس مشاورت

مجلّہ کے جدید دستور میں جناب سید محمد یونس صاحب وفاقانی بی۔اے (عثمانیہ) ایم۔ ایس سی (ڈھاکہ) اے۔ ایم۔ آئی۔ آر۔ ای (لندن) پرسنل مددگار نائب معین امیر جامعہ مجلس مشاورت کے معتمد مقرر فرمائے گئے ہیں۔ جناب وفاقانی صاحب کی ممتاز شخصیت سادگی، بے لوث ہمدردی اور خوش اخلاقی کی بدولت ساری طلباء برادری میں بے حد مقبولیت و احترام اور قریبی ربط و تعاون کی حامل ہے۔ ہم ان کی **واقف کاری، معاملہ فہمی**، اور **عمل پسندی** کی قدر و قیمت کو پورے طور پر محسوس کرتے ہوئے اس ایقان کا اظہار کرتے ہیں کہ موصوف کی قابلانہ رہنمائی مجلہ کی تاریخ میں ایک **جدید روشن باب** کے اضافہ پر منتج ہوگی۔

انجمن اتحاد کا احیاء

انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ کی متحدہ سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس ادارہ کو جامعہ کی ثقافتی زندگی میں ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ طلباء کی تقریری، تحریری، اور تنظیمی صلاحیتوں کو ابھارنے، ان میں خود اعتمادی اور مجلسی علم کو بڑھانے اور ان کی اجتماعی و معاشرتی زندگی کو فروغ دینے میں اس انجمن نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

انجمن اتحاد کے تعطل کے باعث ہماری اجتماعی اور معاشرتی سرگرمیاں سرد پڑ گئی تھیں۔ خدا کرے اس سال اس کا احیاء عمل میں آیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ برادران جامعہ انجمن اتحاد کے جملہ امور میں اپنے حق خود ارادیت کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر وسیع تر نقطۂ نظر اور ہمہ گیر مفاہمت و اخوت کے اعلیٰ ترین جذبات اور خلوص و استقلال سے کام لے کر اسے پھولنے پھلنے اور مدت مدید تک اس کے فیضان کو جاری رکھنے کے وسیع تر امکانات کو تقویت پہنچائیں گے۔

انجمن امداد باہمی

عہدہ داران بزم معاشیات نے اس سال نمائشی سرگرمیوں سے زیادہ ٹھوس اور تعمیری جدوجہد پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ طلباء برادری میں امداد باہمی اور کفایت شعاری کے رجحانات کی اشاعت کے لئے جامعہ میں جناب عطاء الرحمٰن صاحب علوی بی۔ اے (عثمانیہ) صدر بزم معاشیات کی تحریک پر انجمن امداد باہمی طلباء جامعہ عثمانیہ محدود کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس انجمن کا مجوزہ سرمایہ پانچ ہزار روپے ہے جو ایک ہزار حصص پر مشتمل ہے۔ انجمن کے دائرۂ عمل میں بک ڈپو، جنرل اسٹور اور رسٹورنٹ کا قیام شامل ہے۔ لیکن فی الوقت صرف بک ڈپو کا افتتاح کیا گیا ہے۔

طلباء جامعہ کی باہمی امداد کے لئے اس انجمن کا قیام بلاشبہ ایک مستحسن اقدام ہے ہم اس سود مند نوزائیدہ ادارہ کے قیام پر بزم معاشیات کے لائق صدر جناب عطاء الرحمن صاحب علوی بی۔ اے (عثمانیہ) اور سرگرم معتمد جناب حامد محی الدین صاحب بی۔ اے (آخری) کی مخلصانہ مساعی کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں پُر خلوص مبارکباد دیتے ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ امداد باہمی کی جس مہم کا آغاز کیا گیا ہے وہ ہر طرح برادران جامعہ کے تعاون واشتراک کی مستحق ہے۔ ہمیں یقین ہے عثمانی برادری کا ہر فرد انجمن امداد باہمی کی مہیا کردہ سہولتوں سے کما حقہ استفادہ حاصل کرے گا۔ اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے اس کے کاروبار میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے گا۔ تاکہ ایک طرف اس کے سرمایہ میں اضافہ ہو تو دوسری طرف اس کے دائرۂ عمل میں وسعت پیدا ہو سکے۔ انجمن کی باضابطہ رجسٹری قانون انجمن ہائے امداد باہمی سرکار عالی کے تحت کرائی گئی ہے اس لئے حصہ داروں کو اپنے مفادات کے تحفظ کی نسبت کامل اطمینان محسوس کرنا چاہئے۔

انجمن امداد باہمی کی مجلس انتظامی حسب ذیل افراد پر مشتمل ہے۔

میر مجلس۔ عالیجناب نائب معین امیر جامعہ۔ نائب میر مجلس۔ ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی صدر شعبہ معاشیات۔ معتمد۔ جناب عطاء الرحمن صاحب علوی بی۔ اے (عثمانیہ) نائب معتمد۔ جناب حامد محی الدین صاحب بی۔ اے (آخری) خازن۔ جناب اختر حسین صاحب لکچرار معاشیات۔ اراکین۔ جناب عبد القادر صاحب لکچرار معاشیات۔ جناب حسن الدین صاحب۔ جناب سید غلام صمدانی صاحب۔ جناب قطب الدین صاحب۔

ہمیں کامل اطمینان ہے کہ عالی جناب نائب معین امیر جامعہ کی مدبرانہ رہنمائی کی روشنی میں یہ انجمن سرسبز اور بارآور ہوگی۔

خطبہ افتتاحیہ علمی کانفرنس

راقم الحروف کی تحریک پر بزم اُردو کے زیر اہتمام جامعہ میں پہلی دفعہ محترم ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی ممتاز صدارت میں اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا گیا تھا۔ جس کی افتتاحی رسم عالیجناب نائب معین امیر جامعہ نے بہ نفس نفیس ادا کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ "جامعہ عثمانیہ میں بزم اردو کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس منعقد کی جا رہی ہے۔ اس کانفرنس کے انعقاد پر صدر بزم اُردو و ارکان بزم کو مبارک باد دیتے ہوئے بکمال مسرت اس کا افتتاح کرتا ہوں۔ اس سال بزم اردو کی کارگزاری مستحق تبریک رہی ہے۔ بزم اُردو کے نقوش کار جامعہ کی دیگر بزموں کے لئے پیام عمل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جامعہ کی دیگر انجمنیں بھی اس قسم کی کانفرنسیں منعقد کریں۔"

مقام مسرت ہے کہ عالیجناب نائب معین امیر جامعہ کے ارشاد کی متابعت میں جامعہ میں علوم اسلامیہ کی کانفرنس اور علمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ آخر الذکر کانفرنس کے دو اجلاس اقامت خانہ الف کے دائرہ علمیہ کے زیر اہتمام علی الترتیب ڈاکٹر سید حسین صاحب مسجل جامعہ اور ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی صدارت میں منعقد کئے گئے۔ یہ کانفرنس جناب قاضی احمد کبیر الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) کی مساعی جمیلہ کی بدولت کامیاب رہی۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی نے اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے ایک عالمانہ خطبہ پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں مختلف علوم کے باہمی تعلق اور تعلیم و تعلم کے اصول سے بحث کرتے ہوئے شہریوں کی مفت تعلیم سے متعلق حسب ذیل معقول تجویز بھی پیش فرمائی :-

"میں یہاں صرف تعلیم و تعلم کے اصول سے بحث کر رہا ہوں مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس بحث میں محض اہم اقتصادی مسائل بھی داخل کرنے پڑیں گے۔ مثلاً یہ کہ ہر متعلم کے لئے اس قدر

طویل تعلیم اور تربیت کے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہیں۔ لیکن یہ سوالات منفرد طور پر حل نہیں کیے جاسکتے بلکہ سارے ملک اور ساری دنیا کے اقتصادی و معاشرتی نظام کے مسئلہ کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس موجودہ نظام میں بھی کم از کم ایک سرسری حل یہ ہوسکتا ہے کہ ابتدا، سے لے کر اعلیٰ درجہ تک تمام تعلیم بیس پچیس برس کی عمر تک ان تمام شہریوں کے لئے مفت کردی جائے جو اس کو حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جو تعلیمی ادارے سالانہ لاکھوں روپے صرف کرتے ہیں۔ ان کے اخراجات میں متعلمین سے چند ہزار روپے فیس کے طور پر وصول کرنے سے کوئی خاص تخفیف نہیں ہوتی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تربیت پائے ہوئے نوجوانوں کا وجود خود معاشرہ کی بقا اور ترقی کے لئے ناگزیر ہے۔ اور یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ معاشرہ خود اپنی بقا اور ارتقاء کے لئے ان نوجوانوں پر اخراجات کا بار عائد کرے۔ اس کی مثال ایسی ہے گویا کہ ایک مشین ان کل پرزوں سے جن کی بدولت وہ چلتی ہے یہ مطالبہ کرے کہ وہ اس مشین کے لئے کارآمد ہونے کی خاطر ٹیکس ادا کریں۔"

ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ تجویز جذباتی کشش سے قطع نظر معقولیت کی اساس بھی رکھتی ہے۔ ہم اس تجویز کی طرف رائے عامہ کی پوری تائید کے ساتھ ارباب حل و عقد کی توجہ اس توقع کے ساتھ منعطف کراتے ہیں کہ وہ اس پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔

اعلیحضرت جلالت الملک کے مبارک و مسعود عہد حکومت میں مملکت حیدرآباد میں جو عظیم الشان آئینی، دستوری، مالیاتی، تعلیمی، تمدنی، صنعتی، حرفتی، زراعتی، تعمیراتی، دیہی اور طبی ترقیات عمل میں آئی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ آج تعلیمات پر حیدرآباد میں (۱۱۲،۷۵) لاکھ روپے صرف کئے جارہے ہیں **حضرت سلطان العلوم** شہریار حیدرآباد و برار کے فیض رساں عہد میں کیا یہ ممکن نہیں کہ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کی اس ترقی پسندانہ تجویز کو روبہ عمل لایا جائے؟ ہمیں ارباب مقتدر سے قوی توقع ہے کہ وہ اجتماعی

فلاح و بہبود کی خاطر اس تجویز کی پوری تائید کرتے ہوئے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سعئ بلیغ فرمائیں گے۔

متحدہ اقامتی جلسے

ہر سال ہمارے اقامت خانوں کی جانب سے جداگانہ طور پر مختلف غیر معمولی معاشرتی جلسے منعقد کئے جاتے ہیں اور تفریحی مہمات ترتیب دی جاتی ہیں۔ ہماری رائے میں معاشرتی تقریبیں ہوں یا علمی کانفرنسیں، تفریحی مہمات ہوں یا تمدنی جلسے اگر ان کا انعقاد متحدہ طور پر عمل میں لایا جائے تو یہ اجتماعی اخلاقی و مادی فلاح و بہبود کے لئے زیادہ موثر ثابت ہوسکتے ہیں۔

متحدہ اقامتی سرگرمیوں سے جملہ اقامت خانوں کے مقیمین کے مابین قریب تر روابط پیدا ہوں گے، ان کے جذبات ہم کاری کو تقویت پہنچے گی، اور ان کے مختلف نقطہ ہائے نظر میں وسیع تر ہم آہنگی پیدا ہوکر ان کے برادرانہ تعلقات، اتحاد و یگانگت اور اشتراک و تعاون کی روایات کو قوی تر کرنے کے لئے ایک ایسی زبردست بنیاد فراہم ہوجائے گی۔ جو انتہائی قدر و منزلت کی مستحق ہوگی۔

ہمیں جملہ مقیم طلباء سے امید ہے کہ وہ ہماری اس اتحاد آفریں تحریک پر پوری سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔

جشن سیمین جامعۂ عثمانیہ

دکن کی سرزمین مختلف قوموں کی تہذیب و تمدن کی متاع بے بہا سے مالامال ہے۔ جامعۂ عثمانیہ اس مقدس سرزمین پر اسلامی و ہندی شائستگی و ثقافت کے امتزاج کا ایک مثالی مظہر ہے۔ یہ ایک تاریخی

قومی ورثہ ہے جس سے آنے والی نسلیں صدیوں تک بہرہ ور ہوتی رہیں گی ـــــ تہذیبی و ثقافتی اہمیت سے قطع نظر یہ ادارہ بجائے خود ایک نظرافروز **جمالیاتی کارنامہ** ہے جو انسانی تخیل کو ایک ایسی خیال آفریں دنیا میں لے جاتا ہے جہاں **اخوت** ہے، **مساوات** ہے، **آزادی** ہے ـــــ سب کچھ ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کی تاسیس حیدرآباد میں علوم و فنون کے احیاء، نئی بیداری کے آغاز اور تمدنی مہمات کی تخلیق کا باعث ہوئی ہے۔ جامعہ کا جشن سیمیں ماہ بہمن میں تزک احتشام کے ساتھ منعقد کیا جائے گا اس خصوص میں ایک شایان شان نظام نامہ بھی ترتیب دیا گیا ہے۔

خصوصی اشاعت

جشن سیمیں جامعہ عثمانیہ کے موقع پر مجلس ادارت کے پیش نظر مجلہ عثمانیہ کی ایک خصوصی اشاعت بھی ہے۔ یہ خاص اشاعت جامعہ کی پچیس[۲۵] سالہ زندگی کا عکس ہوگی اس اشاعت کے سلسلہ میں عالیجناب محترم نائب معین امیر جامعہ اور محترم ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور مشیر حصۂ اردو گہرے انہماک اور دلچسپی کا اظہار فرما رہے ہیں۔ ہم اس خصوصی اشاعت کی تفصیلات کا آئندہ شمارہ میں اعلان کریں گے۔

جنگ اور علمی سرگرمیاں

تین سال گزر گئے ـــــ جنگ جاری ہے۔ زمین پر انسانی خون کی چادر بدستور بچھائی جا رہی ہے۔ تہذیب و تمدن کے نقش و نگار، عمران و شائستگی کی بستیاں، علوم و فنون کے سرچشمے، حرص و ہوس اور "ہمہ گیری" کی خواہش کے شعلوں میں جل رہے ہیں۔ کائنات کی فضاؤں میں انسانیت کشی و اخلاق دشمنی کا المناک نوحہ

مہیب ارتعاش پیدا کر رہا ہے۔ تہذیب و تمدن کے آثار کی ہولناک تباہی پر فطرت خونابہ افشانی کر رہی ہے۔ بربریت کی تاریخ میں ایسے خونچکاں واقعات کی نظیر نہیں ملتی۔

ہمارا یہ مستحکم الیقان ہے کہ انسانیت سوز اقدامات اور ظلم و استبداد کی قوتوں کو دوام حاصل نہیں ہوتا۔ جبر و تشدد کا سر نیچا ہوگا اور دنیا میں **صداقت**، اور **انصاف** ہی کا نام ابھرے گا۔

موجودہ جنگ نے انسانی زندگی اور معاشی نظام کے ہر شعبہ کو بے حد متاثر کیا ہے۔ علمی و تمدنی سرگرمیوں پر بھی اس کے تباہ کن اثرات مترتب ہوئے ہیں۔ علمی ضروریات کی اشیاء کی قیمتوں میں روز افزوں گرانی اور ان کی فراہمی میں گوناگوں موانعات کے باعث **مستحکم مالیاتی موقف** کے باوجود مجلہ عثمانیہ کے لئے اپنی **روایتی وضعداری** کو برقرار رکھنا مشکل ہوگیا ہے ان ناگزیر مجبوریوں اور دقتوں کے باعث مجلس انتظامی نے مجلہ کی ضخامت میں قابل لحاظ کمی کردی گئی ہے۔ ان ہی اسباب کی بناء پر زیر نظر اشاعت میں بعض طویل مقالے شائع نہیں کئے جاسکے جس کا بے حد افسوس ہے۔ ہم اپنے قلمی معاونین سے مستدعی ہیں کہ وہ آئندہ مجلہ کی **تنگ دامانی** کو ملحوظ رکھ کر اپنے مضامین ارسال فرمائیں گے۔

کُلُّ مَن علیہا فَان

فروغ شمع تو باقی رہے گا صبح محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

مولوی محمد یوسف الدین صاحب مہتمم کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ کا رشتۂ حیات منقطع ہوگیا۔ ان کی بے وقت وفات عثمانئین کے لئے ایک اندوہناک واقعہ ہے مرحوم جامعہ عثمانیہ کے قدیم ترین طیلسانئین میں سے تھے۔ فرض شناسی، مستعدی اور جفاکشی ان کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ کا شمار ہندوستان کے عظیم الشان کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ اس کتب خانہ میں مشرقی و مغربی ادب کی تصنیفات و تالیفات کی مجموعی تعداد (۵۲) ہزار ہے۔ علاوہ بریں اس کتب خانہ میں دس مختلف زبانوں کے (۴۳۲۸) کارآمد اور نادر مخطوطات بھی ہیں۔ کتب خانہ کی تنظیم ڈیوی کے مشہور و معروف اور سہولت بخش " ڈسمل کلاسی فیکشن سسٹم " کے تحت کی گئی ہے۔ کتب کے حصول میں مزید آسانی پیدا کرنے کے لئے حرف واری ترتیب سے (۲۵۲۵۲۵) کارڈ مختلف خانوں میں سلیقہ سے رکھے گئے ہیں ــــــ ان ساری تنظیمات میں مرحوم مہتمم کتب خانہ کا بڑا حصہ ہے۔ آخر میں ہم مولوی محمد یوسف الدین صاحب کی وفات پر اپنے گہرے جذبات رنج و ملال اور المناک تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔ مرحوم کے پسماندگاں کے ساتھ ہمیں پوری ہمدردی ہے۔ خدائے ذوالجلال مرحوم کی روح کو سرمدی سکون بخشے۔

محمد علی نیر ایم۔اے (آنرز)
مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو



جناب سید محمد یونس صاحب وداوانی
بی۔ اے۔ ایم۔ ایس سی۔ اے۔ ایم۔ آئی۔ آر۔ ای (لندن)

جناب وداوانی صاحب مجلس مشاورت جامعہ عثمانیہ کے معتمد مقرر فرمائے گئے ہیں۔ آپ کی منکسرانہ شخصیت سادگی، بے لوث ہمدردی اور جوش اخلاقی کی بدولت ساری طلبا برادری میں بے حد مقبولیت و احترام اور قربانی ربط و تعاون کی حامل ہے۔ ہم ان کی واقف کاری، معاملہ فہمی اور ہمدردی کی قدر و قیمت کو پورے طور پر محسوس کرتے ہوئے اس ایمان کا اظہار کرتے ہیں کہ موصوف کی دور رس رہنمائی مجلس کی تاریخ میں ایک جدید روشن باب کے اضافہ کا موجب ہوگی — (مدیر)

سراج اورنگ آبادی

آج سے کوئی ڈھائی سو سال پہلے کی بات ہے کہ اورنگ آباد کا شہر اپنے عروج کی بہار پر تھا۔ دلی میں اردو شاعری کی تحریک کی ابھی ابھی ابتداء ہوئی تھی۔ میر اور سودا کی شہرت ابھی چمکی نہ تھی اور حاتم اور آبرو شمالی ہند میں اردو شاعری کی بنیادیں استوار کر رہے تھے۔ بلکہ شاہ حاتم نے زبان کی حد تک نئے دبستان خیال کا پرچار شروع کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں اورنگ آباد کو سارے دکن بلکہ ایک حد تک سارے ہندوستان میں سیاسی مرکزیت حاصل تھی۔ دکن کی تین چار سو سال کی ادبی اور شعری روایات کا ارتقاء اب اس نوبت پر پہنچ چکا تھا کہ اسے ثمر کے پختہ ہونے کے بعد کا مرحلہ یعنے تخم کے انتشار کا زمانہ کہنا چاہیے جس سے شعر و ادب کے نئے نئے گلزار کھل سکے۔

ایسے زمانہ میں شاہ سراج کی شاعری کا چرچا دکن سے لے کر گجرات اور شمالی ہند تک پہنچ چکا تھا اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک دہلی کے شعراء میں خود اعتمادی کا احساس پیدا ہونے لگا تھا اور وہ اپنی قدرت زبان اور کمال پر ایک حد تک ناز بھی کرنے لگے تھے۔ اس کے باوجود وہ دکن کے اساتذہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنی شاعری کا تعلق دکن سے استوار سمجھتے تھے۔ حالانکہ دونوں جگہ کے محاورے میں تھوڑا بہت فرق موجود تھا۔ میر تقی میر اور بعض دوسرے شعراء نے دکھنی اور ریختہ دونوں کو ایک سمجھا چنانچہ میر کا مشہور شعر ہے۔

خوگر نہیں ہم یونہی کچھ ریختہ کے ایسے　　　معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا

ادب میں کمیت کا زیادہ لحاظ نہیں ہوتا چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ بعض وقت ایک بلند پایہ ادیب یا

شاعر ہی کسی قوم یا ملک کا نام روشن کر گیا۔ اورنگ آباد نے اپنے سیاسی اور ادبی عروج کے دور میں ایسے لوکئی نغزگو شاعر عطا کئے ان میں سے دو یعنے ولی جن کی وجہ سے شمالی ہند میں اردو شاعری کی تحریک کا آغاز ہوا اور دوسرے سراج جو قدیم دبستان کے آخری بڑے شاعر ہیں۔ شعرا کی ایک پوری قوم پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔

سراج کا کلام بہت ضخیم نہیں ہے۔ تاہم حسنِ فکر اور حسنِ گفتار کا وہ ایسا مجموعہ ہے جو اُردو شاعری میں اپنی انفرادی خصوصیات کی وجہ سے ایک نمایاں جگہ رکھتا ہے ادب میں سارا کرشمہ زبان کی جادوگری ہی کا نہیں ہوتا بلکہ زبان یا اسالیب کسی مقصد کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ مقصد جس قدر زیادہ اہم ہوگا زبان اس کی اتنی ہی تابع ہوگی۔ ہر بڑے شاعر کے کلام میں زبان اور اسلوب کا کچھ نہ کچھ حصہ عام ذہنوں کے لئے نامانوس ہوتا ہے۔ لیکن محض اس کی وجہ سے علمائے ادب اس کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ شکسپیر، ولی، غالب اور خود ہمارے زمانہ کے شاعر اعظم علامہ اقبال کا کلام بھی ایسی چند خصوصیات سے خالی نہیں پھر بھی ساری اردو دنیا اسے سر آنکھوں پہ رکھتی ہے۔

سراج بھی اپنے زمانہ اور ہر زمانہ کے بڑے شعرا میں سے ہیں ان کے کلام کے ایسے حصے بھی جو اب ہمارے لئے نامانوس سے ہوگئے ہیں ادبیات عالیہ کی پوری وقعت کے مالک ہیں۔

سراج کی ولادت ۱۱۲۷ھ میں ہوئی تھی جس کو آج سوا دو سو سال کا طویل عرصہ گذر چکا ہے۔ ان کے آبا و اجداد اورنگ آباد کے ایک مشائخ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد سید درویش ایک صوفی منش اور ثقہ بزرگ تھے جنہوں نے اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت میں حتی المقدور کوشش کی۔ چنانچہ فارسی میں سراج کو کافی دستگاہ پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن سراج کسی اور کام کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ علم ظاہری اور صرف و نحو کے جھگڑوں میں وہ نہیں پھنس سکتے تھے چنانچہ خود کہتے ہیں۔ ؎

جسے شغل ہے نحو اور صرف کا کہاں ہوش ہے عشق کے حرف کا

ان کی فطرت کے غیر معمولی جوہر نہایت کم عمری سے ظاہر ہونے لگے۔ اِن کی زندگی کا

عجیب ترین واقعہ یہ ہے کہ بارہ تیرہ سال کی عمر سے ان پر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی جس کے اثر سے وہ گھر سے نکل جاتے اور دن کی دھوپ اور رات کی تاریکی میں خلد آباد کے اطراف جنگلوں میں دشت نوردی کیا کرتے اور جب تھک جاتے تو حضرت شاہ برہان الدین غریبؒ کے مزار پر آکر دم لیتے۔ خود سراج کا بیان ہے کہ جذب و مستی کی اس حالت میں درد انگیز اشعار فارسی کے ان کی زبان پر جاری ہو جاتے تھے۔ لیکن انہیں لکھنے کا ہوش نہیں تھا وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس وقت اگر کوئی شوق مند موجود ہوتا اور ان اشعار کو قلم بند کر لیتا تو یقین ہے کہ ایک ضخیم دیوان مرتب ہو جاتا۔ اور بعد میں لوگ انہیں پڑھتے تو کہنے والے کے عمر کا لحاظ کرتے انہیں الہام تصور کرتے۔

سراج کی طبیعت میں بچپن سے لاأبالی پن تھا۔ نوجوانی میں وہ بجید یار باش رہے جب جذب کی کیفیت کم ہوئی تو انہیں دوستوں کی صحبتوں اور شعر و سخن کی دلچسپیوں کے علاوہ کوئی اور کام نہیں تھا اس لئے ثقہ حلقوں میں ان کا یہ طرز زندگی پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کے معاصرین میں سے بعض تذکرہ نگاروں نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کے دوست احباب میں غالباً کچھ لوگ ایسے بھی شامل تھے جو اس زمانہ کی مہذب سوسائٹی میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے ایک تذکرہ نگار افضل بیگ قاقشال نے عبدالرسول خاں کا نام بھی بتلایا ہے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن سے سراج کی دوستی عشق کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ بعد میں وہ سراج کے برادر طریقت بھی ہو گئے تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عبدالرسول خاں ایک ایسی خاموش طبیعت اور ہمدرد فطرت کے مالک تھے جن کی سراج جیسے لاأبالی طبیعت والوں کو بہت ضرورت ہوتی ہے۔ شعر فہمی کا بھی ان میں خاص مادہ تھا۔ چنانچہ انہیں کی بدولت سراج کا سارا کلام محفوظ اور مدون ہو سکا اس کا ثبوت سراج کے خطوط، فارسی کلام اور اردو شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ رسول خاں بعد میں فوج میں ملازم ہو گئے تھے اور زیادہ تر لشکر میں رہا کرتے تھے۔ آخری زمانے میں جب سراج کو تنہائی اور بیماری کی وجہ سے تکلیف ہونے لگی تو وہ رسول خاں صاحب کو بار بار یاد کرتے تھے ان کی

ایک غزل کا مطلع ہے۔

صبا میرے جوانِ لشکری کو جا خبر کرناں   دلِ بے درد میں اس یار کے جاکر اثر کرناں

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سراج نے صرف انہیں کے خطوط میں اردو اشعار لکھتے ہیں ورنہ وہ عام طور پر فارسی خطوط میں فارسی اشعار لکھا کرتے تھے۔

سراج کی نوجوانی کے دوستوں میں ایک شاہ ضیاء الدین پروانہ بھی تھے جوان کے پیر بھائی اور شاگرد بھی تھے۔ سراج کے انتقال کے بعد ان کے مزار پر انہوں نے گنبد بنوایا تھا جو اب تک نہایت خستہ حالت میں تھا۔ ادارہ ادبیات اُردو کی کوشش سے جناب عبدالباسط خاں صاحب سابق صوبیدار اورنگ آباد نے اس کو درست کراکے دروازہ وغیرہ نصب کرادیا ہے ضیاء الدین کے تخلص پروانہ میں سراج کی رعایت ظاہر ہے۔ یہی یارباشی کا زمانہ سراج کی شاعری کے نشوونما کا بھی زمانہ تھا لیکن اس مشغلہ کو وہ بہت وقت نہ دے سکے۔ کیونکہ ان کو جلد ہی کسی ہادی کامل کی تلاش ہوئی۔ بالآخر حضرت شاہ عبدالرحمن چشتیؒ سے بیعت ہوگئی اس وقت سراج کی عمر ۱۹-۲۰ سال سے زیادہ نہیں تھی قائشال کے قول کے موجب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی طبیعت دنیا سے سیر نہیں ہوئی تھی جب وہ مرشد کی خدمت میں نہ ہوتے تو دوستوں کی صحبت میں ہوتے اور وہی لاابالی طرز زندگی ہوتا۔ غالباً اسی کو روکنے کے لئے مرشد نے انہیں شاعری ترک کردینے کا مشورہ دیا۔ سراج کے لئے یہ بڑا کٹھن کام تھا۔ ان کو شعرگوئی سے باز رکھنا اتنا ہی بڑا ظلم تھا جتنا کسی نوپرواز پرندے کی زبان کاٹ دینا۔ لیکن سراج اب اپنے ارادے کو مرشد کے ارادہ کے تابع کرچکے تھے تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس کے بعد سے انہوں نے عملاً شاعری ترک کردی اور تھوڑے عرصہ کے بعد اپنے عقیدے کے مطابق تارک دنیا اور تارکِ لباس بھی ہوگئے۔ پھر بھی شعر و سخن کا ذوق انہیں کبھی کبھی مشاعروں اور شعرا کی صحبت میں کھینچ کر لے جاتا تھا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے فارسی شعرا کے کلام کا انتخاب بھی کرنا شروع کیا تھا جس کا تاریخی نام "منتخب دیوانہا" ہے۔

سراج کا کلام غزلوں کا ایک دیوان، ایک طویل مثنوی "بوستانِ خیال" اور دس بارہ چھوٹی چھوٹی مثنویوں پر مشتمل ہے۔ ان کا کچھ فارسی کلام بھی ہے جو دست بُردِ زمانہ سے بچ گیا ہے۔ چند فارسی خطوط بھی ہیں جو انہوں نے دوستوں کے نام لکھے تھے۔ یہ سارا کلام اب عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات کی جانب سے شایع ہو چکا ہے۔ ۱

سراج کی شاعری بظاہر عام غزل کی شاعری سے بہت زیادہ مختلف نہیں معلوم ہوتی لیکن ذرا توجہ سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس صنف کے عام موضوعات جذبات اور احساسات سے کچھ مختلف چیز ہے۔ جیسا کہ احسن مارہروی مرحوم نے لکھا ہے "یہ ایک درویش دل ریش کے دلی جذبات ہیں جن کی حقیقت کو مجاز کے پردے میں حفظ مراتب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔" یہ دراصل سراج کی شاعری کی کُنجی ہے اس سے ان کی غنائی اور عاشقانہ شاعری کے راز کھلتے ہیں ان کی ہستی سراپا رہن عشق تھی اور عشق ہی وہ روشنی ہے جس میں کائنات کے راز واضح دکھائی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

روشن ہے سبب عشق کے کیفیتِ عالم　　آئینۂ دل ساغرِ جمشید ہوا ہے

عشق و محبت کا یہ جذبہ بعض انسانوں کے لئے ایسا ہی فطری ہوتا ہے جیسا کھانا پینا وغیرہ ہے ؎

ہے بسملِ شمشیرِ نگہ ذوق سیں اپنے　　دل حشر میں کس منہ ستی فریاد کرے گا

اس خیال کو دوسرے پیرایہ میں یوں بھی ظاہر کرتے ہیں ؎

مت کر شمع کوں بدنام جلاتی وہ نہیں　　آپ سیں شوق پتنگوں کو ہے جل جانے کا

عشق جب آسائش روح کا باعث ٹھہرا تو عشق کی تکلیفوں سے عاشق کا چلّا اٹھنا کچھ معنے نہیں رکھتا۔ فرماتے ہیں ؎

تڑپناں تلملانا غم میں جلنا نمک ہو جانا　　یہی ہے افتخار اپناں یہی ہے اعتبار اپناں

شاعری کا یہ رجحان دراصل متصوفانہ رجحان سمجھا جاتا ہے لیکن سراج کے تصوف کو اس تصوف سے الگ رہنا چاہیئے جس کے متعلق کہا جاتا ہے "برائے شعر گفتن خوب است" ایسا تصوف اصطلاحوں کا گورکھ دھندا ہوتا ہے۔ سراج کے متصوفانہ رجحان کے نمونے کے طور پر یہ دو شعر پیش کیے جا سکتے ہیں ؎

مشربِ عشق میں ہے شیخ و برہمن یکساں　　رشتۂ سبحہ و زنار کوں کوئی کیا جانے
کفر و ایمان دو ندی ہیں عشق کی　　آخرش دو نوں کا سنگم ہوئے گا

اردو غزل میں رسمیت ولی کے زمانہ تک بہت کم تھی۔ سراج اور میر کے زمانہ تک بھی انفرادی فکر نمایاں رہی۔ ایسے شاعروں کے کلام میں جن کے الہام کے ماخذ اساتذہ کے دیوان نہیں بلکہ زندگی اور فطرت کے وسیع مظاہر ہوتے ہیں ہم کو بعض وقت ایسے غیر رسمی انداز بھی نظر آجاتے ہیں جو نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً سراج کی غزل کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں جو بیک وقت نامانوس اور دلکش دونوں ہیں ؎

دیوانے دل کوں سمجھاتا ہوں لیکن　　کہاں لگ ہو کوئی حائل کسی کا
ہوا ہے دلبری کا تم یہ تاوان　　نہیں آسان لینا دل کسی کا
گلی میں جس کی شورِ کربلا ہے　　سلونا شوخ ہے قاتل کسی کا
کہو اس لالۂ گلزار جاں کوں　　کبھی تو دیکھ داغ دل کسی کا

ایک اور غزل کے دو شعر ہیں ؎

حیف اِس گلزار میں سرو سہی بالا نہیں　　چہرہ نا فرمانی و خط نازبو والا نہیں
صحن گلشن میں گل و بلبل کوں یک جا دیکھکر　　داغ ہوتے ہیں کلیجے میں کہ وہ لالا نہیں

سراج اُردو کے سب سے پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں فارسی کے مضمون آفریں اور خیال بند شعرا کا انداز بھی ظاہر ہوا ہے۔ شمالی ہند میں یہ انداز جو غالب اور مومن کے زمانہ میں چل کر مقبول ہوا تھا۔ دکن میں اردو شاعری کے ارتقا کا خیال کرتے سراج کے

پاس ظاہر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان کے سیدھے سادھے انداز کے درمیان یہ اشعار بھی خاص لطف دے جاتے ہیں۔

اگرچہ یار کا عضو عضو مرکزِ خوبی — ہے نقطۂ دہن تنگ پر مدار تبسم
ہے دل مرا گلِ رعنائے فصل غیر مقرر — کبھی خزانِ تغافل کبھی بہارِ تبسم
عالم آب ہے سیرابیِ گلزارِ جنوں — خطِ ساغر رگ برگ گلِ سودا سمجھوں
تپشِ دل ہے مجھے شاہد مقصود کا وصل — پیچشِ دودِ جگر زلفِ چلیپا سمجھوں

سراج کی طرزِ زندگی اور زندگی کے متعلق ان کے عقائد کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شعر ان کے لئے کسی مقصد کا ذریعہ نہیں تھا بلکہ خود مقصد تھا اس لئے ان کی زندگی کے آثار سے اب کوئی چیز اگر باقی رہ گئی ہے تو ان کی شاعری ہے۔ ان کا کلیاتِ عشق و محبت کے ستائے ہوؤں، حسن گفتار کے شیدائیوں اور دلریش درویشوں کے لئے ایک ایسی قیمتی کتاب ہے جس کو پڑھنے سے کبھی سیری نہیں ہوسکتی۔ میر تقی میر نے اپنی شاعری کے بارے میں ایک موقع پر جو فرمایا تھا وہ سراج کے کلام پر حرف بحرف صادق آتا ہے ۔

"ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے"

(عثمانیہ)
پروفیسر عبدالقادر سروری ام۔اے ایل ایل بی
صدر شعبہ اردو و فارسی جامعہ میسور

ادب اور زندگی

میتھو آرنلڈ نے ادب کو زندگی کی تنقید کہا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ مکمل اور صحیح ادب وہی ہے جو زندگی کے تمام نشیب و فراز پر روشنی ڈال سکے۔ اس کی اصل غرض اور منشاء کیا ہے؟ اس کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں۔ پہلے دیکھنا یہ چاہئے کہ ادب درحقیقت ہے کیا؟ ادیبوں اور شاعروں نے ادب کو مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے۔ نیومین New man کے نظریہ کے تحت "ادب ہماری فہم و ادراک قوتِ احساس اور تخیل کی ایک جمالیاتی تصویر ہے۔" جارج سنٹیانا Georg Santayana نے کہا ہے کہ "واقعات کو خیالات کا جامہ پہنانا ہی ادب کا موضوع ہے" اور آسکر وائلڈ لکھتا ہے کہ "ادب زندگی کی راہیں متعین کرتا ہے وہ اس کی نقل نہیں کرتا بلکہ زندگی کو اُس کے اصل مقصد کی طرف لے جاتا ہے۔" اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ایک ادیب کا تخیل، اور جذبہ اُس کا مشاہدہ اور اُس کے احساسات خفی زندگی کے ہر شعبہ پر اپنے اثرات مترتب کرتے ہیں۔ ادب میں تخیل اور جذبہ کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ادیب کا تخیل ہی خیر و شر کے درمیان خطِ امتیاز کشید کرتا ہے۔ اور ایک ادیب کے جذبہ ہی کو وہ مضراب سمجھنا چاہئے جس سے زندگی کا رباب جھنجھنا اٹھتا ہے۔ ادب اور شاعری سے اگر تخیل اور جذبہ کو خارج کر دیا جائے تو سارا ادب ایک مٹی کی مورت بن کر رہ جائے۔ ادیب اور شاعر کے تخیل ہی نے کائنات کو دلاویزی بخشی ہے۔ ہر شئے میں "بہار کا اثبات" اور "ہوا میں شراب کی تاثیر" انہی کے تخیل کا نتیجہ ہے۔ ان کے

جذبہ ہی نے زندگی کو اُبھرنا اور بلند ہونا سکھایا ہے یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر شاعر کہہ سکتا ہے۔

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

ادب فطرت کے تابع ہے۔ فطرت کی تمام حرکی قوتیں ادب پر اپنا اثر ڈالتی ہیں یوں سمجھ لیجئے کہ ادب ایک مشینری ہے جو فطرت ہی کے اصولوں کے تحت چلتی ہے۔ نیچرل ادب وہی ہے جو کائنات کی تمام تر روح کو اپنے اندر بند رکھے اور کائنات کی روح ہر دور میں مختلف روپ اختیار کرتی رہی ہے۔ اس۔لئے ہمارا ادب بھی مختلف کروٹیں بدلتا رہا ہے۔ رامائن اور مہابھارت کا زمانہ گذر گیا۔ امیر حمزہ اور الف لیلہ کی داستانیں اپنا اپنا رنگ جما کر ختم ہوگئیں۔ عرب اور ایران کی شاعری نے اب تک کئی چولے بدل ڈالے۔ رومانی بیداری Romanitc Revival نے انگریزی ادب کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔ روس میں ٹرگنف اور ٹالسٹائی کی تحریروں نے روسی ادب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اردو ادب نے بھی زمانہ کے اقتضا کے مطابق نیا ادب اختیار کرلیا۔ محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے اُردو شاعری میں ایک نئے رنگ کی داغ بیل ڈالی۔ غرضکہ ہر دور میں اور ہر زمانہ میں ادب فطرت ہی کے زیر اثر اپنا رنگ بدلتا رہا۔

اِن توضیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور جیسا کہ میتھو آرنلڈ نے کہا ہے ادب واقعتاً زندگی کی تنقید ہے۔ ادب میں زندگی کی لہریں ہمیشہ کروٹ لیتی رہی ہیں۔ کیونکہ واقعاتِ حیات اور ماحول کے اثرات ہی میں ادیب کی شخصیت اور تخیل پرورش پاتا ہے۔ معاشرہ اور تمدن ادیب کو اپنے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ تمدن اور معاشرہ سے ہٹ کر ادیب' ادیب نہیں اور شاعر' شاعر نہیں۔ تہذیب و تمدن جو مختلف دوروں میں مختلف رہے ہیں ہمیشہ مختلف نتائج پیدا کرتے رہے۔ ہر دور میں ماحول کا رنگ شاعر کی شخصیت میں رچا نظر آتا ہے۔ ادیب اور شاعر کے تمام تر رجحانات معاشرہ اور تمدن ہی کی سوتوں سے سیراب ہوتے ہیں۔ اسی لئے کسی ملک یا کسی دور کی ثقافت کا اندازہ

اُس عہد کی ادبی کاوشوں ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔ "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" جب لکھی گئیں تو اُس وقت کا تمدن ہی کچھ اور تھا۔ اُس وقت اگر حالی اور شبلی جیسے علما بھی ہوتے تو شائد ــــ شائد نہیں یقیناً اسی رنگ میں رنگ جاتے۔ تہذیبوں کے متواتر الٹ پھیر نے اب ایک نئے دور کو جنم دیا ہے جس میں میرامن دہلوی اور رجب علی بیگ سرور کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ غرضکہ ہمارا ادب معاشرہ اور تہذیب کے نقش قدم پر چلتا رہا ہے۔ اِس لئے ادب کو زندگی سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی Realistic ہے اور نظریات کی نہیں واقعات کی پابند ہے۔

کیٹس Keats. روحانی شاعری کا حامی تھا۔ حُسن کاری اس کا مطمح حیات تھا۔ لیکن اگر ادیب و شاعر کی حیثیت صرف حُسن کاری ہو کر رہ جائے تو ادب شائد ہی زندگی کا ہمنوا ہوسکے۔ اور یہ حُسن کاری ادب کی جان ہی لے کر رہے۔ حُسن کاری اور آرٹ اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں ادب میں ان کا امتزاج ضروری ہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو ادب کو دو آتشہ کردیتی ہے۔ لیکن ادب اگر برائے ادب ہی رہا تو جے۔ بی۔ پریسٹلی کے قول کی صداقت کو ماننا پڑے گا کہ "حُسن کاری یعنی آرٹ کو زندہ رکھنے کے لئے تھوڑی سی افیون کی ضرورت ہمیشہ پڑے گی۔"

افیون کے ذکر پر چینی ادب کا بھی خیال آگیا۔ چینی عالم بھی اس نظریہ کے قائل ہیں کہ "ادب فن ہے اور ہر فن کی سماجی حیثیت ہے۔ اس لئے جس کتاب میں سماجی اہمیت نہیں وہ ادب نہیں"۔ اسی بنا پر چین میں ناولوں کا شمار ادب میں نہ تھا۔ ادب درحقیقت زندگی کا ایک شعبہ ہے اور جس طرح زندگی ارتقائی منزلیں طے کرتی رہتی ہے ادب بھی اس عمل کے تابع ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے تو ادب کو حیاتِ انسانی کا درجہ دیا ہے اسی لئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اچھی کتابوں سے گریز کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شریف آدمی کا گلا گھونٹنا۔

ادب درحقیقت تہذیبِ نفس اور تہذیبِ خیال کا سرمایہ ہے۔ ادیب کے پاکیزہ

تخیل کا سارا نچوڑ اُس کے تہذیب نفس کا سارا رس، اور اُس کی روحانی حیات کا سارا عطر ادب میں بسا ہوا ہوتا ہے۔ اقوام کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ وہ ادب ہے جو ماضی پر تنقید ہے، حال پر تبصرہ ہو اور مستقبل کا اشاریہ ہو۔ ذوق صحیح اور مذاقِ سلیم درحقیقت ذہن انسانی کے ارتقا کی پیداوار ہیں۔ اور انسان کے ذہن کو صرف اُس وقت پر پرواز عطا ہوتے ہیں جب زندگی کی راہیں متعین ہوچکی ہوں۔ زندگی کے معیار کے ساتھ ساتھ ادب کا معیار بھی بنتا جاتا ہے اور زندگی کے مدوجزر کے ساتھ ساتھ اُبھرتا اور ڈوبتا رہتا ہے۔ زندگی اگر بلند و بالا ہے تو ادب کی رنگ رلیاں بھی من موہن ہیں۔ اگر زندگی کے اُفق پر اقبال مندی کے ستارے چمکتے ہوں تو ان کی روشنی ادب پر بھی اپنا نور بکھیرتی ہے۔ زندگی کے خواب ادب میں بس جاتے ہیں۔ نئی نئی تمنائیں اور نئے نئے ولولے ادب میں وہ رنگ بھر دیتے ہیں جو آنکھوں میں کھب جائے اور اس میں وہ جوش پیدا کر دیتے ہیں جو دل میں اُتر جائے۔ زندگی میں اگر جوشِ عمل ہے تو سمجھ لیجئے کہ ادب بھی زندہ ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے اُردو ادب کو اپنے پیش نظر رکھئے اور قدیم شاعری کا تجزیہ کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ان شعرا کے سامنے کوئی مسائلِ حیات نہ تھے زندگی کی الجھنیں نہ تھیں، تنازع اللبقا کی یہ کشمکش نہ تھی۔ زندگی اُن کے لئے ایک ہموار راستہ کے مانند تھی اس لئے اُن کی شاعری بھی بس چین کی بنسی بجاتی رہی۔ اُن شاعروں کے سامنے سیاست و معیشت کی یہ پریشان کن الجھنیں نہ تھیں۔ اسی لئے ادب بھی عاشقانہ رنگ لئے ہوئے تھا۔ ایران کے اس تحفہ کو اہلِ ہند نے سر آنکھوں پر رکھا۔ اس لئے شاعروں نے عشق و محبت کی ایسی لہر دوڑا دی تھی کہ ہر چھوٹا بڑا اسی لہر کے ساتھ بہتا چلا جا رہا تھا۔ یہ صرف "حسن کاری" تھی زندگی کی تنقید نہیں۔ یہ وہ ادب تھا جو برائے ادب تھا۔ کہیں زمانہ کی باگ ڈور کبھی کسی ایک طبقہ کے ہاتھ میں نہیں رہی۔ تہذیبوں نے کئی ملکوں اور قوموں کے تختے اُلٹ دیے۔ زمانہ کی عنانِ اقتدار اب پیشواؤں، جاگیرداروں مہاجنوں اور ساہوکاروں کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ

کارخانہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب بھی اسی ڈھرّے پر چل نکلا ہے۔ خیر یہ ایک دوسری بحث ہے۔ اصل مقصود یہ ہے کہ ادب کی اصل غرض و غایت کو مکمل طور پر واضح کر دیا جائے جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ ادب کو ماضی کی تنقید، حال کا تبصرہ اور مستقبل کا اشاریہ ہونا چاہئے۔ اور اس کا اولین منشاء یہ ہونا چاہئے کہ وہ حیاتِ انسانی کے اقتضاء کے مطابق ہو۔ انسان کے دل کی ہر آواز سننے والے ادب میں بھی سن لیں۔ ادب کو درحقیقت انسان کے دل کی گہرائیوں سے نکلنا چاہئے۔ تاکہ اس میں وہ اثر اور گھلاوٹ ہو جو پڑھنے والے کے دل و دماغ کو موہ لے۔

شاعری ادب کی جان ہے کیونکہ بقول ورڈسوتھ Wordsworth "شاعری سارے علم کی جان اور اس کا لطیف ترین جوہر ہے۔

شعر و شاعری کی لطافتوں نے ادب میں نئے نئے چمن پیدا کئے ہیں۔ شعر درحقیقت شاعر کا دل و دماغ ہے۔ لیکن جیسا کہ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ شاعر ماحول کا پابند ہے۔ اس لئے شاعر کی روح پر بھی ماحول کی جکڑ بندیوں کے تالے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کا ثبوت حضرت داغ دہلوی اور امیر مینائی کی شاعری سے ملتا ہے جن کا کلام عوام کے ذوقِ پسندیدگی کا تابع رہا ہے۔ اور عوام کے ذوقِ پسندیدگی کی رو میں وہ اپنا ذاتی راستہ کھو بیٹھے لیکن تاریخ عالم ہم کو بتاتی ہے کہ بڑے بڑے جرنیلوں اور کمانداروں کی طرح شاعروں نے بھی قوم کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے اسی لئے تو اقبال کہتے ہیں۔

ع۔ شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

زمانہ کی ضرورت ہمیشہ اچھے ادیب اور اچھے شاعر پیدا کرتی رہی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اُردو ادب کی رنگ رلیاں جب اپنے انتہائی نقطہ کو پہنچ چکیں تو زمانہ نے حالی کو پیدا کیا۔ اور آج سے تقریباً سو سال قبل حالی نے ہمارے قدیم ادب پر ایک ضربِ کاری لگائی۔ اور اس طرح "نشاۃ ثانیہ" نے ظلمات کے پردے چیر دیے۔ حالی کی شاعری نے سوسائٹی کے ذہن کو متاثر کیا۔ یہیں سے اُردو شاعری نے سوسائٹی کے اثرات کو قبول کرنا

چھوڑا اور اپنے اثرات سوسائٹی کے دل و دماغ پر مرتسم کئے زندگی نے ایک کروٹ لی۔ اور ادب کی دنیا میں ایک نئے دور نے جنم لیا۔ زندگی کے مسائل نظروں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ سیاست و معیشت کی گتھیاں سلجھائے جانے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ حالی نے دلوں کے چور پکڑنا شروع کئے اور روایات کہنہ کا دامن چھوڑ کر اخلاقی اور حکیمانہ شاعری کو اردو ادب میں داخل کیا۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص رنگ میں اس رنگت کو اور نکھارا۔ اور خود بخود افراد کے ذہنوں میں اُن جراثیم کی پرورش ہونے لگی جو جدید ادب میں جاری و ساری ہیں۔ افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی ضروریات انگڑائیاں لینے لگیں۔ مفروضات مشاہدات میں بدلنے لگے۔ پریم چند کی ادبی کاوشوں نے حیاتِ انسانی کے ہر رُخ پر روشنی ڈالی۔ بینائے ادب میں زندگی ہی کی شراب جھلکیاں دکھلانے لگی۔ "چوگانِ ہستی" اور "میدان عمل" کے ناموں سے زندگی نے ادب میں جگہ لینا شروع کی۔ اور اس طرح طبقاتی کشمکش کے مظاہر ادب میں جلوہ گر ہوئے۔ زمانہ آگے بڑھتا رہا۔ اس لئے یہ جدید ادب بھی پروان چڑھتا رہا۔ ٹیگور، اقبال اور جوش نے ادب میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ آج ادب کی پشت پر ایک "نظام فکر و عمل" ہے۔ یہ ادب زندگی کا ہمنوا ہے، فکر و نظر کی گہرائی کی پیداوار ہے۔ ادب میں اب "مفروضات" نہیں۔ علاء الدین کے چراغ اور اڑن کھٹولوں کی خیالی داستانیں نہیں بلکہ زندگی کے حقائق ہیں تجربی اور منطقی دلائل ہیں۔ اس میں اب عیش و تعیش کی وہ لہریں نہیں جو ہم کو "جمود" کی طرف بہالے جائیں۔ بلکہ ایک "پیغام" ہے، "دعوت عمل" ہے پچھلے سو سال سے ہمارے ادب نے اُبھرنا سیکھ لیا ہے۔ حالی اور اقبال نے ادب پر ایک نیا رنگ چڑھایا۔ ان کی شاعری میں زندگی کا اقتضا ہے۔ زمانہ کی ضرورتیں ہیں۔ معاشرت کے مسائل ہیں۔ نظریں اب "گیسوؤں" میں نہیں۔ "مسائل حیات" میں الجھتی ہیں دلوں میں اب "غم عشق" نہیں، "غم ملت" ہے۔ "غم روزگار" ہے فرہاد اب شیریں نہیں آزادی چاہتا ہے۔ مجنوں کو اب صحرا نوردی کی نہیں، زور آزمائی کی خواہش ہے۔ زندگی پہلے رینگتی تھی اب دوڑ رہی ہے۔

اسی لئے ادب بھی "زندگی" کا ساتھ دے رہا ہے۔ کیونکہ ادب بہرحال زندگی کی تنقید ہے۔ جو خیال ہمارے دماغوں پر مرتسم ہے وہی ادب میں جلوہ گر ہے اور ہر طرف یہی لکھا نظر آتا ہے۔

ظلام بحر میں کھو کر سنبھل جا — ابھر جا پیچ کھا کھا کر نکل جا
نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج — ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا

ادب اب اخلاقیات کا معلم ہے۔ جرأت و ہمت کا پیغامبر ہے اور ہم کو اب سکھلانے لگا ہے کہ۔

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے — اے مرد خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے

یہی وہ صحیح اور سچا ادب ہے جو ماضی کی تنقید اور مستقبل کا اشاریہ ہے۔ یہ ادب قوم و ملک کا سرمایہ ہے۔ تہذیب و تمدن کی پونجی اور معاشرہ کی روح ہے۔ اس ادب میں فطرت کی دلآویزیاں ہیں تخیل کی جدت طرازیاں ہیں اور جذبہ کی جولانی ہے۔ اور ادب اب وہ ادب بنا ہے جس کے متعلق ولیم ایلری کیننگ William Ellery Chaning. نے کہا ہے۔

"ادب قوم کی فکر و شعور کا آئینہ دار ہے"

اور اب ادب وہی کہتا ہے جو قوم سوچتی ہے۔

سید محمد یوسف ناظم متعلم ام۔اے (ابتدائی)

فلسفۂ حیاتیات

(وراثت)

فلسفۂ حیاتیات میں مسئلہ وراثت ایک خاص اور اہم حیثیت رکھتا ہے اگرچہ یہ موضوع بہت ادق ہے تاہم اس دلچسپ مسئلہ کے متعلق سرسری طور پر حتی الامکان غیرفنی زبان میں معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی جائے گی جس وراثت کے متعلق اب میں آپ کو کچھ سنانا چاہتا ہوں یہ وہ وراثت نہیں ہے جس کے مقدمے آئے دن عدالتوں میں دائر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ دھن دولت اور جاگیرات کی وراثت نہیں ہے۔ یہ وہ وراثت ہے جس کے متعلق عام لوگ کبھی نہیں سوچتے مثال کے طور پر کبھی آپ نے رائی کے پودے کو اگتا ہوا دیکھ کر اس بات پر غور و فکر کیا ہے کہ ایک نہایت ہی چھوٹے بیج سے یہ پودا بڑھتا ہوا رائی کے پودے کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے یعنی اپنے پرکھا Parent پودے کے مشابہ ہوتا جا رہا ہے کیوں نہیں وہ کسی دوسرے پودے کے مانند ہو جاتا ہے۔ آخر اس چھوٹے سے بیج میں وہ کیا خصوصیات پوشیدہ ہیں جو دوران نموجاگ اٹھتی اور اولاد کو پرکھے کے مثل بنا دیتی ہیں۔ مرغ کے انڈے سے ہمیشہ چوزہ ہی نکلتا ہے عام لوگوں کے لئے یہ کوئی دھیان دینے کی بات نہیں۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے اور ہونا ہی چاہئے مان لیتے ہیں کہ ایسا ہوتا ہے لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہی تو اصل مسئلہ ہے جس کے حل کرنے کے لئے صدیوں سے ماہرین حیاتیات نے اپنی پوری کوششیں صرف کر دیں۔ اب تک بھی پوری تشفی نہیں ہوئی۔ پرکھے سے اولاد کی مشابہت عام نہیں بلکہ نوعی اور خصوصی ہوتی ہے چونکہ

پرکھے اور اولاد کے درمیان نابت خلیوں Germ cells ہی کے توسط سے تعلق قائم ہوتا ہے سوائے چند صورتوں کے، لہذا ان نابت خلیوں میں کوئی ایسی چیز ہونی چاہیئے جو پرکھوں کے قابل ارث خصوصیتوں کی نمایندگی کرتی ہو اور اس قابل ہو کہ فردی نمو کے دوران میں انہیں دہرا سکے۔

ایک قدیم نظریہ کے مطابق خود بیضہ میں اُس عضوے کی جس میں وہ نشو و نما کے بعد تبدیل ہوگا ایک مکمل چھوٹی ساخت موجود ہوتی ہے اور نمو کیا ہے محض اس چھوٹی سی ساخت کا نمایاں ہونا اور بڑھنا ہے۔ اگر اس تخیل کو اس کے منطقی نتیجے پر پہنچایا جائے تو اس میں یہ بھی مضمر ہے کہ بیضہ میں آنے والی سب نسلوں کی چھوٹی ساختیں موجود ہوتی ہیں، بالکل اسی طرح جیسا کہ مختلف سائز کے ڈبے ایک دوسرے میں رکھے جاتے ہیں۔

برخلاف اس کے ماہرین کے ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ بیضہ میں اعضا پہلے ہی سے تیار نہیں رہتے بلکہ پختہ عضوے کے مختلف حصے دوران نمو میں سادہ غیر متفرق بیضہ سے بتدریج امتیاز کیے جاتے ہیں۔ اس بات میں اختلاف نہیں ہو سکتا کہ بعض صورتوں میں پختہ عضوے کے بعض حصوں کا بیضہ کے تطابقی حصوں تک سلسلہ باندھا جا سکتا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ بیضہ بالکلیہ غیر متفرق نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ بالآخر حقیقت معلوم ہو اور ان دو نظریوں کے بین بین کوئی رائے قائم کی جا سکے۔

وراثت کے متعلق خواہ کوئی بھی نظریہ قبول کیا جائے، بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ کس طرح ایک کثیر خلوی عضوے کے بظاہر سادہ نابت خلیے، جسم کے تمام دوسرے خلیوں کی نمایندگی کر سکتے ہیں تاکہ جب وہ نشو و نما پائیں تو وہ سب قسم کے خلیے بنائیں گے جن کی ترتیب ویسی ہی ہو گی جیسی کہ پرکھے میں۔ اب ہم اُن کوششوں پر مختصراً غور کرینگے جو کہ اس سوال کا جواب دینے میں کی گئی ہیں۔

۱۸۶۸ء میں ڈاروِن نے اپنا ایک نظریہ پیش کیا تھا جو وراثت کے حقائق کو

تفہیم کے لئے ایک عارضی مفروضے کی حیثیت رکھتا تھا اگرچہ یہ نظریہ مقبول عام نہیں ہوا تاہم قابل لحاظ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ جسم کے تمام ترکیبی خلیے نہ صرف معمولی تقسیم کے ذریعے اپنا اضافہ کرتے ہیں تاکہ مختلف بافتیں تیار ہوں بلکہ اُن سے زندگی بھر نہایت ہی چھوٹے اجسام نکل کر جسم میں چکر لگاتے اور نابت خلیوں میں بکثرت جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ اجسام خردبین کی اعلیٰ سے اعلیٰ قوت سے بھی دکھائی نہیں دیتے لیکن غذائیت جذب کرنے اور تقسیم کے ذریعے اضافہ کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک کے متعلق یہ فرض کیا گیا کہ وہ ایک عجیب وغریب اور ناقابل تفہیم طریقے پر جسم کے اُس خاص خلیے کی نمایندگی کرتا ہے جس سے وہ اخذ ہوا ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اس قابل بھی ہوتا ہے کہ ٹھیک وقت اور ٹھیک جگہ پر اپنے پرکھا خلیے کی خصوصیت کو نئے عضوے کے نطابقی خلیے میں منتقل کرے۔

حالیہ تحقیقات سے جسم بنانے والی (جسم آفریں) اور نابتی (یعنی تولیدی خلیوں سے متعلق) خصوصیتوں میں جو فرق پیدا کیا گیا ہے اُس سے ڈارون ناواقف تھے۔ جسم آفریں خصوصیتیں وہ ہیں جنھیں جسم اپنے دوران زندگی میں اکتساب کرتا ہے اور نابتی خصوصیتیں وہ ہیں جو نابت خلیوں میں ابتداء کرتی ہیں اپنے نظریۂ وراثت کے مطابق ڈارون کا خیال تھا کہ جسم آفریں تبدیلیاں نابت خلیوں میں منتقل ہو سکتی اور نابتی بن جا سکتی ہیں۔ بالفاظ دیگر ڈارون اکتسابی خصوصیتوں کے ارث میں کامل عقیدہ رکھتے تھے۔ ساتھ ساتھ اُن کا یہ خیال تھا کہ کسی عضوے کی کئی نسلیں متبدلہ حالات میں رہنی چاہئیں تاکہ جو کوئی تبدیلی اکتساب کی جائے اولاد میں ظاہر ہو سکے۔

وراثت کا ایک زیادہ مقبول عام اور مسلمہ نظریہ پروفیسر وائزمان کا ہے جو نابت مایے کے تسلسل کی اساس پر قائم کیا گیا ہے۔ تسلسل کا ایک عام تخیل بے شک کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ پُرکھے اور اولاد کا نخزمائی تسلسل حقیقۃً نابت خلیوں ہی کے توسط سے قائم رہتا ہے اور خصوصیتوں کی منتقلی کے لئے ہی ایک مادی اساس ہونی چاہئے۔ خواہ

وراثت کے متعلق کوئی بھی نظریہ قائم کیا جائے۔ لیکن اس ماہر نے اِس تخیل کو بہت واضح طور پر اور اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ مرکزے کے لونین Chromatin کو حقیقی وراثتی مادہ تصور کرتے ہیں نیز جسمی اور ثابت خلیوں کے درمیان فرق کرتے ہوئے اُن کی اہم خصوصیات بیان کرتے ہیں جسمی خلیے جو کسی اعلیٰ پودے یا حیوان کا جسم بناتے ہیں اقسام کی شکلوں کے ہوتے اور اقسام کے افعال انجام دیتے ہیں۔ ثابت خلیے موزوں حالات کے تحت دوسری نسل کی ابتدا کرتے ہیں اور یہی اُن کا واحد اور سب سے اہم فعل ہے۔ جسمی خلیے مختلف افعال کی انجام دہی کے سلسلے میں تخصیص پیدا کرتے اور اسی میں اپنی قوت صرف کرتے ہیں بعض مظاہر مثلاً متعدد حیوانات میں ضایع شدہ اعضا کی باز تولید، نیز کلیوں اور قلموں کے ذریعے پودوں کی افزائش، ایسے ہیں جن کی وجہ سے یہ فرض کرنا ضروری ہوتا ہے کہ کم از کم چند جسمی خلیوں میں اُن کی ضرورت سے زیادہ جدی ثابت مایے کا ایک زیادہ مکمل نمونہ موجود ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ ایسی صورتوں میں کام آسکے۔ اس ضمن میں وائزمان نے جو اصطلاحیں استعمال کی ہیں ہم اُن کی الجھن میں جانا نہیں چاہتے لیکن اس قدر کہنا ضروری ہے کہ ڈارون کی طرح یہ بھی جرم مایے میں نہایت ہی چھوٹی ساختوں کا وجود فرض کرتے ہیں جو اولاد کی خصوصیتوں کا تعین کرتی ہیں۔ موروثی خصوصیتیں ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل نہیں ہوتیں بلکہ ایک ثابت خلیے سے دوسرے ثابت خلیے میں کیونکہ ثابت مایہ تسلسل رکھتا ہے۔ جسم تو ثابت خلیوں پر کوئی اثر نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ وہ ان کی محافظت اور پرورش کرتا ہے۔ جسم اور ثابت خلیوں کے مابین کوئی ربط نہیں ہے اور اس لئے جسم آفریں خصوصیتیں جو انفرادی دوران زندگی میں ماحول سے راست اکتساب کی جاتی ہیں ثابت خلیوں میں منتقل نہیں ہوتیں اور نہ ہی قابلِ ارث ہوتی ہیں۔ ماحول کے اثر میں اعضاء کا استعمال اور عدم استعمال شامل ہے۔ خصوصیتیں جن کا اِرث عمل میں آسکتا ہے صرف ثابتی خصوصیتیں ہیں جو ثابت خلیوں میں

ثابت مایے کی تبدیلی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔

نام نہاد اکتسابی خصوصیتوں کی منتقلی کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے وائزمان اور ڈارون کے نظریوں میں جو وراثت سے متعلق ہیں اہم فرق ہو گیا ہے۔ اگرچہ وائزمان اس بات سے بالکلیہ انکار نہیں کرتے کہ ممکن ہے کہ خارجی اثرات اور بالخصوص تغذیہ، جسم کے توسط سے ثابت مایے کو متاثر کرے اور اس طرح اولاد میں تبدیلیاں پیدا کرے۔

پروفیسر محمد سعید الدین ام اے
صدر شعبۂ نباتیات
جامعہ عثمانیہ

رباعی

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ
ایم بی بی ایس (عثمانیہ)

وہ جو حاصل نہیں ہوتا

"یہ تقریر نشرگاہ میسور" آکاشوانی" سے بہ سلسلۂ آل انڈیا اُردو کانفرنس و مشاعرہ نشر ہوئی تھی۔"

معزز سامعین! مجھ سے آکاشوانی کی جانب سے یہ فرمائش ہوئی ہے کہ میں کچھ عرض کروں۔ میں نے کہا: میں ادیب ہوں نہ مقرر۔ مگر پُرنوازش اصرار نے آپ کی سمع خراشی پر مجبور کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ اُردو زبان نے پچھلی ایک ربع صدی میں بہت ترقی کی ہے اور ہر قسم کے علمی حکمی جدید فلسفیانہ خیالات کو ادا کرنے کی صلاحیتیں اس میں بہت بڑھ گئی ہیں مگر خاص فنی کتابوں کے قطع نظر عام ادب میں زیادہ تر نظم اور افسانہ نویسی پر توجہ بہت زیادہ صرف ہوتی رہی ہیں اور مضمون نگاری کے فن نے زیادہ ترقی نہیں کی ہے گو مزاحیہ مضمون نگاری نے اس عرصہ میں کچھ ترقی کر لی مگر ایسی سنجیدہ اور پُر مغز مضمون نگاری جو روزمرہ زندگی کی زیرِ سطح حقیقتوں کو پُر لطف انداز میں پیش کرے، جیسی کہ آپ کو انگریزی زبان میں بہت ملے گی۔ اُردو میں کم پائی جاتی ہے۔ میرا یہ مطلب یہ نہیں کہ اردو میں یا اردو کے ادیبوں میں اس کی صلاحیت نہیں۔ نہیں میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ اس طرف توجہ کم کی گئی ہے اور اس صحبت میں میں یہی چاہتا ہوں کہ آپ کو اس طرف متوجہ کروں۔

آپ کہیں گے کہ آپ نے وعظ تو کہہ دیا کچھ نمونہ پیش کیجئے کہ آپ کا مطلب واضح ہو تو لیجئے میں خاکہ کے طور پر آپ کے سامنے چند خیالات جو زیرِ سطح چیزوں کو

چھیڑتے ہیں پیش کرتا ہوں۔ یہ صرف اپنے بیان کی وضاحت کے لئے ہے۔ کوئی ادبی ادعا نہیں۔ آپ میں سے جو ادیب ہیں اگر ان کے دل کو میری یہ بات لگے اور اس کوشش اور اسلوب میں کوئی اچھی چیز نظر آئے تو اُن سے میری یہ عرض ہے کہ وہ اس چیز کو اپنی ادبی قابلیتوں کے ساتھ بہتر بنا کر پیش کریں اس مضمون کا عنوان ہے "وہ جو حاصل نہیں ہوتا"۔

وہ جو حاصل نہیں ہوتا، وہ انسانی زندگی میں کتنی مرتبہ اُس چیز کے بھی انتہائی لطف کو حاصل نہیں ہونے دیتا جو حاصل ہوتی ہے؟ ماضی ہمیں کس قدر پُرامن اور پُرمسرت معلوم ہوتا ہے؟ وہ شاید اس لئے کہ اب وہ ہماری موجودہ زندگی کا جزو نہیں رہا، بجز اس کے کہ حافظہ میں محفوظ ہوتا ہے۔ لیکن مستقبل! یہ مستقبل جب تک ہم چالیس سال کے ہونے لگتے ہیں ایک طویل اور مسلسل پُرامید زمانہ ہوتا ہے جو دلی امنگوں سے سازگار معلوم ہوتا ہے لیکن اس عمر کے بعد زندگی کے وہ ایام جو ہمارے سامنے ہوتے ہیں ایک نامعلوم خوف سے متاثر ہونے لگتے ہیں کہ مستقبل میں شاید ماضی ہی دہرایا جائے گا اور اس دوسری بار زیادہ غیر دلچسپ اور بے لطف ہوگا اور اس میں یہ روز افزوں خطرہ بھی ہوگا کہ بے رحم تقدیر کی تیر اندازی اور سنگباری کا مقابلہ کرنے کے لئے اب ہمارے پاس اتنی طاقت بھی نہ ہوگی جو جوانی کا خاصہ ہے۔

پس وہ چیز جو اب کبھی حاصل نہ ہو سکے گی، جیسے جیسے وہ ماضی میں دور ہوتی جاتی ہے زیادہ شاندار معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن ہم نے مسرت کے کتنے مواقع کھو دیے؟ ہم کس قدر پُرمسرت ساعتیں بسر کر سکتے اگر ہمیں پہلے سے یہ معلوم ہو جاتا جو اب معلوم ہوا ہے! کاش ہم نے کچھ جرأت سے کام لیا ہوتا! اب جو ہمت ہم میں ہے وہ تو زندگی کی طرف سے لاپرواہی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے مگر افسوس کہ اب زندگی جرأت دکھانے کے مواقع ہمارے لئے باقی نہیں رکھتی۔ متوسط عمر میں جس قوت کے اظہار کی ہمیں اجازت دی جاتی ہے وہ صرف اس حد تک ہے کہ ہم ماضی کو بھول جائیں، مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں، اور حال کو جس قدر پُرامن طریقے سے ممکن ہو بسر کرلیں۔ ممکن ہے کہ یہ ایک

عقلمندی کا فعل ہو لیکن اس سے روح میں کوئی تازگی نہیں پیدا ہوتی۔ اُس روح میں جو ہمیشہ اپنے زمانہ سے کچھ آگے ہی رہا کرتی ہے وہ روح جس کو بعض "امید" سمجھتے ہیں اور بعض "بلند آہنگی" اور جس کو اس سخت زندگی کے دوران میں سب اپنے "خواب کی تعبیر" کہتے ہیں۔

اس وجہ سے تاریخ کا سب سے زیادہ غیر دلچسپ حصہ ہیں وہی معلوم ہوتا ہے جس میں ہم جیتے ہیں۔ آج سے دو سو سال بعد یہ سائنس والے انسانی زندگی کو حیرت کا ایک معجزہ بنا کر رکھ دیں گے مگر دو سو سال قبل کی انسانی زندگی میں کس قدر امن اور خالص امن و آشتی کا دور دورہ تھا کہ آج اس پُرشور عبوری دور میں بھی وہ اپنی شاندار کیفیت سے خالی نہیں معلوم ہوتا۔

اگر مجھے اپنی پسند پیش کرنے کا کوئی موقع ملتا تو میں دو سو سال پہلے کی دنیا میں زندگی بسر کرنا اس سے بہت زیادہ پسند کرتا کہ مجھے آج سے دو سو سال بعد ۲۱۴۲ء میں زندگی بسر کرنی پڑے۔ ان سائنس داں حضرات کی ایجادوں سے متعلق میرے اندر بہت گہرے احساسات تحسین موجود ہیں لیکن ان ایجادوں کو دوسرے اشخاص جس انداز سے استعمال کر رہے ہیں اور غالباً کرتے رہیں گے۔ اس سے میرے اندر ہمیشہ ایک قسم کی گھبراہٹ اور مایوسی پیدا ہوتی ہے انسان نے فطرت پر تو فتح پا لیا ہے لیکن اس فتح کو بڑی تیزی کے ساتھ صرف اپنے ساتھی انسانوں کی بربادی کے لئے استعمال کرنے لگتا ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ بربادی، تباہی، جان کی، حسن کی، امن کی ہی وہ چیز ہے جس کے لئے اغلب طور پر سائنس کی جدید ایجادیں وہ لوگ استعمال کر رہے ہیں جن کے ہاتھ میں ترقی کی موٹر کار کی اسٹیرنگ ہے۔ علم یقیناً ایک قوت ہے، مگر کیا وہ مسرت بھی ہے؟ کیا وہ خوشی کا مترادف ہے؟ کبھی اس نے قناعت بھی پیدا کی ہے! افسوس ہے کہ تجربات زندگی ان سوالات کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔

پس زندگی جس طرح سے کہ اس کو قدیم لوگ بسر کرتے تھے مثلاً اُس وقت جب ہمارے دادا، پردادا نیمہ، جامہ، چغے اور انگرکھے استعمال کرتے تھے۔ اس وقت کے لوگوں کی زندگی کس قدر پُرمسرت معلوم ہوتی ہے بہ نسبت اُس زندگی کے جو اس زمانہ کے لوگ دوڑتے

اور ہانپتے بسر کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اب ہم بنگلور سے تنالی تک دو گھنٹے میں جا سکتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ تنالی جانا کون چاہتا ہے؟

پھر بھی میں اپنے دوسرے انسانی بھائیوں کے ساتھ اس اعتقاد میں شریک ہونے کے لئے تیار ہوں کہ ترقی کے تیز گردش کرنے والے پہیئے ہمیں کسی "زرین پرامن دور" کی طرف لے جا رہے ہیں۔ دور جدید کی ان تعجب خیز تیز رفتار سواریوں پر غور کرنے کا مجھے اس وقت موقع ہوتا ہے جب کسی بھری ہوئی "بس" میں سوار ہونے کے بعد اور کھڑے ہونے کے لئے بھی جگہ مشکل سے پانے کی کوشش میں متعلقہ خادم پبلک کنڈکٹر صاحب کی کسی قدر تلخ آواز "آگے چلئے" "جگہ دیجئے" کی سنائی دیتی ہے۔ میں بعض وقت اپنے روزانہ اخبار کے پرچے کے فوائد پر بھی غور کرنا پسند کرتا ہوں خصوصاً جب وہ مجھے مطلع کرتا ہے کہ جنوبی امریکہ کے زلزلے میں کئی ہزار آدمی ضایع ہوگئے، موضع سانگلی میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو مار ڈالا۔ یا یہ کہ جنگ کی حالت روز بروز اپنی خونریزیوں، تصادمات اور وسعت اثر کے اعتبار سے خطرناک اور نازک تر ہوتی جا رہی ہے۔ پھر اس دور جدید کی خواتین کے اُس ہنر پر بھی میں کبھی غور کرتا ہوں جو انہیں دو سال پہلے کی ساڑی اور بلوز کو کتر بیونت کرکے یا تورا اور جھالر بدل کر اس طرح کا بنا دینا سکھاتا ہے کہ اس کی پیدائش کی اصلی تاریخ کا پتہ نہ چل سکے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں کہ اگر وہ چیزیں بالکل تازہ اور حالیہ موسم کے فیشن کے مطابق نہ معلوم ہوئیں تو ہمیشہ کے لئے "سوسائٹی" میں ناک کٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ میں کبھی اُن کروروں روپیوں کا بھی خیال کرتا ہوں جو دنیا کی وہ مسیحی اقوام اسلحہ سازی اور مشغلۂ جنگ پر صرف کر رہی ہیں جن کے مذہب نے ان کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کا سبق دیا ہے۔ غرضکہ میں ہماری اس تہذیب جدید کی روزمرہ زندگی کی ان سینکڑوں چیزوں پر غور کرتا رہتا ہوں جو انسانی ذہانت کو ایک "وحشی" کی ذہانت کے مقابلہ میں اس قدر بلند، نازک اور نفیس بنا دیتی ہیں۔ مجھے یقیناً اپنے انسان ہونے پر فخر سا محسوس ہونے لگتا ہے بلکہ اس سے مجھے یہ محسوس کرنے میں مدد ملتی ہے کہ پچھلی نسل کے لوگ مجھ سے

گھٹیا قسم کے تھے کیونکہ وہ اُن برکات دور حاضرہ کو معلوم کرنا تو کجا اُن کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے جن سے ہم روزمرہ اس باقاعدگی سے مستفید ہوتے رہتے ہیں کہ بعض وقت ناشکری کرنے لگتے ہیں۔

پھر بھی میرے دماغ میں یہ خیال چکر لگا ہی جاتا ہے کہ مرد اور عورتیں جنہوں نے ہم سے بہت پہلے کے زمانے میں زندگیاں بسر کیں انہوں نے زندگی سے زیادہ مسرتیں حاصل کیں۔ گو ممکن ہے کہ ان کی زندگیاں ہم کو زیادہ پُر مسرت اس لئے معلوم ہوتی ہوں کہ ہم اُن کی دنیا کا تصور صرف قدیم نقشوں، تصاویر، یا کھلونوں کے ذریعہ سے کرتے ہیں یا اُن قصوں اور رومانچوں سے جو ہم تک ادبی شاہکاروں کی حیثیت سے پہنچے ہیں۔

گو درحقیقت میں یہ اندازہ کر سکتا ہوں کہ کوئی ستر سال پہلے دنیا میں اس سے زیادہ تکلیف اور ناداری تھی جتنی کہ اب ہے کیونکہ ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں ایک قسم کی منافقت زیادہ تھی اور سماجی ضمیر ہمیشہ سے زیادہ مردہ تھا۔ مذہب سستی کے ساتھ سو رہا تھا حالانکہ اس کے چونک پڑنے اور زندہ رہنے کے کافی وجوہ تھے۔ مغربی تہذیب نے مشرقی تہذیب کو اس طرح فتح کیا تھا کہ ایک ہاتھ میں انجیل تھی اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لیکن اس کا جو مرقع مغرب کو جوش دلانے اور اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے پیش کیا جاتا تھا اس میں صرف انجیل والا ہاتھ دکھایا جاتا تھا۔ دنیا کی عبادت گاہیں محبت والے خدا کی عبادت کرنے والوں سے معمور رہتی تھیں جبکہ انہیں عبادت گاہوں کے اطراف خدا کے بہت سے بندے اُس حقیر معاوضہ کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہتے تھے جو اُن کی روح اور جسم کو متحد رکھنے کے لئے بمشکل کافی ہوتا تھا اور ان کے اطراف چھوٹے چھوٹے بچے اس صحت اور آزادی سے محروم رہتے تھے جو ہر جگہ کے بچوں کا امتیازی حق ہونا چاہئے۔ لیکن تصویر کے اس رُخ پر بہت کم غور کیا جاتا ہے بجز اس کے کہ اس کو بہت دیر تک نظر جمائے ہوئے دیکھا جائے۔ البتہ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں احمقانہ جلد بازی اور دوڑ دھوپ

نہ تھی۔ نہ عام ہڑتالیں ہوتی تھیں۔ نچلے درجے کے لوگ اپنے مقام کو سمجھ کر نچلے ہی بیٹھے رہتے تھے جس سے اونچے درجے کے لوگوں کو غیر معمولی فائدہ ہوتا تھا اور نچلے درجے والوں کا بھی بظاہر کچھ زیادہ گھاٹا نہ ہوتا تھا کیونکہ انہیں قناعت میسر ہوتی تھی اور قناعت میں سمجھتا ہوں کہ مسرت کی ایک شکل ہے۔

جو لوگ تناسخ کے مسئلہ کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ کے جو حصے یا ادوار ہم کو سب سے زیادہ مرغوب خاطر معلوم ہوتے ہیں وہ اس لئے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ ہم جب روحانی ارتقا کو پہنچنے کے لئے چکر کھا رہے ہیں اس کے سلسلہ میں ہم اس متذکرہ دور تاریخی میں زندگی بسر کر چکے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں کبھی اٹھارویں صدی میں زندگی بسر کر چکا ہوں اور شاید میری وہ مختصر مگر پُرمسرت زندگی یونان میں بسر ہوئی ہوگی یہ تاریخ کا وہ زمانہ ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔ میں اپنے احساسات کو علمی یا سائنٹفک طریقے پر تو نہیں پیش کر سکتا ہوں۔ مگر بہر حال جب میں اٹھارویں صدی کے حالات پڑھتا ہوں تو مجھے خدا جانے کیوں، یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنی زندگی کے کسی ابتدائی باب کا مطالعہ کر رہا ہوں میں اُس زمانے کی دنیا کا آسانی سے تصور کر سکتا ہوں لیکن میں قدیم معر، نشئت جدیدہ فرانس کے دور یا انگلستان کے کسی تاریخی حصے کا اس آسانی سے تصور نہیں کر سکتا۔ یعنی کم از کم ان کے تصور کے لئے مجھے سخت کوشش کرنی پڑتی ہے۔ میں کسی اٹھارویں صدی کے نمونہ کے مکان میں داخل ہوتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اِدھر اُدھر پھر پھرا کے اپنے گھر واپس آگیا اور جب میں اٹھارویں صدی کی تصاویر، فرنیچر اور لباس وغیرہ دیکھتا ہوں تو میں اپنی آنکھوں کے سامنے اُس زمانے کی تاریخ کو زندہ دیکھنے لگتا ہوں۔ یہ عمل میرا ذہن کسی اور دور کے ساتھ نہیں کرتا جو عجیب بات ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ "عجیب" کیفیت ہر شخص کو محسوس ہوتی ہوگی جو تاریخ کے کسی نہ کسی دور کو دوسرے ادوار کے مقابلے میں اپنی ذاتی کشش کی وجہ سے بہت مرغوب پاتا ہو۔ یا شاید یہ پھر اُسی چیز کا طلسم ہو جو انسان کھو چکا ہے یا جو حاصل نہیں ہوتی۔

لطیف احمد فاروقی

ادب میں بُرائی کا عنصر

ادب ایک آرٹ ہے

ادب ایک آرٹ ہے، اور سب جانتے ہیں کہ آرٹ کا اولین مقصد حُسن و مسرت کی تلاش، غور و فکر کی دعوت، تسکین قلب کی جستجو، انفرادیت کی تخلیق، اور تخیل اور جذبات کی موثر تر جمانی ہے۔ ادب کا تعلق براہ راست زندگی سے بھی ہے اور زندگی خیر و شر کے ایک طوفان کا نام ہے بقول میتھو آرنلڈ اگر ادیب "زندگی کی تنقید" کرتا ہے تو وہ لازماً زندگی کے خیر و شر دونوں سے دوچار ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شر کو خواہ وہ زندگی سے متعلق ہو، یا تخیل اور جذبے کی قلبی دنیا سے ادب میں کس طرح استعمال کیا جاتا ہے، اور ادب میں برائی داخل ہونے سے اس میں حسن کس طرح پیدا ہو جاتا ہے۔

برائی خیر سے قوی تر ہے

بعض لوگ حقیقت پرستی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور "ادب برائے ادب" کہہ کے یہ محسوس کرتے ہیں کہ جس ادب میں برائی کا ذکر زیادہ واضح ہوتا ہے اس کا جمالیاتی اثر خیر محض کی بہ نسبت زیادہ ہو جاتا ہے۔ واقعات کچھ اس کی تائید بھی کرتے ہیں۔ "بہرام کی چوری" ہمیں اخلاق ناصری کے خشک وعظ و نصیحت سے زیادہ دلفریب نظر آتی ہے۔ میرے ایک دوست نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا تھا۔ "جانتے ہو امیر علی ٹھگ کی سوانح عمری دنیا کا ایک شاہکار ہے۔ عمر عیار کی زنبیل اور اس کی شرارتوں سے کون ایسا شخص ہے جو انس نہ رکھتا ہو۔ تین سو چوہے کھا کر بلّی حج کو چلی۔ اس عام ضرب المثل کو زندگی کے بعض نمایشی پہلوؤں کی تنقید کے لئے بڑے لطف سے استعمال کیا جاتا ہے۔ آج کل ہمارے افسانہ پرست

نوجوان کو عصمت چغتائی صاحبہ کی عریاں نگاری میں بڑا لطف آتا ہے، اور ہم لوگ "گناہ کی راتیں" شرمناک افسانوں کو ادب سمجھنے لگے ہیں۔ اشتراکیت کے نام سے لامذہبیت، غرور و سرکشی، آزادی اور بے راہ روی کو نظم کا موضوع قرار دیا جارہا ہے اور اسے شاعری کے نام سے موسوم کیا جارہا ہے۔ اس افراتفری میں معیار اور توازن کا پتہ ہمیں اس وقت چلیگا جب ہم یہ معلوم کرلیں کہ برائی کا عنصر ادب کو کس طرح ادب بناتا ہے اور اس کا اصول و معیار کیا ہے؟ ہم چند ایسے ہی سوالات کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

مغرب میں رفائیل نے میڈونا (بی بی مریم) کی تصویریں بنائیں اور دلاکوئے نے بونوں اور آوارہ شہزادوں کے عکس اتارے۔ ان دونوں میں حسن کاری کا کمال موجود ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ آخرالذکر میں زندگی زیادہ جھلکتی ہے۔ گوئٹے نے شیطان کو پیش کیا، اور یہ "شیطان" اس کے اعلیٰ ترین ادبی اور حسن کارانہ تخلیق میں شمار ہوتا ہے۔ شکسپیر لیڈی میکبتھ کو پیش کرنے میں اتناہی کامیاب ہوتا ہے جتنا ڈس ڈی مونیا کو پیش کرتے ہوئے۔ جو لوگ ادب میں اخلاقی قدروں کو دیکھتے ہیں، اور مذہبی جذبات کو ادب کا اعلیٰ ترین جزو سمجھتے ہیں، وہ یہ سوال کرسکتے ہیں کہ اثر اور کمال کے اعتبار سے برائی کی قوت کیوں خیر کی قوت کے برابر ہوتی ہے بلکہ بسا اوقات اس سے آگے کیوں بڑھ جاتی ہے؟۔

خیر، حق، اور حسن ناقابل فہم ہے

لیکن اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ معلوم کرلینا ضروری ہے کہ خیر و شر کا اصولی مفہوم کیا ہے؟ عام طور پر حقیقت کی تمورتی تین عنوانات پر قائم کی جاتی ہے۔ حق، خیر اور حسن، لیکن ابھی تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ حق کسے کہتے ہیں، خیر کیا ہے اور حسن کسے سمجھنا چاہیئے مثلاً حکیم نطشے اپنی کتاب Begond Good and Evil میں اپنا استدلال اسی بحث سے شروع فرماتے ہیں کہ ہر چیز کو اس کی ضد سے پہچاننا علم کیوں تسلیم کیا جاتا ہے، اور ہر ضد کو برا سمجھنا کیا ضرور ہے۔ ممکن ہے ضد ہی حقیقت ہو۔ چنانچہ وہ ہم پر اس طرح خفا ہوتے ہیں۔

"How could anything oreginate and of its opposite? For example Truth and of error ? or the will to the Truth and of the will to deception ? or the generous deed and of selfishness ? Or the pure sunbright vision of the wise man and of covetousness ? Such genisis is impossible; whoever dreams of it is a fool nay worse than a fool."

وہ زندگی کی خیر اور حق اس میں محسوس کرتے ہیں کہ شوپنہاری "مشیت اور ارادہ" قوت میں مبدل ہو جائے اور عقلیت کو جنون سے وابستہ کیا جائے۔ خشک محسوسات کو جذبات ترین ضم کر دیا جائے۔ وہ مذہب اور اخلاق کو خود غرض محدود دل و دماغ رکھنے والے انسانوں کی پیداوار سمجھتے اور اخلاقیات کو زندگی کی سب سے بڑی بداخلاقی تصور فرماتے ہیں بعض نوجوان اس " دیوانہ بہ کارگہ شیشہ گر" کے تیز جذبات سے مرعوب ہو کر اپنے خیالات کا توازن کھو بیٹھتے ہیں، لیکن بمصداق " حکیم نکتہ دان ما جنوں کرد' ہمیں نطشے کے قول کے ساتھ ہمارے بڑے آدمی حضرت اقبال کے اِس بلند ارادے کا بھی ساتھ دینا چاہیئے۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے!

اس طرح حق کی تعریف بھی متنازعہ فیہ ہے۔ ایک مفکر نے بڑے مزے سے کہا ہے۔

"Yrtuh is the conspiracy of the experts, and when any meaning realized conforms with the experiments of the scientific man, that meaning is projected into truth and realism."

"سچائی ماہرین کی سازش کا نام ہے"۔!

چند ارباب فکر و نظر حق کو عرفان اور حسن کو وجدان کہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک

مشاہدہ عام کا تعلق ہے، انسان کو سوائے عورت کے کسی چیز میں بہت کم حسن نظر آتا ہے چنانچہ ایک منچلے نے حسن کی تعریف بڑے مزے سے کی ہے۔ اور کہا ہے۔

"Beauty lies in the females as understood by the males, and in the males as understood by the females"

ہمیں اس وقت خیر و شر کی گتھیوں کو سلجھانا مقصود نہیں ہے، کیونکہ یہ ممکن بھی نہیں ہمارے مشرقی حکیم نے صاف کہدیا ہے۔

کہ کس نکشود و نکشاید زحکمت ایں معما را

ادب میں برائی کے عنصر سے ہماری مراد سیدھے سادھے طریقے پر اُن امور کی طرف اشارہ کرنا ہے جنہیں عرف عام میں گناہ، خوف، انتقام، غصہ، شرارت، قتل و غارت، عریانیت کفر، مضحکہ، طعن و طنز، بدصورتی، کینہ وغیرہ کہا جاتا ہے۔ ہم یہ معلوم کرینگے کہ زندگی کے یہ تخریبی عناصر، یا ناخوشگوار مظاہر ادب میں کس طرح استعمال کیے جاتے ہیں؟

برائی کے استعمال کے سلبی اور ایجابی طریقے

اس سوال کا جواب دو طریقوں سے دیا جاتا ہے۔ ایک طریقہ سے یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ادب اور حسن کاری کی دنیا میں برائی کو مرغوب بنانے والی ایک سلبی قوت ہوتی اور دوسرے طریقے میں اس امر کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ برائی خود ایجابی قوتوں کے ذریعے دلفریب بنائی جا سکتی ہے۔ ہم پہلے سلبی قوت کو سمجھانے کی کوشش کرینگے۔

سب جانتے ہیں، اور ایک حسن کار اسے اچھی طرح محسوس کرتا ہے کہ لوگ دنیا میں حسین چیزوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ معصوم بچے، خوش اعضا عورت، اور جوان سپاہی کو دیکھ کر ہر شخص خوش ہوتا ہے مگر چیتھڑے لگائے ہوئے ایک بوڑھے کو دیکھ کر کوئی خوش نہیں ہوتا۔

کریہ منظر اشیاء، اور مکروہ امور کا استعمال کرتے ہوئے، حُسن کار کو دو قسم کی خاص کوششیں کرنی پڑتی ہیں۔ اول تو یہ کہ حُسن پرست دنیا کو خیر سے شر کی طرف، حسن سے بدصورتی کی طرف راغب کرنا، دوسرے نامرغوب امور اور بُری باتوں سے طبیعت کے خود بخود اچاٹ ہو جانے کی قوت کا مقابلہ کرنا اور اسے روکنا۔ اس لئے جو مسئلہ اس وقت بحث طلب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عمل کس طرح ہوتا ہے؟

بات یہ ہے آرٹ میں زندگی کتنی ہی اصلیت کے ساتھ پیش کی جائے، یہ امر واضح رہتا ہے کہ حقیقت کا بعینہ پیش کرنا ناممکن ہے۔ اصطلاحی زبان میں ہم یہ کہتے ہیں کہ آرٹ میں حقیقت کی نمایندگی ہوتی ہے۔ ادب بھی حقیقی زندگی کا نقشہ کھینچتا ہے، مگر یہ نقشہ عین زندگی نہیں ہوتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ موت، گناہ وغیرہ کی دہشت اور نفرت نصف سے زیادہ صرف اس خیال سے کم ہو جاتی ہے کہ یہ اصل واقعہ نہیں بلکہ اس کا عکس ہے۔ سینما دیکھتے ہوئے ہیرو کی موت پر ہم اتنے آنسو نہیں بہاتے جتنے کسی حقیقی بڑے آدمی کی موت پر بہاتے ہیں جو لوگ تماشے، اظہار اور نمایندگی کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے وہ عکس کو اصل، چھاؤں کو حقیقت سمجھ کر رونے لگتے ہیں۔ یہ گویا ایک قسم کی سلبی قوت ہے جو برائی کے مکروہ اثر کو کم کرتی ہے۔

کسی ناول میں ایک بُرے آدمی کا ذکر کیا جاتا ہے ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ آدمی برا ہے، لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کی بُرائی ہماری زندگی اور عمل کو براہِ راست کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر ہماری حقیقی زندگی میں کوئی ساتھی بُرا ہو تو ہم اس سے واقعی دور رہنے کی کوشش کریں گے، اور اگر ہم میں کوئی اصلاحی جذبہ ہو تو اس کی روح کو کثافت سے پاک کرنے کی سعی کریں گے، لیکن ناول کے بُرے آدمی کے ساتھ ہم صرف ایک قسم کی ہمدردی رکھیں گے تصور میں ہم اس کے ساتھ ہوں گے، اس کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور اس کی روح میں داخل ہونا چاہیں گے اس طرح برائی ہمارے قریب آئے گی، مرغوب خاطر ہوگی۔ برائی کا دور رہنا خود ایک

حسن ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ زندگی دراصل ایک شمع ہے جس پر ہم پروانہ وار گرنا چاہتے ہیں اپنی مرضی کے خلاف، ہم خوشگوار ناخوشگوار، خیر شر خوبصورت، بدصورت ہر چیز کی طرف ایک نامعلوم کشش کے ساتھ دوڑے ہوئے جاتے ہیں۔ یہ فطری کشش اور جذب بھی ایک سلبی قوت ہوتا ہے جو حسن کار کی دنیا میں برائی کو دلفریب بناتی ہے۔

جب ہم کسی ناول یا افسانے میں کسی گناہ انسانی کا مطالعہ کرتے ہوتے ہیں، تو اصل گناہ کی طرح ہیں اس سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ ہم میں ایک قسم کا "ہمدردانہ تجسس" پیدا ہوتا ہے اور ہم اس کے ہر پہلو کو سمجھنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس "ہمدردانہ تجسس" کی وجہ سے ساری زندگی ہمارے لئے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔

ایجابی طریقے

اب ہم برائی کو مقبول بنانے کے چند ایجابی طریقوں کا ذکر کریں گے۔

اس بات کو وضاحت سے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ 'برائی' سے نفرت رکھتے ہوئے، ادب میں برائی سے دلچسپی پیدا ہونے کے اسباب صرف "ہمدردانہ تجسس" ہی نہیں ہیں بلکہ چند اور قوتیں بھی ان کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہماری بعض نفرتیں ایسی ہوتی ہیں جو "موت"، بدشکلی، یا اندھیرے سے نفرتوں کی طرح سادہ اور فطری نہیں ہوتیں بلکہ یہ پیدا ہوتی ہیں، ہماری تعلیم اور تجربوں کی پیچیدگیوں سے۔ ہماری نام نہاد تہذیب اور ذہنی نفاستوں نے ہمیں قدرت کی بہت سی حقیقتوں کو ہمارے لئے قابل نفرت بنا دیا ہے۔ آرٹ کے چند موثر رجحانات نے جادو کا کام کیا ہے، اور اپنے جادو کی بدولت تہذیب، علم، رسم و رواج کے چہرے سے نمائشی پردے ہٹا کر حقیقت کو بے نقاب کیا ہے، اور برائی کی فطرت دکھائی ہے۔ ادیب، ایک شاندار عمیق النظری کے ساتھ دنیا کو دیکھتا اور اشیا میں ڈوبتا ہے اس کی وجہ سے ادب میں نمایش، اور ظاہرداری کے پردے آسانی سے چاک ہو جاتے ہیں اگر ظاہری حق کے چہرے سے نقاب ہٹادی جائے اور اندر سے چھپی ہوئی برائی کو صاف صاف

دکھا دیا جائے" تو یہ برائی، فوراً دلفریب اور موثر بن جاتی ہے جس طرح حافظ نے کہا۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

"کارِ دیگر" کی شرح، اگر وہ نمائش اور ریاکاری کے ظاہری تعلق کے ساتھ کی جائے تو ادب کا حسین موضوع بن جاتی ہے۔ بعض مجسمہ نگاروں نے عورت کے عریاں مجسمے صرف اسی لئے نہیں بنائے کہ ان کے جسم اور اعضا کا تناسب دکھایا جائے، بلکہ اس لئے بھی بنائے کہ اس سے عورت کی فطرت عریاں کا انکشاف کیا جائے۔ قدرت نے آرٹ اور ادب کے ذریعے دنیا سے بہت کچھ انتقام لیا ہے، دنیا نے برائیوں پر تہذیب کے جو پردے ڈالے تھے، ادب نے انہیں اٹھا دیا۔ اسی اصول کے تحت عصمت چغتائی کے ادب کو جو محض عریاں نگاری پر مبنی ہے ادب سمجھنا علمی غلطی ہوگی۔ اگر اس عریاں نگاری کا مقصد صرف عریاں بیانی نہ ہو بلکہ مقابلتہً ہماری نام نہاد ریاکاری، نمائش ظاہری کا پول بھی کھولا جائے تو اس وقت یہ عریاں نگاری اس میں ادبی رنگ پیدا کر سکتی ہے لیکن ہمارے تجارتی اور نمائشی ادیبوں میں ابھی صحیح ادب اور آرٹ پیش کرنے کی یہ پختہ کاری پیدا نہیں ہوئی ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ حسن کار، ہر چیز کو انسانی احساسات اور جذبات کے راستوں سے داخل کرتا، اور اپنے نقوش کو ان کے لئے ہیجان انگیز بنا دیتا ہے۔ مصور خط اور رنگ کے ذریعے، موسیقی داں آواز کے ذریعے مجسمہ ساز مٹی کے ذریعے اور ادیب لفظ و خیال کے ذریعے ہمارے احساسات کو بیدار کرتا، اور انھیں کے اندر سے برائی کی فطرت اور حقیقت کو ہماری رگوں میں دوڑا دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں برائی ایجابی قوت کے ساتھ حسن کاری کے نقطہ نظر سے جمال کی سرحد میں داخل ہوتی ہے۔ ہم ادب میں شاعر اور رند کو "ناصح مشفق" پر اکثر پھبتیاں اڑاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جو "ناصح مشفق" اور زاہد خشک ہوتے ہیں، وہ شاعر اور رند کے منھ پھٹ پن اور اس کے اثر سے

خوف کرتے ہیں اس کی وجہ بھی ہے کہ ناصح مشفق کا قول جذبات کے اندر داخل نہیں ہوتا' اور شاعر اور رند کی بات فوراً دل کے راستوں سے روح میں داخل ہو جاتی ہے۔

ہر برائی ادب کا موضوع نہیں

اس بحث سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ ادیب' حسن کار کی حیثیت سے ہر برائی کا استعمال کر سکتا ہے۔ اس کی سرحد میں صرف وہی برائیاں داخل ہو سکتی ہیں جو ادیب کے "جمالیاتی تجربے" میں آتی ہوں' اس کے جذبے اور احساس کو جگاتی ہوں' اور اس میں کسی آزاد مشاہدے کی گنجائش ہو ہر ایک برائی ہر ایک بے اثر واقعہ' ہر ایک غیر تجرباتی بد عملی' ادیب کے کام کی چیز نہیں ہوتی کسی محلے میں چور نے چوری کی۔ یہ مقامی واقعہ ادیب کے لئے بے اثر ہے' کیونکہ یہ چوری نہ ایسی نتیجہ خیز ہے' اور نہ موثر کہ زندگی کی عمومیت پر اثر انداز ہو سکے اور نہ اس میں اتنی وسعت ہے کہ وہ دنیا کے جذبات اور احساسات کو مسخر کر سکے۔ البتہ "بہرام" کی چوری' اور شرلاک ہومز کی جاسوسی قابل دلچسپی ہے' کیونکہ اس میں عالمگیر تاثر اور وسعت موجود ہے۔

اس کا اصول بہت دلچسپ ہے اور اسی اصول کے ساتھ ہم ادب کی شناخت کر سکتے ہیں۔ ارسطو نے اسے یوں کہا تھا' کہ حسن کار جب فطرت سے حقائق لیتا ہے تو وہ حقائق خاص Particular ہوتے ہیں۔ لیکن جب انہیں وہ اپنا بنا لیتا ہے تو وہ عالمگیر Universal بن جاتے ہیں اس طرح ہر خاص برائی اور ہر خاص جذبے ہیں جب تک عالمگیریت کا عنصر نہ ہو اس وقت تک وہ برائی اور جذبہ ادب کے کام کا نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ارسطو ہی کے الفاظ میں حسن کار حقائق فطرت کو اپنے آرٹ کے جادو سے Something other than itself بنا دیتا ہے یعنی "کچھ سے کچھ اور" یعنی حقیقت نری تقلید' یا تشریح یا نقل نہیں ہوتی' بلکہ آرٹ کے انفرادی کمال سے کچھ اور بن جاتی ہے اسی کچھ اور بن جانے میں ہی ادب کے حسن کا راز اور اس کی ایجابی قوت

موجود ہے۔

لیکن بعض وقت ہمیں یہ تجربہ ہوتا ہے کہ موضوع کے عالمگیر انتخاب اور دلکشی کے باوجود بھی بعض لوگ ادب اور آرٹ سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان پر کوئی نہ کوئی مذہبی یا اخلاقی تعصب سوار ہوتا ہے' یا وہ کسی نہ کسی مخالف خیال ماقبل کے شکار رہتے ہیں۔ اس کی دوسری وجہ زیادہ دلچسپ ہے۔ بعض لوگ کچھ ایسے بے حس واقع ہوتے ہیں کہ نہ وہ کسی چیز کا اثر قبول کرتے ہیں' اور نہ اپنے جذبات کو دوسروں تک منتقل کرسکتے ہیں ان لوگوں کے سامنے اقبال کا اعلیٰ ترین فلسفہ' پریم چند کا بلند افسانہ' ٹیگور کی لطیف نظم' اور غالب کی عمدہ غزل ایک بے اثر چیز ثابت ہوتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ آرٹ کو پسند کرنے کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان میں ایک قوی ذہنی رجحان' ایک وسیع دل لچکدار احساس اور زود اثر جذبہ موجود ہو۔ ادب کا کام اتنا ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کو پیش کرے جس کا جاننا ضروری ہے' اور جو دل کے زیر اثر ایک دلکش سانچے میں متشکل اور مقید ہوسکے۔ اگر دل ہی بے اثر ہو تو ادب کام آتا ہے اور نہ مصوری۔ مصحفی کا شعر ہے۔

مصحفی سود نصیحت کا نہیں عاشق کو — میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے؟

مثبت قوتوں کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے اب تک یہ بتایا کہ "حسی اثر" اور عمیق النظری جذبہ اور اس کی تسکین کے ذریعے حسن کار اور ادیب برائی کو دلفریب بناتا' اور اسے اپنے لئے استعمال کرسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ابتدائی باتیں تھیں اب ہم اُن خاص طریقوں اور زیادہ سائنٹفک اصولوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے ذریعے برائی کا عنصر ادب میں خیال کیا جاسکتا ہے۔

حزنیہ' المیہ اور طربیہ ادب کے تین بڑے حصے ہیں جن میں برائی کا عنصر آزادا اور دلفریب طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک حُزنیہ' دوسرے طربیہ۔ تیسرے المیہ۔

حزنیہ پہلے ہم حزنیہ سے بحث کریں گے کیونکہ یہ ادب کی ایک خاص صنف ہے۔ ابتدائً حزنیہ سے مراد عظیم شخصیتوں کی شاندار اور قابلِ تماشا کشمکش اور نزاع تھی۔ لیکن آجکل حزنیہ کا میدان وسیع تر ہو گیا ہے اور اس سے مراد ــــــ

> کسی شخصیت کی وہ دلیرانہ جدوجہد لی جاتی ہے جو کسی خاص مقصد کے حصول کے لئے کی جائے اور اس میں ناکامی اور موت کی مصیبت تک برداشت کرنی پڑے۔ مخالفت کبھی قدرت کی طرف سے ہو سکتی ہے، کبھی تقدیر کی طرف سے، کبھی معاشی اور سیاسی اغراض کی طرف سے، کبھی خود اپنے نفس کی طرف سے، اہمیت صرف اس بات کی ہے کہ آخر وقت تک منھ پھیرے بغیر دلیرانہ جنگ کی جائے۔

آج ہم ساری انسانی زندگی کو ایک بڑا حزنیہ سمجھنے لگے ہیں۔ کسان جو خشک زمین اور بخیل آسمان کے خلاف روزگار کے لئے جنگ کرتا ہے، ایک عورت جو بغیر کسی خوشی کے صرف بچے پیدا کرنے میں اپنی جوانی کی بہار کھو بیٹھتی ہے، یہ سب حُزنیہ ہے۔

حُزنیہ کی دوسری شرط یہ ہے ــــــ

> ہیرو جو کشمکش کرے وہ فطری اور ضروری ہو، اس کی فطرت کا ایک جزو سمجھی جائے اور اس کا نتیجہ ایسا ہو جس کا کوئی چارہ کار نہ ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم آسمان کے ظلم و ستم، ہیرو کی مظلومیت، اور موت اور شکست کے نتائج میں کیوں ایک قسم کا حُسن، دلچسپی، اور بلندی محسوس کرتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہیرو جس کشمکش میں مبتلا ہے، اس کی قدر و قیمت اس کی نظر میں بہت زیادہ ہے۔ ہم اس کی مرضی اور خیال کے ہم آہنگ بنا کر اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ دوسرے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہیرو کی بہادری میں ایک شان اور عظمت اسکی موت اور شکست کا اچھا نعم البدل ہوتی ہے۔ جب تک ہم زندگی کی قدر و قیمت سمجھتے رہیں گے

اس وقت تک ہمت اور بہادری کی بھی ہماری نظر میں خاص وقعت رہے گی۔ یہاں ایک دلچسپ سوال یہ کیا جاسکتا ہے کہ بہادری کیا ہے؟ ہمت کسے کہتے ہیں؟ اس کی تعریف یہ ہے۔ ایک وسیع تر اور نئی زندگی کے لئے جو حفاظت کو ہمت اور بہادری کہا جاتا ہے۔ جب کسی شخصی ظلم یا ذاتی تشدد کے خلاف ہم اپنے متعلقات ہماری املاک اور ہمارے عقائد و اصول کی حفاظت کرتے ہیں تو اس کی یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مخالف قوت ایسی پیدا ہوتی ہے جو برائی کہلاتی ہے لیکن اس برائی میں یہ خوبی ہے کہ وہ ہیرو کے اعلیٰ ترین انسانی صفات اور پوشیدہ بلند صلاحیتوں کو ابھار دیتی ہے تو ہم نہ صرف ہیرو کی ہمت کی داد دیتے ہیں جو اس سے مقابلہ کرتا ہے بلکہ اس برائی کے ساتھ بھی ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ مختصراً اصطلاحی زبان میں حزنیہ کے قبول کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ ——

> ہم زندگی کی ضروری غیر ہم آہنگی کا یقین کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان اخلاقی قدروں کا بھی احساس رکھتے ہیں جو اس سے پیدا ہوتی ہیں۔

المیہ

حزنیہ میں غیر محسوس طریقے سے ایک اور چیز داخل ہوجاتی ہے جسے ہم Pathos یعنی المیہ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ حزنیہ اور المیہ میں فرق یہ ہے کہ المیہ میں بغیر کسی امید یا بلند اخلاقی کشمکش کے انسان تقدیر اور حادثات کا شکار ہوجاتا ہے اور شکست کھا جاتا ہے۔ لوگ اس پر افسوس اور رحم کرتے اور اس پر اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ حزنیہ کی لازمی شرط ہمت کی کشمکش اور قوی کردار کی دلیرانہ مزاحمت ہے۔ المیہ میں شکست کا منظر نظر آتا ہے۔ خیر کی فتح لازمی نہیں ہوتی۔

زندگی میں حزنیہ اور المیہ مشترک ہیں

اس کے بعد ایک بڑا دلچسپ مقام آتا ہے۔ آپ دیکھئے انسانی زندگی میں حزنیہ اور المیہ دونوں شامل ہوتے ہیں۔ ہر مرد اور عورت جب کشمکش حیات میں داخل ہوتی ہے تو کمزور ہوکر نکلتی ہے، قوی ہوکر نہیں شکستہ ہوجاتی ہے، سرکش نہیں افسردہ بن جاتی ہے، مسرور نہیں ہوتی،

اور موت کے انجام پر تو حقیقتاً بہت کم ہیرو اور ہیروئن باقی رہتی ہیں۔ لیکن اس انسانی کمزوری اور حیات کی درماندگی میں ایک حُسن ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ حُسن کہاں سے آتا ہے؟ اس برائی اور کمزوری کو ظاہر کرنے سے خیر اور خوبی کیوں پیدا ہوتی ہے؟

اس سوال کا جواب سب سے پہلے Mendelssohn نے دیا، اور Theodere Lipps نے المیہ سے متعلق کرکے اسے بہت وسعت دی۔

(Lipps) اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جب ہم کسی قدر اور نیکی کو نقصان پہنچانے یا اُسے نابود کرنے کی فکر کرتے ہیں تو ہماری نظر میں خود بخود اس کی قیمت اور تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ معشوق سے جدائی ایک قسم کا شیریں غم ہوتا ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا چیز کھو رہے ہیں۔ جوانی کا حُسن جو مرجاتا ہے ہمیں اس وقت زیادہ دلکش معلوم ہوتا ہے جب اس کی حقیقی موت محسوس کرتے ہیں۔ فارسی میں اس خیال کو ظاہر کرنے کیلئے ایک عام قول یہ ہے ــــ

قدرِ نعمت بعدِ زوال

ہم جیسے جیسے زندگی کی ہر بات کو اپنے ہاتھ سے چھینا جاتا ہوا پاتے ہیں، اور جیسے جیسے موت کو نزدیک آتا ہوا دیکھتے ہیں ویسے ویسے ہر حقیر اور جلد گذر جانے والی چیز، کمزور اور بے بس شے کے ساتھ ہمیں بطور خاص ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ ہمارا ان پر ترس کھانا محبت کو اکساتا ہے۔ اور ہم تقدیر کا مضحکہ اڑاتے ہیں کہ وہ ہم سے ان ننھی جانوں کو چھین لیتی ہے جن کی یاد اپنے حافظے میں تازہ رکھنا ہمارا فرض ہوجاتا ہے۔ آجکل سرمایہ داری اور حکومت کے استبداد نے انسان کو مفلسی، غریبی، مزدور اور کسان سے بہت وابستہ کر دیا ہے۔ اس کا راز بھی یہی ہے کہ تظلم اور بیکسی کی کشمکش میں انسان فطرتاً بیکسی کا ساتھ دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اشتراکیت میں حقیقت پرستی کا عنصر بطور حُسن کے تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنے ایک مضمون "مقامِ شعر" میں حقیقت پرستی کی تعریف اس طرح کی ہے۔

حقیقت پرستی "Realism" یعنے موجودیت۔ یہ نقطہ نظر اکثر ایک قسم کی مادیت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ اس نظریے کو مختصراً یوں بیان کرسکتے ہیں کہ اشیا ویسی ہی ہیں جیسی کہ دکھائی دیتی ہیں اور تمام موجودات زمان و مکان میں محدود اور طبیعی علت و معلول کے سلسلے میں منسلک ہیں جو کچھ ان سانچوں میں ڈھل نہیں سکتا اس کا وجود غیر یقینی ہے۔ اشیا کا کوئی باطن نہیں نفس ایک اعتباری شے ہے بعض لوگوں میں طبعاً اور بعض میں علوم مادیہ کے انہاک کے بعد ہستی کی نسبت اس قسم کی نظر مستقل ہوجاتی ہے۔"

(مجلۂ عثمانیہ جلد دوم)

لیکن آرٹ اور ادب میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس سے قبل واضح کیا گیا کہ ادب کو اپنی انفرادیت، حسین نگاہی اپنے احساس اور تخیل کے پردوں میں چیزیں جیسی ہیں ویسی نہیں دکھائی دیتی، بلکہ ان کی حقیقت بھی احساس اور تخیل کی طرح ان کا ایک جزو نظر آتی ہے۔ نری اصل پرستی ادب نہیں اور نہ حسن ہے۔ اس لئے انسانی بیکسی کے ساتھ نری ہمدردی صرف ایک اخلاقی جذبہ ہے، ادبی جذبہ وہ ہوگا جب کہ اس کے پیچھے ایک بلند آئیڈیل اور حسن کارانہ تصور ہو۔

حزنیہ میں ہیگل کے تصور سے زیادہ ناکافی تصور Protestants کا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہر بداعمالی کی سزا عاقبت میں دی جاتی ہے۔ اس لئے ہیرو کی ادبی موت زیادہ قابل افسوس نہیں ہوتی لیکن اسی خیال کی وجہ سے اس موت کی شان یعنے حسن کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

ارسطو کے استناد کے ساتھ حزنیہ کے متعلق ایک اخلاقی نظریہ یہ قائم کیا جاتا ہے کہ ہیرو کو اس کے قصور یا کمزوری یا بداعمالی کی سزا ملنی مبنی بر انصاف ہے۔ اس طرح Retributive justice "یعنی سزائے انصاف حزنیہ کی روح رواں

قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن دورِ جدید میں اس کی وقعت اس لئے نہیں رہی کہ ہم اب فطرت کو ہمیشہ منصف اور جج کا گون پہنے ہوئے عدالت فوجداری کا اجلاس کرتے ہوئے نہیں سمجھتے۔

طربیہ ادب میں برائی کا عنصر، طربیہ کے ذریعے بہت جلد حسن بن جاتا ہے ہم جس شے کو برائی سمجھتے ہیں، اگر وہ طربیہ کے ذریعے پیش کی جائے تو ہم اس سے لذت یاب ہوتے ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کی نظم چپاتی جس کا اقتباس درج ذیل ہے ہمیں اس لئے پسند آتی ہے کہ اس میں زندگی کی بعض ایسی حقیقتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو بظاہر روحانی سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کا تعلق درحقیقت مادیت سے ہے۔

جب ملی روٹی ہمیں، سب نورِ حق روشن ہوئے رات دن، شمس و قمر، نور و شفق روشن ہوئے
زندگی کے تھے جو کچھ نظم و نسق روشن ہوئے اپنے بیگانوں کے لازم تھے جو حق روشن ہوئے
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

جب تلک روٹی کا ٹکڑا ہو نہ دسترخوان پہ نے نمازوں میں لگے دل اور نہ کچھ قرآن پر
رات دن روٹی چڑھی رہتی ہے سب کے دھیان پر کیا خدا کا نور برسے ہے پڑے ہر نان پر
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

حسن جتنے ہیں جہاں میں سب بھرے ہیں خوان میں خوبیاں جتنی ہیں لا کر سب بھری ہیں خوان میں
عاشق و معشوق بھی ٹکیا کے ہیں درمیان میں پھنس رہے ہیں سب کے دل روٹی کے دسترخوان میں
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

اس نظم میں شاعر نے زندگی کی ایک حقیقی حماقت کا ذکر کیا ہے کہ بڑے بڑے انسان، فلسفی، شاعر، سیاست داں، سب کے سب روٹی کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور

انسان "شکم" کا بندہ ہو کر اپنا سارا فخر و ناز بھول جاتا ہے۔ یہ نری حقیقت نہیں ہے، بلکہ شاعر نے اپنے مخصوص طنزیہ اور ظرافت کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ اس نری حقیقت میں ایک حسن پیدا ہو گیا ہے۔

اکبر الہ آبادی کے کلام میں جو طربیہ چاشنی ہے وہی اس کا حسن ہے، حالانکہ اس میں زندگی کی برائیوں کا بہ کثرت ذکر کیا گیا ہے۔

Beauties of Life کے متعلق Puffer لکھتا ہے ـــــ

> Literature has "all thoughts, all passions, a'l delights,——the beauties of life to play with, to weave a spell for the whole man, Beauty in Literature is the power to enchant him through the mind and heart, across the dialect of life, into a moment of perfection."

اس مقولے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ادب کا حسن تین امور پر مبنی ہے۔

(۱) اس میں کامل انسان کے لئے جادو ہو، جو اسے مسحور اور مسرور کرے۔

(۲) دل اور دماغ اور زندگی کے راستوں سے یہ جادو اثر کرے۔

(۳) اس کی یہ ایک ساعت تکمیل کی پیداوار ہو۔

اگر برائی کو ان طریقوں کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ ادب میں حسن بن کر آجاتی ہے۔

ادب کا یہ حسن قائم رکھنا ہر ادیب کا فرض ہے ان کے بغیر اگر ادب میں نری برائیوں کا ذکر کیا جائے تو ادب کے موضوع سے ہٹ جانا پڑتا ہے۔ جب طربیہ ان برائیوں کو ادب بناتا ہے اور ادیب کو اپنے مقام پر لے آتا ہے تو اس کے چند طریقے ہوتے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔

طربیہ کے چند طریقے

(۱) مثلاً جب کسی شے کے متعلق ہم کچھ توقع رکھیں اور

اس کا کوئی معیار قائم کرلیں، اور یہ دیکھیں کہ وہ شے اس میں اچھی طرح نہیں کھپ رہی ہے تو ہمیں ہنسی آتی ہے۔ یہ ہنسی ایک معیار کے ساتھ حسن بن جاتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہماری زندگی طربیہ اور مضحک سے بھری ہوئی ہے۔ جیسے جیسے زندگی ترقی کرتی ہے، ہمیں نئی توقعات پیدا ہوتی ہیں اور نئے معیار قایم کرنے پڑتے ہیں۔ جب اشیا ان نئی توقعات سے وابستہ نہیں ہوتے تو اُن میں طربیہ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض وقت مذہب، عشق اور سیاست جیسے ہنگامے بھی ہنسی لاتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب ہم کسی شے کو اپنی توقعات کے مطابق نہیں پاتے تو اس پر خفا ہونے کے بجائے اس پر ہنستے کیوں ہیں۔ اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ مقابلتہً جب ہم اپنے آپ پر غور کرتے ہیں تو ہم کو اس شے میں معیاری اور خود میں معیار نظر آتا ہے۔ یہ احساس برتری ہم میں مسرت پیدا کرتا ہے۔ ہر ہنسی میں ایک غرور، ایک ظلم کا پہلو ہوتا ہے اس کی نمایاں مثال ہٹلر یا مسولینی کی اس ہنسی میں نظر آئے گی جو کبھی کبھی اُن کے لبوں پر آجاتی ہے) ہم کم معیار کے مقابلے میں فخر کرتے اور ہنس کر اس پر ظلم کرتے ہیں۔ یہ ہنسی حسن اس لئے ہے کہ ہم عملاً کچھ نہیں کرنا چاہتے، ہمارا جذبۂ عمل ہنسی میں مبدل ہو جاتا ہے۔

(۲) طربیہ اس وقت بھی پیدا ہوتا ہے جو اشیاء عام اصول، اور عمومی حیثیت رسم و اجماع کی سرحدوں سے ہٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ شوپنہار اسی لئے کہتا ہے کہ "مذہب، عشق اور اخلاق بسا اوقات مضحکہ خیز بن جاتے ہیں"۔ ہم نے سرکس میں دیکھا کہ Whip میں بیٹھنے سے پہلے مرد اور عورتیں بہت سنجیدہ نظر آتی ہیں، مگر جب کرسی زور سے چکر کھاتی ہے تو سب کا حلیہ بگڑ جاتا ہے، اُن کے سر کے بال الٹ جاتے ہیں، وہ سنجیدہ طرز نشست بدل کر بے قابو ہو جاتے ہیں اس لئے وہ خوشی سے چیخیں مارتے لگتے ہیں، اور تماشائی بھی اپنے آپ کو اس وحشت سے محفوظ پاکر قہقہے مارتے ہیں۔

بعض وقت طلبہ اساتذہ سے مذاق یا شرارت کرتے ہیں، تاکہ انھیں ان کی عام
سنجیدگی سے ہٹائیں۔ ان کے علم سے ستے ہوئے چہرے دیکھ کر خواہ مخواہ یہ
خیال ہوتا ہے کہ انہیں کسی قدر حمق میں مبتلا کرنا چاہئے۔

دیکھو ادب سے ہم جن امور کی تکمیل کی توقع رکھتے ہیں وہ تین ہیں۔

(۱) مصالحت و ہم آہنگی (1) Reconciliation (۲) انکشاف (2) Revelation (۳) ہمدردی (3) Sympathy

ہم نے ابھی ابھی یہ بتا دیا کہ طربیہ ادب کی پہلی توقع یعنی مصالحت اور ہم آہنگی کو کس طرح پورا کرتا ہے۔ آئیے اب باقی دو پر غور کریں۔

برگساں نے اپنی کتاب Le Reie میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ طربیہ میں کذب سے کام لینا پڑتا ہے اور اس میں غیر ہمدردی کا عنصر شامل ہوتا ہے لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے مثلاً ایک مصور Caricature یعنی کسی کا خاکہ اڑاتے ہوئے مبالغہ کرتا ہے اور اس شخص کے کردار کی وہ نمایاں خصوصیتیں ابھار دیتا ہے جن سے وہ آدمی پہچانا جائے۔ لیکن اس مبالغے میں کتنا لطف اور سچائی ہوتی ہے، بعض وقت مبالغے سے کام لے کر کسی انسان کی جزوی خصوصیت کو کل بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی ڈرامے میں ایک وکیل صاحب کو پیش کیا گیا تھا، جو یہ موقع پر کہتے ہیں۔ دیکھو نا، اس مقدمے نمبر ۱۰۔ غوث بی بنام سید پیر میں ایسا ہی ہوا۔ وکیل صاحب کا ہر موقع پر ان الفاظ کے ساتھ مقدمات کا ذکر کرنا ایک برائی ضرور ہے، مگر لطف سے خالی نہیں۔

طربیہ کا تیسرا طریقہ اس سے بھی زیادہ دلکش ہے۔ یعنی نہ مبالغہ کیا جاتا ہے، نہ اخذ و اقتباس سے کام لیا جاتا ہے، بلکہ اس کی حین زندگی میں ہر شے کی اصلیت دکھائی جاتی ہے۔ مثلاً توبۃ النصوح میں نذیر احمد نے مرزا ظاہر دار بیگ کو پیش کیا ہے۔ وہ اپنی ظاہر داری میں اصل انسان ہیں۔ جس طرح کم عمر بچے کو داڑھی مونچھ لگا کر جوان دکھایا جائے، لیکن اس کا بچپن نہیں جاتا،

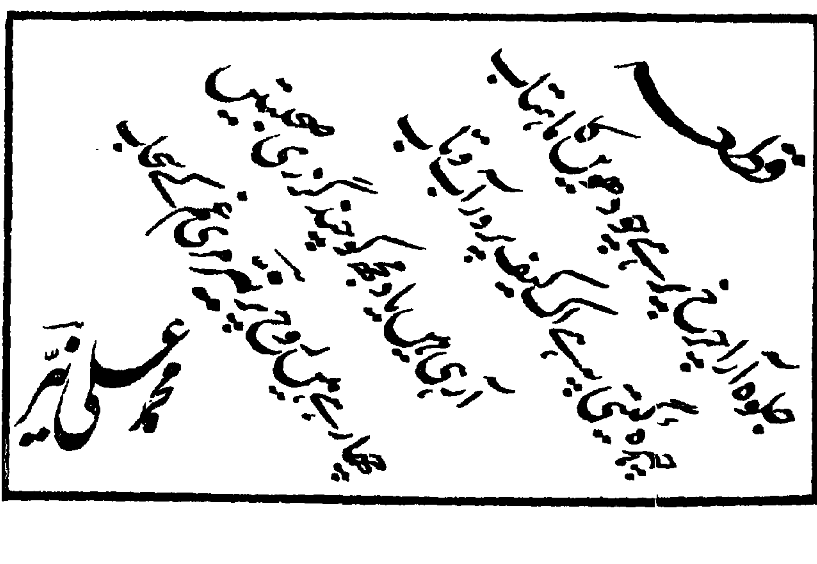
اسی طرح انسان کو زندگی کے بدلے ہوئے لباس میں دکھایا جاتا ہے' اور اس کی فطرت نمایاں کی جاتی ہے۔ ایک امیر عورت کتنی ہی زرق برق لباس میں ہو' اور سنجیدہ اور تعلیم یافتہ ہو' ادب میں اسے اس طرح دکھایا جاتا ہے کہ وہ بہر حال عورت ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم

آخری مسئلہ یہ کہ انسان کی ہنسی عموماً اس کے خیال ذوق اور فطرت کی آئینہ دار ہوتی ہے جن چیزوں پر وہ ہنستا ہے' ہم اس سے اس کے مذاق اور فطرت کا پتہ چلاتے ہیں اس طرح طربیہ میں دوہرا حسن ہوتا ہے۔ ایک ادب کا تصوری پردہ جو اس پر ڈالا جاتا ہے' دوسرے وہ حقیقت جو اس کی ہنسی میں دکھائی جاتی ہے طبا طبائی مرحوم نے اسی کے متعلق کہا تھا۔

زخم جگر کے ٹانکے ٹوٹے ہنسی ہنسی میں!

محمد عبدالقیوم خان باقی ایم اے (عثمانیہ)



مچھلیوں کی دلچسپ آوازیں

سائنس کے بہت سے دلچسپ حقائق میں سے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مچھلیوں میں آواز پیدا کرنے والے اعضاء پائے جاتے ہیں۔ ہڈی والی مچھلیوں کے بعض خاندانوں میں ایسے اعضاء خاص طور پر پائے جاتے ہیں۔ لیکن غیرارادی، غیرمعمولی یا کسی حادثہ کی وجہ سے جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں اُن میں اور خاص صوتی اعضا سے پیدا ہونے والی آوازوں میں امتیاز کرنا دشوار امر معلوم ہوتا ہے۔ بعض مچھلیاں ایسی ہیں کہ وہ خاص خاص آوازیں تو نکالتی ہیں لیکن ان کے صوتی اعضا کا اب تک ہم کو علم نہ ہوسکا۔ برخلاف اس کے بعض مچھلیاں ایسی ہیں جو ایسے اعضاء رکھتی ہیں جو صوتی اعضا کہے جاتے ہیں لیکن اُن آوازوں کے متعلق جو ان سے پیدا ہوتی ہیں ہم کچھ نہیں جانتے۔ پس ہم یہاں ایسے اعضا سے بحث کریں گے جو یا تو یقیناً صوتی اعضا ہیں یا جن کا ایسے اعضا ہونے کا امکان ہے۔ ان اہم معلومات کے لئے ہم سورنسن Sorenson اور ڈیو فوز Dufosse کی تحقیقات کے مشکور ہیں۔ خاص خاص آوازیں جن صوتی اعضا سے جن مچھلیوں کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں اُن کو ہم ذیل میں بیان کریں گے۔

کھڑکھڑاہٹ یہ ایک خاص آواز ہوتی ہے جو بہت سی ہڈی والی مچھلیوں میں پائی جاتی ہے یہ چند ہڈیوں کے خاص طور پر ترتیب پا جانے سے پیدا ہوتی ہے اور ہر مچھلی میں ایک ہی قسم کی ہڈیاں اس فعل کے لئے مختص نہیں ہوتیں

بلکہ مختلف مچھلیوں میں مختلف ہڈیاں یہ فعل انجام دیتی ہیں۔ ایسی آواز کی دلچسپ مثال ہم کو ایک ہندوستانی موچھ دار مچھلی میں ملتی ہے۔ جس کو کیالوس ٹیاکس گیا گاٹا Callomystax gagata کہتے ہیں جس میں اگلی ہڈیاں جن کو فقرے کہتے ہیں آپس میں مل کر کھوپری سے مل جاتے ہیں اور خاص طور پر ترتیب پاکر ایک صوتی اعضا بناتے ہیں۔ مچھلی کے جسم اور سر کے درمیان ایک ایسا جوڑ پایا جاتا ہے کہ جب پیٹھ کی ہڈیاں (فقرے) عمودی طور پر آگے پیچھے حرکت کرتی ہیں تو اس جوڑ کی وجہ صوتی عضو کی ہڈیوں میں رگڑ پیدا ہو کر کھڑکھڑاہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے لیکن جب جسم کو معمولی جانبی طور پر حرکت ہوتی ہے تو چونکہ صوتی عضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے آواز بھی نہیں پیدا ہوتی۔

سانس سے لئے جیسی آوازیں

ایسی آوازیں بعض ہڈی والی مچھلیوں مثلاً بام بعض روہو نما۔ اور اچھل مچھلیوں کے بہت سے انواع میں پائی جاتی ہیں۔ ڈیو فوز کے خیال کے مطابق یہ آوازیں بعض مچھلیوں میں ہوا پھکنہ کی گیس کے سانس نالی اور منہ کے ذریعہ زور سے نکلنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

ہوا پھکنہ کے ساتھ عضلات کے الحاق کی وجہ سے پیدا ہونے والی آوازیں

عام طور پر مچھلیوں کے پیٹ میں ہوا پھکنہ پایا جاتا ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ ان کو تیرنے میں مدد دے لیکن بعض ہڈی والی مچھلیوں میں ہوا پھکنہ کئی طرح آواز پیدا کرنے والے اعضاء میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بعض مچھلیوں میں اس ہوا پھکنہ کے ساتھ طاقتور اسپرنگ لگے رہتے ہیں جن کا تعلق کھوپری سے نکلے ہوئے خاص عضلات سے ہوتا ہے ایسا صوتی عضو عام طور پر موچھ دار مچھلیوں میں پایا جاتا ہے۔ جنوبی امریکہ، افریقہ اور ہندوستان کی چند مچھلیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جنوبی امریکہ کی ایک موچھ دار مچھلی اچی نپٹرس نوڈوسکس Auchenipterus nodosus اس کی ایک اچھی مثال ہے۔

بعض ہڈی والی مچھلیوں میں ہوا پھکنہ کے ساتھ اسپرنگ نہیں لگے رہتے بلکہ کھوپری سے

نکلے ہوئے عضلات راست ہواپھکنہ کی دیوار کے ساتھ ملحق ہوجاتے ہیں۔

بعض مچھلیوں میں ہواپھکنہ اپنے خاص عضلات نہیں رکھتا بلکہ اس کے کچھ حصہ کے ساتھ جسمی دیوار سے نکلے ہوئے عضلات لگے رہتے ہیں یا سینے کی ہڈیوں سے لگے ہوئے عضلات کا اس سے تعلق ہوتا ہے۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ہواپھکنہ کے ساتھ عضلات کا تعلق مختلف طریقہ پر ہوتا ہے لیکن ہر صورت میں عضلات کے پھیلنے اور سکڑنے سے پھکنہ کی دیوار اور اس کے اندر کی گیسوں میں ارتعاشات پیدا ہوکر خاص آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں عام طور پر ہوا پھکنہ کا کہفہ منقسم ہوکر پیچیدہ ساخت اختیار کرلیتا ہے جو آوازوں کو تیز کرنے میں مدد دیتا ہے اور رہا یہ سوال کہ یہ ارتعاشات پانی میں کس طرح منتقل ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق ہم یہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ ہواپھکنہ کچھ دور تک جسمی دیوار کے ساتھ تماس میں رہتا ہے۔ پھکنہ کی دیوار کے ارتعاشات جسمی دیوار کو مرتعش کرتے ہیں پس جسمی دیوار کے ارتعاشات پانی میں آواز کی موجیں پیدا کرتے ہیں جن سے ہم کو دور تک آواز سنائی دے سکتی ہے۔ ایک اور طریقہ آواز کے پیدا ہونے کا یہ ہے کہ بعض ہڈی والی مچھلیوں میں ہواپھکنہ کی اندرونی دیوار سے لگا ہوا ایک پردہ ہوتا ہے جس کے بیچ میں سوراخ ہوتا ہے اور جب یہ پردہ مرتعش ہوتا ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے ان واقعات کی روشنی میں ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہوا پھکنہ صوتی اعضا میں تبدیل ہوکر مختلف آوازوں کے پیدا ہونے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

ہواپھکنہ اور اس کے عضلات سے پیدا ہونیوالی مختلف آوازیں

مختلف مچھلیوں میں ہواپھکنہ اور اس کے عضلات کی وجہ جو مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں ان کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

دوراس میاکولیٹس مچھلی

Doras maculatus

پانی میں سے نکلی ہوئی

اور ہم سے ۱۰۰ فٹ کے فاصلہ پر ہو تو ہم کو ایک آواز سنائی دے گی جو غرانے یا بڑبڑانے سے تعبیر کی جاتی ہے۔

برقی موچھ دار مچھلی Melopterurus electricus کے لچکدار اسپرنگ سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اُس کو بلّی کی خاص آواز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سمندری گھوڑا مچھلی Hippocampus brivirostris ایک خاص آواز نکالتی ہے جس کو طنبورہ کی آواز سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہ آواز نر اور مادہ دونوں میں پیدا ہوتی ہے لیکن افزائش نسل کے زمانہ میں زیادہ تر سنائی دیتی ہے۔

کافر مچھلی Astracion trigonus جب پانی سے باہر ہو تو ایک آواز نکالتی ہے جو غصہ میں گرجنے کا تصور پیدا کرتی ہے۔

ڈھول مچھلی Pogonias Chromis جس کو انگریزی میں ڈرم Drum کہتے ہیں۔ اس کا ہوا پھکنہ اور عضلات ایک ایسا طاقتور صوتی عضو بناتے ہیں جو اب تک کسی مچھلی میں نہیں پایا گیا اس سے۔ جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کو ڈھول کے بجنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ آواز اُن مسافروں نے اکثر سنی ہے جو ممالک متحدہ امریکہ کے ساحل کے قریب لنگر انداز ہوں جہاں پر کہ یہ مچھلیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

میگری Maigre اس کی آوازیں ڈکارنے۔ خرخر کرنے۔ بھنبھنانے سے تعبیر کی جاتی ہیں۔ ہومر نامی مشہور یونانی لکھتا ہے کہ اسکی بھنبھناہٹ کی آواز میں عجیب سریلا پن ہوتا ہے

ہندوستانی گھوڑا Caranx hippos اس مچھلی کو جب پکڑا جاتا ہے تو یہ سور کے بچے کی سی آواز نکالتی ہے۔ زمین پر پڑی ہوئی حالت میں اس کو جتنی مرتبہ ہلایا جائے یہ اسی قسم کی آواز نکالتی رہے گی جہاں تک کہ یہ مر نہ جائے۔

ولایتی گرنارڈ British Gurnards سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ بھی عجب دلچسپ ہیں۔ یہ خراٹے لینے۔ گونجنے۔ غرانے۔ گنگنانے اور ٹرٹرانے سے

موسوم کی جاتی ہیں۔

ذو منفسی مچھلیاں جو ہوا اور پانی دونوں سے سانس لیتی ہیں ان میں لیپی ڈوسائرن Lepidosiron ایک ایسی مچھلی ہے جو ٹرٹرانے کے جیسی آواز نکالتی ہے اسی گروہ میں ایک دوسری مچھلی جسکو نیوسراٹوڈس Neoceratodus کہتے ہیں ایسی آواز نکالتی ہے جس کو گرجنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو رات کے وقت تھوڑے فاصلہ سے آسانی سے سنائی دیتی ہے۔

آواز پیدا کرنے والا عضو خواہ کسی ساخت کا بھی ہو اس سے مچھلیاں جو آوازیں پیدا کرتی ہیں وہ پانی میں دور تک پہنچتی ہیں۔ گویا ہوا کی بہ نسبت پانی آواز کے لئے اچھا موصل ہے۔ اوپر دی ہوئی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں سمندری اور میٹھے پانی کی بہت سی مچھلیوں میں صوتی اعضاء پائے جاتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہڈی والی مچھلیوں کے بہت سے انواع ایسے بھی ہیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں لیکن اُن میں صوتی اعضا نہیں پائے جاتے۔

آوازوں کے فوائد ان آوازوں کے فوائد بہت عیاں ہیں۔ عام طور پر مچھلیوں میں صنفی ملاپ نہیں ہوتا بلکہ انڈے مادے کے شکم سے خارج ہونے کے بعد پانی میں بارور ہوتے ہیں۔ کسی وجہ سے ایک قسم کی بہت سی مچھلیاں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ اُن میں نر اور مادہ دونوں ہوں گے۔ لہذا نروں سے جو سفید مادہ نکلتا ہے وہ مادہ سے خارج شدہ انڈوں کو بارور کرے گا اس مقصد کے لئے یہ آوازیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ خاص مچھلیاں اپنی آوازوں کو پہچان کر تولید کے زمانہ میں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں اور یہ آوازیں بہ نسبت دوسرے زمانے کے تولید کے زمانے میں ہی زیادہ تیزی کے ساتھ سنائی دیتی ہیں۔

یوں تو اس قسم کی آوازیں تمام مچھلیوں کے لئے مفید ہیں۔ لیکن اُن مچھلیوں کیلئے

خاص طور پر مفید ہیں۔ جو اپنی آنکھوں کو بہت کم استعمال کرتی ہیں۔ چنانچہ آواز پیدا کرنے والے اعضا موچھ دار مچھلیوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ مچھلیاں پانی کی تہہ پر چرتی ہیں یا گدلے پانی میں رہتی ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی خاص آوازوں سے یہ فائدہ ہوگا کہ یہ مچھلیاں اپنی آوازوں کو پہچان کر ایک جگہ جمع ہونگی اور اپنی غذا وغیرہ ایک ساتھ حاصل کرلیا کرینگی اور ان کو تنہا بھٹکنا نہیں پڑے گا۔

بعض حالات میں مچھلیوں کی آوازیں خطرے سے آگاہ کرنے والی ہوتی ہیں بہت سی آواز پیدا کرنے والی مچھلیوں میں طاقتور کانٹے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ بہت سی موچھ دار مچھلیاں ایسے کانٹے رکھتی ہیں یا ایسا ہوتا ہے کہ مچھلی کے پورے جسم پر کانٹے پائے جاتے ہیں جس کی مثال ڈایوڈان ہسٹرکس Dio-don hystrix ہے۔ ایسے اعضا نہایت موثر ہتیار ہیں جو دشمنوں پر حملہ کرنے یا اپنی حفاظت کرنے کے لئے نہایت مفید ہیں۔ یہ نہایت مہلک زخم پیدا کرتے ہیں ان مچھلیوں کے جو دشمن ہوتے ہیں وہ تجربہ سے یا جبلت سے معلوم کرلیتے ہیں کہ فلاں آواز فلاں مچھلی کی ہے جو خطرناک کانٹے رکھتی ہے اور اس طرح اس پر حملہ کرنے سے باز آتے ہیں اس میں دونوں کا فائدہ مضمر ہے۔

محمد رحمت علی ہمایوں

ایم' ایس سی (عثمانیہ)

آرٹ اور زندگی

(وامن جو گھرٹے مرہٹی کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی دو کتابیں سو شتا اور ریٹن بہت مقبول ہوئی ہیں۔ ذیل میں ان کے افسانہ کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔)

امجد یوسف زئی

کالج کی دوسری منزل، وہ لمبی چوڑی چاندنی، اُس پار دکھائی دینے والا باغیچہ اور آسمان کے مناظر، اس کے علاوہ وہ کھڑکی جہاں باغیچہ پر سے آنے والی سرد ہوا کی پہلی لہر آکر رکتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے پرنسپل صاحب نے اسی کمرہ میں معاشیات پڑھانے کا انتظام کر کے اپنی بڑی صلاحیت و ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا۔ اندر زمینی مال و دولت کا ذکر، باہر فطرت کی یہ رنگ رلیاں۔

وہ اشاڑھ کے ابتدائی دنوں میں بادلوں کی بہار۔

اری! میری چوٹی تو چھوڑ دے، کان میں آواز پڑتے ہی فوراً میرا دھیان اسی طرف پلٹا، پانچ چھ لڑکیاں باغ کی قالین جیسی ہریالی پر من مانے کھیل رہی تھیں۔ ان کے ملائم پیر اس قالین پر نقاشی کر رہے تھے۔ ذرا سیاہ سی دکھائی دینے والی پگڈنڈی۔ مگر وہ تازی، تازی، نرم، ملائم، جیون رس سے بھری ہریالی۔ اُسے چاہو تو قالین کہہ لو مگر وہ بات نہیں آتی۔

اونچے اونچے چھوٹے چھوٹے پتوں کے پیڑوں پر پیلے پیلے بھڑکیلے پھول

کھل رہے تھے۔ قریب ہی بیلوں کی جالی تھی۔ ان پر کے وہ خوبصورت بھری بھری کلیوں کے گچھے لڑکیوں کی نظر ابھی اس پر نہیں گئی تھی۔ اسی لئے تو وہ پھولے پھولے ہنستے مسکراتے دکھائی دے رہے تھے اور انہیں کی وجہ سے بیلوں کا جھرمٹ گویا جوش شباب میں غسل کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا
اب گھنٹہ ختم ہوگا گھنٹی بجے گی جھٹ پٹ سے لڑکیاں ادھر اُدھر بھاگیں گی۔ کومل کومل پتیوں سے سجے، نیلے پیلے پھول، اب وہ لڑکیاں عجلت سے اپنی چوٹیوں میں لگائیں گی جو ہندو لڑکیاں ہوتی ہیں وہ سر میں پھول لگاتی ہیں مگر ہم لوگوں میں ایسا رواج نہیں، مجھے نینا کی یاد آگئی۔ اسے تو پھول ہاتھوں میں لئے کھیلنے، چلنے کا بڑا شوق تھا۔ پڑوس کا گلاب تو جیسا اسی کا انتظار کر رہا تھا، پھول بھی کیسا کھل رہا تھا وہ کتنا خوبصورت نظر آتا تھا۔ ہوا ذرا سرسرائی کہ ایک دم ناچنے لگتا گویا کہ وہ اُسے اپنے ہی ساتھ لے جائیگی۔
سارا باغ گویا گیلا ہو رہا تھا۔ آخر بارش کا موسم ہی ٹھہرا کتنا خوبصورت تھا آج کا دن؟
ایک دن آسمان گھٹاؤں سے بھر آیا، کالے کالے بادل، گویا کہ سارا آسمان انہوں نے نگل لیا۔ ہوا زور سے بہہ رہی تھی بادل جھومتے ہوئے اُٹھ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے چمٹ کر گویا ایک روپ ہو رہے تھے۔ مگر یہ سب تھوڑی ہی دیر کے لیے تھا۔ اب موتی جھرنے لگے۔ وہ دھارا.... گویا موتی ہی کی لڑیاں ہوں۔
سارے باغ نے اس پانی سے غسل کیا۔ سارا دیس، چاروں طرف پانی کے فواروں سے گویا دودھیا بن گیا۔
کتنا دلکش منظر تھا وہ، سب کی سب لڑکیاں بھاگ گئی تھیں۔ میرا دھیان کبھی کا غائب ہوگیا تھا، میں اس کھڑکی میں سے اشتیاق سے وہ سب دیکھ رہا تھا۔
آرٹ نے کہا، دیکھ اور دیکھ لے اور دیکھتا ہی رہ۔
بارش مجھے ہمیشہ ہی بھاتی ہے اس میں چاہے مدھرتا نہیں ہے یہ کہہ لو مگر شوخی ضرور ہے بالکل لبالب اور چھلک بھی رہی ہو کتنی سہانی ہوتی ہے برسات!
تب ہی میں نے سوچا کہ کیوں یہ پہاڑ اونچے ہی اونچے چلے جا رہے ہیں، یہ ایک،

دوسرا اس سے بھی اونچا، تیسرا اور بھی ان کی اونچی اونچی چوٹیاں کالے کالے بادلوں سے جیسے جا کر ملیں کچھ تو ان سے بھی اوپر گئی ہیں شاید وہ بھی سوچ رہی ہوں اوپر آخر ہے کیا؟ کون سی شے ہے؟ کہیں حسن تو نہیں ہے؟ یا حقیقت تو نہیں؟ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی مہرشی کی ریاضت پوری ہو رہی ہو، انہیں نہ جانے کیسی مسرت ہو رہی تھی وہ کھل اٹھے تھے۔ ہری فطرت۔ اُس نے اپنے آنچل کے نیچے پہاڑ پر کے پتھر، کنکر، گڑھے، گھاٹیاں سب چھپا رکھی تھیں اور سب کا ایک ہی سبز رنگ۔

میں اکیلا ہی چلا جا رہا تھا دونوں طرف آگے پیچھے اور اس میں سے راہ نکالنے والا میں۔ یہ فکر گویا میرے دل کی گہرائیوں میں جا گزیں ہوئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے جھرنے کیسے کھل کھلا رہے تھے۔ کیسے بھاگ رہے تھے کوئی بڑا سا پتھر درمیان میں آتے ہی وہ اس کے آس پاس چکر کاٹتے اور آگے کھل کھلاتے ہوئے نکل جاتے۔ گویا آگے کسی کو پکڑنا ہو سب اپنی ہی فکر میں، کسی کو کسی کا خیال ہی نہیں۔

چاروں طرف کوئی نہیں تھا۔ نہ آدمی نہ گھر کا آسرا، بیچ میں پنچھی بول اٹھا۔ وہی صرف آواز اور بیچ میں گرج پھر وہی کڑک، گویا دیوتاؤں کے گھر کی دُند بھی بجی۔ ابھی ہیرے منکوں کی لوٹ، ابھی سراٹے کی ہوا پھر چاروں طرف پانی ہی پانی۔ گرج، کڑک سب جل تھل ایک ہو گیا آس پاس کوئی بھی نہیں۔

زندگی بول اٹھی دیکھتے کیا ہو؟ بھاگ کھڑے ہو جاؤ اور کہیں کسی آسرے سے کھڑے رہو۔

مجھے اس وقت کچھ نہ سوجھ پڑا۔

(ازامیل کی ڈائری سے)

امجد علیخاں یوسف زئی

متعلم ال ال۔ بی (ابتدائی)

نطشے کا فوق الانسان

نطشے انیسویں صدی کا مشہور جرمن فلسفی ہے جو قصبہ روکن میں ۱۵ر اکتوبر (۱۸۴۴ء) کے دن پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت عیسائیت اور کلیسائیت کے ماحول میں ہوئی۔ لڑکپن میں اسے موسیقی سے بہت دلچسپی تھی اور وہ واگنر کا بہت قائل تھا لیکن موسیقی کے ساتھ ساتھ اس کا میلان علوم کی جانب بھی ہوتا گیا اور یونانی اور لاطینی زبانیں سیکھنے لگا۔ جب لیپزگ پہنچا تو شوپنہار کی تصانیف کے مطالعہ کی وجہ سے مذہبیت اور عیسائیت سے بہت دور ہو گیا۔ واگنر کی صحبت نے اسے شوپنہار کا بہت زیادہ معتقد بنا دیا کیونکہ واگنر خود شوپنہار کا بہت مداح تھا۔ پچیس سال ہی کی عمر میں نطشے بازل یونیورسٹی میں پروفیسر لسانیات منتخب ہوا۔ سات سال تک اس عہدہ پر وہیں رہا پھر علالت کی وجہ سے رخصت لی اور پنشن بھی۔ اس کے بعد کا وقت زیادہ تر اس نے اطالیہ میں بسر کیا اور روز بروز تنہائی پسند اور عزلت گزیں ہوتا گیا۔ ۱۸۸۸ء میں اس میں جنون کے آثار پائے گئے۔ اسی حالت میں بارہ سال زندہ رہ کر ۱۹۰۰ء میں مرض فالج سے انتقال کیا۔

نطشے نے کوئی نیا نظام فلسفہ دنیا کے آگے پیش نہیں کیا ہے۔ اسے فلسفی صرف اس کے نظریۂ حیات کی وجہ سے کہا جاتا ہے جس میں اس نے ہمارے طرز فکر میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اسکی شاعرانہ طبیعت اور طرز بیان منطقی معیاروں اور طریقوں پر غالب ہیں اسلئے اس کے نظریہ میں کچھ زیادہ معقولیت نہیں۔ اس نے اپنے تمام افکار میں گزشتہ تاریخ انسانی

سے بالکل منھ موڑ لیا ہے۔ نطشے کا خیال ہے کہ زندگی خود ہی اپنا منبع و مبداء ہے اور پھر انفرادی زندگی خود اپنا لازوال اور سدا رواں چشمۂ فیض ہے۔ جو لوگ در اصل زندہ ہیں وہ خود ہی اپنا حال اور مستقبل پیدا کرتے ہیں اور ہر ضرورت زندگی سے دوچار ہو کر اس پر غالب آتے ہیں ؎

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔

اپنی ذات سے علیحدہ کسی اقتدار کو تسلیم کرنے سے بسا اوقات انسان کو اپنی فطرت کے مغائر اور اپنے مفاد کے خلاف کام کرنے پڑتے ہیں۔ ہر شخص اپنی جگہ منفرد دیکھتا ہے اور اسے اپنی زندگی غلامانہ تقلید اور کورانہ متابعت سے تباہ نہیں کر لینی چاہیئے کیونکہ

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
منزل بھی ڈھونڈھ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

نطشے کا ذہنی ارتقا مختلف منزلوں میں ہوا ہے اس لئے اس کے قطعی خیالات آخری دو ہی میں ملتے ہیں۔ وہ ابتداءً تو شوپنہار کا معتقد تھا لیکن بعد میں زندگی کا ایک مثبت نظریہ اس نے پیش کیا۔ شوپنہار کا کائناتی عزم نطشے کے ہاں محض انفرادی عزم بن گیا جو جبلی میلان کے مماثل تھا۔ زندگی کی ایک عظیم حقیقت جبلی عزم ہے اور چونکہ زندگی اوّل تا آخر جبلی ہے اس لئے لازماً خیر ہے کیونکہ ہر خیر جبلی ہے۔ یہ ہے نطشے کا استدلال۔

شوپنہار کی ہم آہنگی میں نطشے نے دنیا اور اس کے نظام عمل کو ابتر اور بے معنی تو کہہ دیا لیکن برخلاف شوپنہار وہ اس کا درمان رہبانیت نہیں سمجھتا بلکہ اس خیال میں دُنیا کی یہ افراتفری دعوت تنظیم دیتی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ دنیا کو عزم اور معنی عطا کریں۔ شوپنہار نے زندگی کو رنج و آلام کا مجموعہ اور اس لئے شر قرار دیا لیکن نطشے یہ کہہ اٹھا کہ زندگی میں حقیقی صداقت اور حقیقی نیکی "مسرت" نہیں بلکہ "قوت" ہے۔ کمزور اور بزدل ہی شکوہ کیا کرتے ہیں۔ قوی کبھی نالاں نہیں ہوتا۔

بخود نگر گلہ ہائے جہاں چہ می گوئی
اگر نگاہ تو دیگر شود جہاں دگر است

تحفظِ ذات اور ترقی کی جبلت ہر نامی (Organic) ہستی کی بنیادی جبلت ہے۔ زندگی خود "عزم للقوۃ" ہے۔ "عزم للبقا" نہیں۔ انسان محفوظ و مامون ہونے کے لئے نہیں بلکہ مصائبِ زندگی پر غالب آنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے نطشے کے مسلک کو دو جملوں میں یوں بیان کر سکتے ہیں۔

"خیر کیا ہے؟ ہر وہ چیز جو احساس قوت، عزم للقوۃ اور خود قوت میں اضافہ کرے اور برا کیا ہے؟ وہ سب جو کمزوری کا باعث اور کمزوری کی پیداوار ہو"۔

یہیں سے ہمیں نطشے کے فوق الانسان کے اوصاف سے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ نطشے نے دورِ رواں کے نظامِ اخلاق پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ یہ انسانی فطرت سے میل نہیں کھاتا اور اس نے خود ایک نظامِ اخلاق پیش کیا جس میں قوی، توانا اور مضبوط و لائق افراد کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار اور اس سے فائدہ اٹھانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ کشمکشِ حیات میں بقا حاصل کرنا اور رکاوٹوں پر غالب آنا ہی انسان کا واحد حق ہے اور یہ حق صرف اسی کو ملتا ہے جو قوی ہے اور جو اس کے لئے کوشش کرتا ہے۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ کمزوروں کو کشمکش وجود میں ختم ہی ہو جانا چاہیئے کیونکہ ان میں بقا کی صلاحیت ہے ہی نہیں۔ انسانی زندگی کی مہم بہادر دل اور سورماؤں کی طلبگار ہے۔ بزدلوں اور کمزوروں کے ہاتھوں کبھی انسانی زندگی بلند نہیں ہو سکتی۔ "نظام ہائے اخلاق کی کشمکش زندگی کی بنیادی جبلتوں کے ساتھ سطح زمین پر سب سے بڑا منافی اخلاق کارنامہ ہے"۔ نطشے موجودہ نظامِ اخلاق کا اس وجہ سے دشمن ہے کہ یہ "فوق الانسان" کے وجود کی تکوین میں رکاوٹ کا باعث ہے۔ رحم و ہمدردی کا وہ بہت مخالف ہے کیونکہ اس سے لوگوں میں کمزوری اور بزدلی کا اضافہ ہوتا ہے اور اس لئے بھی کہ وہ کمزوروں کو جو طالب رحم ہوتے ہیں فنا ہی کر دینا چاہتا ہے۔

ارتقائین کے مسلک کی رو سے دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں مایل بہ ارتقاء ہیں لیکن کیا انسان ارتقاء کی آخری منزل ہے؟ نہیں۔ نطشے لکھتا ہے:-

"اب تک بنی نوع انسان کا نصب العین کوئی نہ تھا، ایک خود ساختہ نصب العین تمدن و تہذیب کی ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ہماری تمام تمدنی کوششوں کا مقصود 'فوق الانسان' ہے اس لئے ہر اس مجوزہ قوانین اخلاق و سیاسیات کو فنا کر دینا چاہیئے جو "فوق الانسان" کے وجود میں مزاحم ہو۔"

ایک اور مقام پر وہ لکھتا ہے:۔

"میں تمھیں فوق الانسان کی تعلیم دیتا ہوں۔ انسان ایک ایسی چیز ہے جس کو آگے بڑھنا چاہیئے بتاؤ تو سہی تم نے آگے بڑھنے کے لئے کیا کیا ہے؟ انسان کے لئے بندر کیا حیثیت رکھتا ہے؟ ایک تمسخر یا تکلیف دہ شرمندگی اور یہی حیثیت فوق الانسان کے لئے انسان کی ہے۔ فوق الانسان زمین کا نصب العین اور مفہوم ہے تمھارے عزم کو کہنا چاہیئے کہ فوق الانسان زمین کا نصب العین ہو۔"

نطشے کا مقصد یہ ہے کہ قوم کو ترقی دے کر ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جس کی دماغی اور روحانی قوت اس درجہ ترقی یافتہ ہو کہ اس کا وجود ہی ہمارے زمانہ کی مایوسانہ اور غلامانہ ذہنیت کو ختم کر دے۔ وہ ایسا طبقہ ہو جس کا مقصد حیات عیش و آرام نہ ہو اور جس کا مطمح نظر صرف پڑھا لکھا آدمی نہ ہو بلکہ ایک ٹھوس صاحب عمل و عزم ہو الغرض یہ کہ ایک برتر طبقہ پیدا کیا جائے۔

اس کا بہترین نمونہ نطشے کی مشہور تصنیف "بقول زردشت" میں پایا جاتا ہے۔

"میں اس انسان کی تعلیم دیتا ہوں جس کی روح تونگر، جس کا دماغ عمیق ترین، جس کی ہمت بلند بالاترین ہے۔ وہی شخص نذہبی ہے جو چیزوں کے باہمی تعلقات کو پہچانے۔"

ایک جگہ وہ لکھتا ہے:۔

"موجودہ نسل انسانی سے ایک زبردست دل و دماغ والی حکومت پسند قوم پیدا ہونے والی ہے جو یورپ کے عوام پر حکومت کرے گی۔ اس قوم سے ایک خالص یورپین جماعت وجود میں آئے گی جو برتر انسانوں پر مشتمل ہوگی۔ اس جماعت سے ایک اور اعلے تر طبقہ پیدا ہوگا جو فوق الانسان کے نام سے موسوم ہوگا۔"

اگرچہ فوق الانسان کا خیال بظاہر نہایت دلکش اور خوش آئند ہے لیکن اس کی کما حقہٗ توضیح نہ ہوسکی پہلے تو نطشے فوق الانسان سے اعلیٰ شخصیت مراد لیتا رہا لیکن جب علم حیاتیات کے مطالعہ کا اسے موقع ملا تو وہ اس سے "اعلیٰ صنف" مراد لینے لگا گو فوق الانسان کا تصور جیسا کہ نطشے نے اسے ہمارے آگے پیش کیا ہے مبہم اور غیر متعین ہے تاہم حوصلہ افزا اور محرک عمل ضرور ہے۔ یہ فوق الانسان محض ایک رمز و استعارہ ہے جسے مختلف استعداد کے لوگ مختلف معنے دے سکتے ہیں۔

انسانی کوششوں کا مقصود سب کو مرتفع کرنا نہیں بلکہ عمدہ تر اور قوی تر آدمیوں کا ارتفاع ہونا چاہیئے۔ ایک صاحب فہم جس چیز کی کوشش کرے گا وہ نوع انسانی کا ارتقاء ہے لیکن نوع انسانی ترقی نہیں کرسکتی اس کا وجود ہی نہیں۔

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنے نہ ہوا

یہ محض ایک تجرید (Abstraction) ہے جو کچھ موجود ہے اسے افراد کا صرف ایک (Ant-hill) کہا جاسکتا ہے نوع انسان نہیں کیونکہ

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

"ہمارا مقصود انسان نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یعنی فوق الانسان ہونا چاہیئے"۔ کسی ارفع سوسائٹی کا وجود میں نہ آنا اس سے بدتر ہے کہ تمام سوسائٹیاں ختم ہوجائیں۔ سوسائٹی ایک ذریعہ ہے فرد کی شخصیت اور قوت میں اضافہ کرنے کا لیکن یہ گروہ بندی، یہ معاشرہ ہی کچھ مقصود نہیں۔ اگر سب لوگ ایک مشین بنانے کے لیے مطلوب ہیں تو پھر مشین کا کیا مقصود ہے؟ نطشے کہتا ہے کہ یہ مقصود فوق الانسان ہونا چاہیئے۔

نطشے کے نزدیک اخلاق دو طرح کے ہیں، آقایانہ اور غلامانہ۔ صداقت کی تلاش، جرات و ہمت، زندگی کو لذت و الم اور سود و زیاں کے پیمانے سے نہ ناپنا ہر قسم کا اثبات اور حیات افزا فعلیت آقایانہ اخلاق کے مظہر ہیں جنہیں فوق الانسان بہ درجہ اتم اپنے آپ میں پیدا کرے گا اور ہر قسم کی بزدلی، رسوم و قیود سے باہر آنے کی کوشش نہ کرنا، عجز، قناعت، توکل، خیرات،

علم، غرض کہ ہر قسم کی انفعالی صورتیں غلامانہ اخلاق میں داخل ہیں جن کا شائبہ تک بھی فوق الانسان میں نہیں پایا جائے گا

نطشے کسی اصلی اور ابدی خیر و شر کی مطلق تفریق اور تقسیم کا قائل نہیں وہ پیکار حیات اور ارتقا کا ماننے والا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اکثر قدروں (Values) کو برائے نام تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ان کے مطابق عمل نہیں کیا جاتا۔ یعنی یہ کہ درحقیقت ان کو مانا ہی نہیں جاتا۔ مختصر یہ کہ جن قدروں پر ہم اعتقاد رکھتے ہیں ان کو ابدی کہنے میں خواہ کتنی ہی سرگرمی کا اظہار کیوں نہ کریں ان کو حقیقت کی گردش سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے لیکن قدروں کا بدل دینا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لئے گویا فوق الانسان کی اخلاقیت کو صرف ایک دشمن سے نہیں بلکہ دشمنوں کے جم غفیر سے مقابلہ کرنا ہے جن میں سے ہر ایک اشخاص کے مختلف اصناف کو مرغوب ہے۔ نطشے کا مقصد یہ ہے کہ جو اخلاقیات عیسوی مذہب اور تمدن نے صدہا سال سے قائم کر رکھی ہیں وہ انسان کو بجائے بلندی کے پستی کی طرف لے جاتی ہیں اور بجائے آقایانہ ذہنیت قائم کرنے کے غلامانہ ذہنیت پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے ان قدروں پر جو اخلاقیات کی جدول پر نظر آتی ہیں نظر ثانی کر کے انہیں بدل دینے کی ضرورت ہے۔ ان تبدلات کے بعد جس منزل پر انسان پہنچے گا وہی نطشے کا فوق الانسان ہے۔

وہ کہتا ہے کہ آجکل شادی کے معنے یہ ہیں کہ سوسائٹی دو افراد کو عیش کرنے اور خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی اجازت دے دیتی ہے اور بس۔ لیکن اس کی ضد یہ ہے کہ جب تک انسان کو اپنی تندرستی اور شرافت پر یقین نہ ہو ہرگز شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ اس کے نزدیک شرافت کے علاماتِ خصوصی یہ ہیں :- اپنے فرائض کو عوام الناس کے فرائض کے برابر نہ کرنا، اپنی ذمہ داریوں کو ہلکا کرنے یا ان میں کمی کرنے پر ہرگز راضی نہ ہونا، اپنے اختیاراتِ خصوصی کو برقرار رکھنا اور ان سے پورا پورا کام لینا۔

نطشے کا خیال ہے کہ یہ ایک بیہودہ بات ہے کہ برتر افراد "محبت" کی بنا پر شادی کریں ——— سورما انسان معمولی لڑکیوں کے ساتھ اور طباع وذکی (Genius) درزنوں کی لڑکیوں کے

کے ساتھ!! بہترین ہستیوں کو بہترین ہی کے ساتھ شادی کرنی چاہیئے اور "محبت" کو معمولی لوگوں کیلئے چھوڑ دینا چاہیئے۔ کیونکہ شادی کا مقصد صرف بقائے نسل ہی نہیں ــــ یہ تو حیوانات کا ہے ــــ بلکہ ترقی بھی ہے۔ اپنی مشہور کتاب "بقول زردشت" میں نطشے ایک جگہ زردشت کی زبانی کہلواتا ہے:-

"بھائی میرے! میں تجھ سے صرف ایک سوال کرتا ہوں اور اس سوال کو میں تیری روح میں لنگر کی طرح ڈالتا ہوں تاکہ مجھے اس کی گہرائی معلوم ہو جائے۔ تو جوان ہے اور تجھے شادی اور بچے کی خواہش ہے مگر میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ کیا تجھ ایسوں کو بچے اور شادی کا حق حاصل ہے؟ کیا تو اپنا فاتح اور اپنے آپ کو قابو میں رکھنے والا اور اپنی حسیات کا مالک اور اپنی خوبیوں کا آقا ہے؟ یا تیری خواہش میں حیوانیت اور ضرورت پنہاں ہے؟ یا تنہائی؟ یا اپنے آپ سے ناراضگی؟ میں چاہتا ہوں کہ تیری فتح مندی اور آزادی کو اولاد کی تمنا ہو تجھے چاہیئے کہ تو اپنی فتح اور حریت کے زندہ مینار تعمیر کرے تجھے اپنے آپ سے بڑھ کر تعمیر کرنی چاہیئے مگر پہلے خود تیری اپنی تعمیر ہونی چاہیئے اور تیرا جسم اور روح قائم الزاویہ ہونا چاہیئے۔ تجھے ایک بلند پایہ جسم خلق کرنا چاہیئے۔ ایسا شخص جو خود خالق ہو۔ شادی! ــــ میرے نزدیک یہ نام ہے دو شخصیتوں کے اس عزم کا کہ وہ ایک ایسے شخص کو پیدا کریں گے جو والدین سے بڑھ چڑھ کر ہو"

نطشے نے رشتہ مناکحت کے بارے میں چند عمدہ تجویزیں پیش کی ہیں کیونکہ اگر شادیاں اسی طرح ہوتی رہیں جس طرح آجکل ہو رہی ہیں تو آئندہ فوق الانسان کے وجود میں بہت تاخیر کا اندیشہ ہے۔ نطشے کہتا ہے کہ شادی سے پہلے لوگوں کو عرصہ تک فوجی خدمت انجام دینی چاہیئے اور شادی سے پہلے مرد اور عورت کا طبی معائنہ سخت ضروری ہے۔ کمزوروں، اپاہجوں اور مریضوں کو اولاد پیدا کرنے کا موقع ہرگز نہیں دینا چاہیئے۔ دنیائے انسانی میں تندرست اور مریض دونوں برابر نہیں ہو سکتے مریضوں اور ناکاروں کا خاتمہ جس طرح ممکن ہو جلد کر دینا چاہیئے ورنہ آخر میں سب کو تباہ و برباد ہونا پڑے گا۔ مریضوں کو تندرستوں کے برابر حقوق بخشنا اور کمزوروں پر رحم کرنا انتہائی نقصان دہ ہے۔ بغیر اچھی پیدائش کے شرافت ناممکن ہے۔ "ذہن و دماغ ہی آبفاع نہیں بخشتے بلکہ ذہن و

دماغ کی جلا کیلئے بھی کسی چیز کی ضرورت ہے۔ وہ کیا ہے؟ خون...... اچھی پیدائش اور تربیت کے بعد فوق الانسان کے لئے ایک سخت درس گاہ ہے جہاں اس کی کاملیت میں ترقی دی جائے گی جہاں ذمہ داریاں زیادہ ہوں گی اور آرام کم، جہاں جسم کو بغیر آہ و بکا کے مصائب برداشت کرنا سکھایا جائیگا اور عزم کو اطاعت کرنا اور حکومت کرنا سکھایا جائے گا۔ کسی قسم کی نازبرداری اور آزادی انسان کی طبعی اور اخلاقی حالت پر اثر انداز نہ ہوگی۔ اس کے باوجود وہ ایسی درس گاہ ہوگی جہاں دل کھول کر ہنسنا سکھلایا جائے گا۔ فوق الانسان حسن پرست بھی ہوگا " ناچ کو مت بند کرو اے پیاری لڑکیو! میں جو تمھارے پاس آیا ہوں کھیل بگاڑنے والا بن کر نہیں آیا جو تیوری چڑھائے رہتا ہے اور نہ لڑکیوں سے نفرت کرنے والا بن کر آیا ہوں یہ کیونکر ہو سکتا ہے اے سبک رفتارو میں خدائی رقص سے نفرت کروں یا لڑکیوں کے خوبصورت ٹخنے والے پانوؤں سے " فوق الانسان بھی خوبصورت ٹخنے والے پانوؤں سے دلچسپی رکھے گا۔

قوت، فہم و فراست اور خودی ـــــــ ان سے فوق الانسان بنتا ہے لیکن ان کا باہمی امتزاج عمدہ اور خوش گوار ہونا چاہیے۔ فوق الانسان شریف النفس، جفاکش، مستقل مزاج، صبر و عزم کا حامل، ضبط نفس رکھنے والا، خود دار اور ہر قسم کے خطرہ کے لئے سینہ سپر ہوگا۔ " میں چاہتا ہوں کہ تم ایسے ہو جاؤ کہ تمھاری آنکھیں ہمیشہ ایک نہ ایک دشمن کی تلاش میں رہیں۔ تمھیں چاہیے کہ اپنے دشمن کو ڈھونڈو اور اپنی لڑائی آپ لڑو اور وہ بھی اپنے خیالات کی حمایت میں۔ تمھیں صلح سے اس لئے محبت ہونی چاہیے کہ وہ نئی جنگوں کا ذریعہ بنے " فوق الانسان ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے والا، حکمرانی کی اچھی صلاحیت رکھنے والا اور بوقت ضرورت اطاعت کے لئے بھی تیار ہوگا کیونکہ جو فرمانبرداری نہیں کر سکتا وہ فرمانروائی بھی نہیں کر سکتا۔ وہ نیک سے کہیں زیادہ بے باک، بے خوف اور بہادر ہوگا اور حق تو یہ ہے کہ اخلاق رحم و عطا پر نہیں بلکہ قوت پر مبنی ہے " تم پوچھتے ہو اچھا کیا ہے؟ بہادر ہونا اچھا ہے۔ بچوں کو کہنے دو کہ اچھی وہ بات ہے جو بیک وقت پیاری اور دلکش ہو "۔ " وہ سب اچھا ہے جو انسان میں قوت کا احساس، عزم للقوۃ اور خود قوت کو زیادہ کرے " فوق الانسان کا نمایاں وصف خطر اپسندی ہوگا۔ وہ کہے گا

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

فوق الانسان ہرگز مصائب و شدائد اور خوف و خطر سے بچاؤ نہیں چاہے گا بلکہ ہمیشہ ان سے مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر رہے گا۔

"زردشت کو ان سے محبت ہے جو بڑی بڑی سیاحتیں کرتے ہیں اور بغیر خطرہ کے رہنا پسند نہیں کرتے۔

پس سب جنگیں نیکی ہیں۔ ہر کشمکش خیر ہے "نیک جنگ وہ چیز ہے کہ ہر مقصد کو مبارک بنا دیتی ہے"۔ انقلاب بھی ایک نیکی ہے کیونکہ اس ہلچل میں نپولین جیسا روشن ستارہ فرانس میں نمودار ہوا تھا۔ مرد کی تعلیم جنگ ہونی چاہیے اور عورت کی جنگ آوروں کی تفریح طبع، باقی سب چیزیں حماقت ہیں"۔

فوق الانسان بدی کا بدلا کبھی نیکی سے نہیں دیگا بلکہ السن بالسن العین بالعین کے مطابق بدی ہی سے دیگا۔ وہ عمل اور ردعمل کا قایل ہوگا۔ جو بو کر گیہوں کے پیدا ہونے کی امید حماقت نہیں تو اور کیا ہے بدی کا بدلہ نیکی! کتنا غلط اصول!!

"اگر کوئی تمھارا دشمن ہو تو اس کی بدی کا بدلہ تمھیں نیکی سے نہ دینا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے اسے شرمندگی ہوگی۔ کسی کو شرمندہ کرنے سے تو یہ بہتر ہے کہ تم اس پر ناراض ہو لو"۔

اپنے نفس پر قابو رکھنا۔ یہ بہت بڑی چیز ہے، جو اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا دوسروں کو بھی قابو میں نہیں لا سکتا۔ ایک ایسا مقصد پیش نظر رکھنا جس کے حصول کے لئے اوروں پر سختی کرنا پڑے لیکن اپنے نفس پر سب سے زیادہ اور جس کے لئے ایک شخص ہر کام کرنے کیلئے تیار رہو — یہی شرافت کا بنیادی عنصر ہے اور فوق الانسان کے لئے آخری ضابطہ۔

ہمیں بڑا بننا چاہیے یا کم سے کم بڑوں کا آلۂ کار لیکن بہتر یہ ہے کہ ہم خود بڑے بنیں۔ ہمیں انسانیت سے گزر کر فوق الانسانیت کے حدود میں داخل ہونے کی سعی کرنی چاہیے کیونکہ انسان ایک ایسی چیز ہے جس سے گزرنا چاہیے" ایسوں ہی کو دیکھ کر زردشت پکار اٹھے گا۔

"اے گزر جانے والو! ایک روز تم ایک قوم بن کر رہوگے۔ تم میں سے تمھاری ہی منتخبہ

ایک قوم بنے گی اور اس سے فوق الانسان پیدا ہوگا" گویا فوق الانسان سے نطشے وہ آدرشی (Ideal) اعلیٰ اصنف اور اعلیٰ شخصیت مراد لیتا ہے جو اس وقت متحقق ہوتی ہے جب انسان خود اپنے ارتقا کی جانب سائنٹفک اور باقاعدہ توجہ کرتا ہے۔

نطشے کے فوق الانسان کے تصور سے اگر ہم اس کی اعلیٰ اصنف کے خیال کو دور کردیں اور اس کی صفات اور خصوصیات میں سے ایک یا دو انتہا پسندانہ صفتوں کو جدا کر دیں تو یقیناً یہ ایک ایسا آئیڈیل بن جائے گا جس تک پہنچنے کی کوشش ہر شخص کو کرنی چاہیئے۔

محمد شمس الدین صدیقی

متعلم بی اے (ابتدائی)

رُباعی

گُم کردہ رہی سے اپنی تھک جاتا ہوں
جادہ سے گھڑی گھڑی بھٹک جاتا ہوں
مقصودِ حیات کو سمجھتا ہوں سراب
سایہ سے بھی اپنے میں کھٹک جاتا ہوں

ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ

ایم' بی' بی' ایس (عثمانیہ)

سیلیلوز اور اس کی صنعتیں

ہر جاندار کے جسم میں متعدد چھوٹے چھوٹے خانے ہوتے ہیں جنہیں ہم خلیے کہتے ہیں خلیہ کی شکل عموماً گردی ہوتی ہے۔ ان خلیوں میں ایک چپچپا مادہ ہوتا ہے جسے تخز مایہ (Protoplasm) کہتے ہیں۔ زندگی کا انحصار اسی مادہ پر ہے۔ خلیہ کا وہ حصہ جو پورے خلیہ کو گھیرا رہتا ہے اور دیوار کا کام انجام دیتا ہے اسے خلوی دیوار کہتے ہیں۔ حیوان میں یہ بہت باریک اور نہیں ہوتی ہے اور پودوں میں دبیز۔ پودوں کی خلوی دیوار جس شئے سے بنی ہوتی ہے اسے سیلیلوز (Cellulose) کہتے ہیں سیلیلوز ایک لاطینی لفظ سلولا (Cellula) سے مشتق ہے جس کے معنے چھوٹے خلیے کے ہیں۔ سیلیلوز سفید غیر شفاف شئے ہے۔ جب اس کا خوردبین میں مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ ایک جالدار شئے نظر آتی ہے۔ یہ ایک کاربوہائیڈریٹ (Corbo Hydrate) ہے یعنی اس میں کاربن ہائیڈروجن اور اکسیجن موجود ہوتے ہیں۔ یہ نہ تو گرم پانی میں حل ہوتا ہے اور نہ سرد میں۔ ایوڈین کے محلول اور ہلکا یا سلفیورک ترشہ سے یہ پھول کر نیلا ہو جاتا ہے۔ جب اس میں پانی ملا کر گرم کیا جاتا ہے تو انگوری شکر یا (Dextrose) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب سیلیلوز کو کاوی سوڈا اور کاربن ڈائی سلفائیڈ سے تعامل کا موقع دیتے ہیں تو بھورے رنگ کا فالودہ نما محلول پیدا ہوتا ہے جسے وسکوس کہتے ہیں جس سے مصنوعی ریشم تیار کرتے ہیں اور پن روک یعنے (Water proofing) کے کام میں لاتے ہیں۔ مرتکز نائٹرک ترشہ سیلیلوز پر عمل کر کے نائٹروسیلیلوز بناتا ہے۔ نائٹروسیلیلوز کی

ایک شکل دھماکو روئی یا (Gun-cotton) ہے جسے پائر اکسلین بھی کہتے ہیں اس سے بارود اور کارتوس بنائے جاتے ہیں۔ نائٹرو سلیلوز کی ایک قسم الکوہل اور ایتھر میں حل ہو جاتی ہے اور ایک گاڑھا محلول حاصل ہوتا ہے جسے کلوڈین (Collodion) کہتے ہیں۔ جب کلوڈین کے محلول کی تبخیر کی جاتی ہے تو ایک شفاف جھلی باقی رہ جاتی ہے جو جراحی میں زخموں کو ڈھانپنے کے کام آتی ہے۔ نائٹرو سلیلوز کے ساتھ کافور ملانے سے سلولائیڈ (Celluloid) حاصل ہوتا ہے جسے زائی لونائیٹ (Xylonite) بھی کہتے ہیں۔

سلیلوز سے مختلف کام لئے جاتے ہیں۔ کاغذ سازی اور ریشم بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔ اب ہم ان کا ذرا تفصیل سے ذکر کریں گے۔

(۱) جب کاغذ کو مرتکز سلفیورک ترشہ میں ڈبوتے ہیں تو کاغذ کی سطح جیلاٹینی ہو جاتی ہے۔ کاغذ کو ترشہ سے نکال کر دھو لیتے ہیں اور پھر خشک کر لیتے ہیں تو کاغذ دبیز، سخت اور نیم شفاف ہو جاتا ہے۔ ایسے کاغذ کو چرمی کاغذ بھی کہتے ہیں۔

(۲) جب روئی یا کیمیائی لکڑی کے گودے پر مرتکز نائٹرک ترشہ کے محلول کا عمل ہوتا ہے جس میں تھوڑی سی مقدار سلفیورک ترشہ کی بھی ہوتی ہے تو تعامل کے بعد روئی کو محلول سے نکال کر دھو لیتے ہیں اور پھر خشک کر لیتے ہیں تو ایک زبردست دھماکو شئے حاصل ہوتی ہے جسے دھماکو روئی کہتے ہیں۔ یہ بڑی تیزی کے ساتھ جلتی ہے اور گرم دخان خارج کرتی ہے۔ جلنے کی رفتار کو کم کرنے کے لئے دھماکو روئی کو ایتھر اور الکوہل کے آمیزہ میں یا ایسی ٹیٹ میں حل کرتے ہیں جو مادہ اس آمیزہ میں حل ہو جاتا ہے اسے حسب رفتار سے چاہیں جلا سکتے ہیں اسے بے دخانی سفوف کہتے ہیں۔ دھماکو روئی کو نائٹرو گلیسرین کے ساتھ ملانے سے ایک دھماکو شئے جسے بے دخان بارود یا (Cordite) کہتے ہیں حاصل ہوتی ہے۔ اسے سب سے پہلے سویڈن کے مشہور کیمیا داں الفرڈ نوبل نے ۱۸۸۸ء میں تیار کیا۔ اس دھماکو شئے کی دریافت کی وجہ سے اسے متعدد انعام ملے اور اس کا نام ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔

(۳) بعض مستثنیات کے سوا سلیلوز تمام پھلوں، ترکاریوں اور جڑوں میں پایا جاتا ہے۔ گاجر کی بعض قسموں اور رتالو میں بکثرت ہوتا ہے۔

(۴) ایک عرصہ تک علماء کا یہی خیال تھا سلیلوز ہضم نہیں ہوسکتا کہ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ادنٰے جانوروں میں ۔ہ تا ۔ ۲ فیصد سلیلوز ان کی غذائی نالیوں میں جذب ہو جاتا ہے تو انہیں اپنا خیال بدل دینا پڑا یہ دیکھنے کے لئے کہ ہاضمی سیّال یعنی خامرہ کا اثر سلیلوز پر کیا ہوتا ہے مختلف تجربے کئے گئے اور صرف اس نتیجہ پر پہنچے کہ جسم سے باہر خامرے کا اثر سلیلوز پر نہیں ہوتا ۔ اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ انسان کی غذائی نالی میں بھی سلیلوز کا ایک حصّہ جذب ہو جاتا ہے ۔ ایک زمانہ قبل بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ سلیلوز غذا کے طور پر استعمال نہیں ہوتا ۔ یہ تو یقینی ہے کہ انسان اور خصوصاً سبزی خوار جانوروں کی غذائی نالی میں سلیلوز کی تحلیل بکٹیریا کی وجہ سے ہوتی ہے اور سلیلوز کاربونک ترشہ اور میتھین یا دلدلی گیس میں تحلیل ہو جاتا ہے لیکن اس بات میں اب بھی شبہ ہے کہ سلیلوز کی تحلیل صرف بکٹیریا ہی کی وجہ سے ہوتی ہے ۔ غذائی نالیوں میں جو خامرہ ہوتا ہے اس کا اثر سلیلوز پر کیا ہوتا ہے' اس سے ہم واقف نہیں ۔ البتہ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ گینچوے' خرگوش' مچھلیوں اور دوسرے جانوروں کے خامرے بھی سلیلوز کو حل کر لیتے ہیں ترکاریوں کے خلیوں سے متعلق یہ ٹھیک طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ نشاستہ کے علاوہ ان میں کاربوہائیڈریٹس سلیلوز کی شکل میں بڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں ۔ پودوں کے خلیوں میں جو ہاضمی تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کا مطالعہ بہت مشکل ہے ۔ اب ہم سلیلوز کی صنعتوں کا ذکر ذرا تفصیل سے کریں گے ۔

(۱) سلولائیڈ ۔ یہ ایک مصنوعی شئے ہے ۔ موجودہ زمانہ میں اس صنعت کو بڑا فروغ حاصل ہے ۔ بہت ساری چیزیں اس سے تیار کی جاتی ہیں ۔ وہ اشیاء جو ہاتھی دانت اور ہڈی سے تیار ہوتی تھیں اب سلولائیڈ سے بنائی جاتی ہیں ۔ اس کی بنی ہوئی اشیاء قیمت میں بہت سستی ہوتی ہیں ۔ سختی اور لچک میں ہاتھی دانت' ہڈی اور مونگے سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہیں ۔ سلولائیڈ کو سلیلوز ہی سے حاصل کرتے ہیں ۔ ترشوں کے عمل سے سلیلوز کو پائراکسلین میں تبدیل کرتے ہیں پھر کافور ملایا جاتا ہے ۔ حرارت کے اثر سے اسے پلاسٹک شکل میں حاصل کرتے ہیں ۔ اس حالت میں سلولائیڈ کو جس شکل اور وضع میں چاہیں ڈھال سکتے ہیں اور مختلف رنگ دیئے جا سکتے ہیں ۔ سلولائیڈ سے مختلف خوشنما چیزیں تیار کی جاتی ہیں مثلاً گنگھیاں' بلیرڈ کے گولے' ڈبیاں' پیانو کی پتیاں' چھتریوں اور چھڑیوں کے مُٹھ عینک کے فریم

اور مختلف قسم کے کھلونے بنائے جاتے ہیں۔ سلولائیڈ سے پہلے یہ اشیا قیمتی تھیں لیکن اس صنعت نے ہر چیز کو سستا کر دیا۔ سلولائیڈ کو سب سے پہلے ڈیول اسپل (Daviel ꞩill) نامی ایک شخص نے ایجاد کیا اور اس کا نام زائی لونائیٹ رکھا۔ اس کے بعد اس شئے کو مختلف نام دیئے گئے مثلاً فائبرلوئیڈ (fiberloid)، وسکولائیڈ (Viscoloid) وغیرہ لیکن امریکہ کے حیات (Hyatt) نے اسے رجسٹرڈ تجارتی نام سلولائیڈ سے موسوم کیا۔ سلولائیڈ کے جلنے کی خاصیت کو ایک حد تک کم کرنے کے لئے اسمیں بعض معدنی اشیاء ملائی جاتی ہیں لیکن آج کل عموماً اس کی تیاری کے لئے نائٹرو سیلیولوز کی بجائے سیلیولوز ایسی ٹیٹ استعمال کیا جاتا ہے۔

(۲) مصنوعی ریشم۔ نائٹرو سیلیولوز کی دریافت کے بعد اس بات کی بے حد کوشش کی گئی کہ قدرتی ریشم کا کوئی قائم مقام دریافت کیا جائے۔ ریشم سازی سائنس اور صنعت کے ملاپ کی بہترین مثال ہے۔ مصنوعی ریشم کی تیاری کے مختلف طریقے ہیں۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں سب سے پہلے اس کی تیاری کا طریقہ ایجاد ہوا۔ اس طریقہ میں روئی یا صاف کئے ہوئے لکڑی کے گودے سے کام لیا جاتا ہے۔ اس قسم کا ریشم گیس کے لیمپ کی جالی کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ قدرتی ریشم سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے اسی لئے اکثر لوگ اس ریشم کو قدرتی ریشم کے دھوکے میں خرید لیتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں ریشم کی تیاری کا ایک طریقہ ایجاد ہوا چونکہ اس کے معلوم کرنے والے کا نام جان مرسر (John Mercer) تھا اس لئے اس ریشم کا نام مرسرایا ریشم رکھا گیا۔ اس ریشم کو عام طور پر (Cotton-silk) کہتے ہیں۔ ایک اور قسم کا ریشم ایسی ٹیٹ سلک ہے لیکن یہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سیلیولوز ایسی ٹیٹ کی مانگ مختلف کاموں میں ہوتی ہے۔ یہ جنگ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ہوائی جہازوں کی وارنش کی تیاری میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض ہوائی جہازوں کے بازو شفاف ہوتے ہیں وہ سیلیولوز ایسی ٹیٹ کی ایک خاص شکل سے بنائے جاتے ہیں جسے سیلیٹ (Cellate) کہتے ہیں مختلف مالئون اور شرابوں کی تیاری میں بھی یہ استعمال ہوتا ہے۔ سلولائیڈ کی تیاری میں بھی بجائے نائٹرو سیلیولوز کے استعمال ہونے لگا ہے۔

مصنوعی ریشم چونکہ سستا ہوتا ہے اس لئے اب یہی زیادہ تر استعمال ہونے لگا ہے، قدرتی

ریشم کو اس سے بڑا نقصان پہنچ رہا ہے اور وہ صنعت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے۔

(۳) امن کے زمانہ کی مصنوعات کا انحصار سلیلوز ہی پر ہے۔ پائراکسلین جن صنعتوں میں استعمال ہوتا ہے ان میں سب سے اہم عکاسی یا فوٹوگرافی ہے۔ آج کل متحرک فلم بھی اسی کی مدد سے بنائے جاتے ہیں سلولائیڈ کی تیاری اور اس کی بعض صنعتیں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس کی وجہ سے فوٹوگرافی میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔ متحرک فلم کلوڈین فلم کہلاتے ہیں۔ یہ بڑے خطرناک ہوتے ہیں اس لئے کہ ان کے جلنے کا ہمیشہ خطرہ لگا رہتا ہے۔ اس قسم کے فلم ایسٹ مین (Eastman) نے ۱۸۸۴ء میں ایجاد کئے۔ اس فلم کی ایجاد کی وجہ سے سرسری فوٹو یا (Snapshothing) کا فن بھی ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ سلیلوز قومی تحفظ کے کاموں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دھماکو روئی جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں اسے ۱۸۴۶ء میں (Schonbein) نے سب سے پہلے دریافت کیا اور اس کی دھماکو خاصیت کا مطالعہ (Lenk) اور (Abel) نے کیا اس سے مختلف دھماکو اشیا ربے دخانی سفوف اور کارتوس وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔

(۴) لکڑی کی کشید اور تخمیر۔ سلیلوز کو لکڑی اور لکڑی کے برادہ کی شکل میں الکوہلس اور ایسی لون کی تیاری میں استعمال کرتے ہیں۔ سب سے پہلے برکونناٹ (Bracconnor) سنہ ۱۸۱۹ء میں لکڑی کے برادہ سے الکوہل تیار کیا۔ ایتھائیل الکوہل لکڑی سے ایک بڑی مقدار میں حاصل کیا جاتا ہے۔ الکوہل صنعتی اعتبار سے جو اہمیت رکھتا ہے اس سے ہر ایک واقف ہے۔ آج کل پٹرول کی رسد بندی کی وجہ سے انجنوں اور موٹر گاڑیوں میں پٹرول کی بجائے یہی الکوہل استعمال ہونے لگا ہے اور اس بات کا بہت کچھ امکان ہے کہ یہ آگے چل کر پٹرول کی مستقل جگہ لے لے۔

(۵) کاغذ سازی۔ ہماری ضرورت کی اہم چیز کاغذ ہے جو سلیلوز ہی سے تیار ہوتا ہے۔ کاغذ بنانے کے لئے روئی، بھوسہ، سن وغیرہ کے گودے سے کام لیا جاتا ہے لیکن موجودہ زمانے میں لکڑی کا گودا زیادہ استعمال ہونے لگا ہے۔ کاغذ سازی کی تاریخ ابتدا سے بڑی دلچسپ ہے۔ قدیم زمانے کے لوگ اپنی نشانیاں، تاریخ اور حالات پتھر، لکڑی، دھاتوں وغیرہ پر کندہ کر دیتے تھے۔ اس مقصد کے لئے برچ کی چھال اور تاڑ کے پتے بھی استعمال ہوتے تھے۔ سنہ ۶ ق۔م میں مصریوں نے (Cyprus) کے

گھانس سے کاغذ جیسی ایک چیز بنائی اس زمانے میں اور خصوصاً متوسط دور میں یورپ میں اس کا بہت رواج تھا۔ کاغذ کی ایجاد سے متعلق مختلف خیال ہیں۔ اس خصوص میں بعض عرب اور جرمن اشخاص کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ انگلستان میں بھی ۱۵۸۸ء میں کاغذ سازی کا ایک کارخانہ سر جان اسپائیلمین (Sir John Spielman) نے قائم کیا۔ اس وجہ سے کوئن الزبتھ نے اسے "سر" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ کاغذ سازی کے لئے ترکاریوں کے گودے کے حاصل کرنے کا طریقہ سب سے پہلے چینیوں نے شروع کیا۔ قدیم زمانے میں جو کاغذ ہاتھ سے بنایا جاتا تھا وہ اب مشینوں سے بنایا جا رہا ہے۔ گودے کے کاغذ کی وجہ سے کاغذ کی صنعت میں بہت ترقی ہو رہی ہے۔ لکڑی وغیرہ سے گودا کیسے حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اس سے کاغذ کیسے بناتے ہیں ہم اس کی تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔ بہرحال کاغذ جو اہمیت رکھتا ہے اور اس سے جو جو کام لئے جاتے ہیں اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔

ہم نے اوپر سیلیولوز اور اس کے فوائد سے متعلق بہت مختصر بیان کیا ہے۔ اگر سیلیولوز کے فائدے اور استعمال تفصیل سے دیکھے جائیں اور اس کی صنعتوں کا مفصل ذکر کیا جائے تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ ایک معمولی چیز جس کا تعلق پودے سے ہے وہ ہمارے کس طرح کام آتی ہے۔ دیکھا جائے تو ہماری زندگی کا انحصار ان ہی پودوں پر ہے اور ان ہی کی وجہ سے ہم تہذیب یافتہ مانے جاتے ہیں۔ کپڑے کا استعمال ہمارے لئے بے حد ضروری ہے اور آپ نے ابھی اوپر سنا کہ کپڑا بھی سیلیولوز سے تیار ہوتا ہے۔ ہم سیلیولوز ہی سے بنے ہوئے کاغذ پر لکھتے ہیں سینما ہال جا کر تفریح کی غرض سے اس شئے سے بنے ہوئے فلم دیکھتے ہیں۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جنگ میں جو دھماکو اشیاء استعمال ہوتی ہیں ان میں کی اکثر سیلیولوز ہی کی بنی ہوتی ہیں۔ غرض سیلیولوز کسی نہ کسی طرح سے ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں مفید ہے اور اس سے تیار کی ہوئی اکثر اشیاء ہم روزمرہ استعمال کرتے ہیں۔

معین الدین احمد انصاری متعلم سال دوم

نکتہ چیں ہے غمِ دل.....

کون جان سکتا ہے کہ قسمت میں کیا کیا لکھا ہے۔ یہ مادی نگاہوں سے چھپے ہوئے نقوش کیا کیا رنگ لاتے ہیں۔ انسان تقدیر کے ہاتھ کا ایک کھلونا ہے وہ جیسا چاہے اسے نچائے۔ کیا معلوم کب کیا ہونے والا ہے۔ ریحانہ نے نرسنگ لی اور ہاسٹل میں ملازم ہوگئی۔ اپنی بیوہ ماں کی پرورش اور اس کی انمول زندگی کا یہی واحد سہارا تھا۔ بیٹا تو کوئی تھا نہیں۔ ریحانہ کی ساری زندگی مشرقی روایات کی حامل تھی۔ شرم، لحاظ اور خودداری کا یہ مجسّم نمونہ بُری صحبتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اینگلو انڈین نرسس کی بے باک صحبت رنگ لائی۔ ریحانہ بھی مخلوط پارٹیوں اور ڈانس وغیرہ میں ان کے ساتھ کی حصّہ دار بن گئی۔ دن کی ڈیوٹی ہاسٹل میں رہی تو رات کے دو دو بجے تک ریحانہ ڈانس ہال کی زینت یا سینما بینی میں گزارنے لگی۔ مذہبی و اخلاقی روایات کی پابند گوشہ نشینی پر جان دینے والی لڑکی یوں تباہ ہوتی ہے۔ ماں اس کی حالت میں یکایک یہ تغیر دیکھ کر سہم جاتی ہے۔ لڑکے رات کے (۲) بجے گھر آئیں تو والدین اس کو گوارا نہیں کرسکتے۔ لڑکی کی اس ناہمواری کو دیکھ کر زبیدہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ خاموش فطرت شرمیلی ریحانہ سے زبیدہ کو کبھی ایسی امید نہ تھی۔ ممکن ہے انسان کی زندگی میں ایسے واقعات بھی آتے ہوں جہاں امیدیں یاس میں بدل جاتی ہوں۔ زبیدہ فطرتاً بہت نیک تھی۔ بدگمانی اور شک ایسی چیزیں اس کی طینت سے بعید تھیں اور یوں بھی ہر شخص ع اپنے پہ کر رہا ہے قیاس اہل دہر کا۔ آج ریحانہ کو اس عالم میں دیکھ کر جہاں اس کا

تخیل بھی نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس کو اپنی زندگی سے مٹھاس رخصت ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ حیات گھڑیاں اداس پھیکی پھیکی، کھوئی کھوئی، روٹھی روٹھی سی محسوس ہوتیں ــــ اور وہ ہر شام ریحانہ کی آمد میں گویا اس تخیل کی مالا جپ رہی تھی ؎

کس کو معلوم ہے کس وقت چلے آئیں وہ ۔۔۔ عالم شوق کو غافل نہ کہیں پائیں وہ
بربطِ غم کو یونہیں نغمہ سرا رہنے دے ۔۔۔ درِ کاشانۂ امید کھلا رہنے دے

رات کے کوئی ڈھائی بجے ہیں۔ ریحانہ اپنے آپ کو بھولی ہوئی، خاندانی روایات کو دفن کرتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت سبز لیمپ جل رہا ہے۔ زبیدہ کھانا لئے ہوئے صاف و ستھرے دستر خوان پر اس کی منتظر بیٹھی ہے۔

کماؤ بیٹی۔ ماں کہہ بھی کیا سکتی ہے۔ اس کی طبیعت کے الجھاؤ سے جی ڈرتا ہے۔ کہیں روٹھ نہ جائے، بے تکا سا جواب نہ دے دے۔ اس کی خودداری کے جذبہ کو کہیں ٹھیس نہ لگ جائے۔ اتنا ادب جواب تک کرتی رہی وہ گستاخی سے نہ بدل جائے۔ اپنی رکھت و لحاظ سے بات کرنا ہوتا ہے۔ سہمی سہمی ڈری ڈری آواز میں ایک ملیح سی شکایت کرتی ہے۔ "ریحانہ ــــ بیٹا میری تاریک و بھیانک دنیا کا تم ہی چشم و چراغ ہو۔ تم یہ سمجھ جاؤ کہ تمھارے بغیر میری دنیا سونی رہتی ہے۔ جب دیپک ہی نہ رہے تو گھر میں اجالا کیسا۔ آتنی دیر تک تم کہاں رہیں بیٹی؟" ریحانہ جو آج مہینوں پہلے سے کھٹک رہی تھی کہ ماں کیوں اس سے کسی قسم کا سوال نہیں کرتی۔ وہ خاموش کیوں رہ جاتی ہے۔ میری حرکتوں کو دیکھ کر۔ لیکن شاید ریحانہ کو شاعر کے اس تخیل نے بگاڑ دیا تھا ع "بر تر خلوص بھی جھوٹی قسم بھی کھائے جا"۔ دبی زبان سے صرف یہ کہتی ہے ــــ "اماں ــــ کبھی کبھی ایسے کچھ بیمار ہاسپٹل آجاتے ہیں کہ دن کی ڈیوٹی والی نرسیں بھی رات کے لئے روک لی جاتی ہیں۔ اور ہم تو ٹھہرے بیگار۔ ہم نے اپنی زندگی ہی قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے۔ میں کوئی کالج یا اسکول کی لڑکی تو نہیں جو وقت پر جا کر گھر آسکوں۔ ہم تو خادم ہیں جس نے جیسی چاہی ویسی خدمت لے لی"۔ زبیدہ کا منہ بند ہو جاتا ہے۔ وہ کہہ بھی کیا سکتی ہے۔ گھر میں بیٹھنے والی شریف عورت۔ اس کے بس میں تو کچھ ہے نہیں۔ ریحانہ نا سمجھ الھڑ اور جاہل تو تھی نہیں جس کو سمجھایا جاتا۔ کہ نیک و بد میں تمیز یوں کرتے ہیں۔ اس نے د

دیکھی تھی، سفر کیے تھے۔ ہاسٹل میں رہ چکی تھی اور دنیا کے متعدد ان مل بے جوڑ نشیب و فراز کا بچشم غور مشاہدہ کیا تھا۔ وہ خود اپنی ماں سے کئی ایسے افسوس ناک واقعات کہہ چکی تھی جن کو سن کر ماں اور بیٹی نے گھنٹوں سر دھنا۔ اب وہی ریحانہ کچھ کی کچھ ہو گئی تھی جس کے منھ میں زبان نہ تھی وہ آج زبیدہ کو نہ جانے کیا کچھ رہی تھی۔ اپنے ساتھ کی سہیلی یا جانے کیا۔ ریحانہ اب تو بعض وقت وظیفۂ شب کا بہانہ کر کے صبح صبح بھی آنے لگی ہے۔ اِدھر چار پی اُدھر پھر ہاسٹل جانا ہے کہہ کر چل دی۔

زبیدہ کے ہمسایہ میں رکما رہتی تھی۔ کنور اس کا لڑکا تھا جو ابھی ابھی انگلستان ہو آیا تھا۔ آزاد خیال کنور ایک رات ڈانس ہال میں ریحانہ سے ملتا ہے کیونکہ ایک ہندوستانی لڑکی کو اینگلو انڈین "مخلوط" حلقے میں دیکھ کر وہ متعجب ہو جاتا ہے۔ انگلستان کی آزاد اور بے باک فضا میں بھی اس نے ایسی آزاد منش ہندوستانی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اور نہ مغربی شریف گھرانوں میں کہیں اتنی بے باکی تھی۔ ریحانہ کو ناچتے دیکھ کر وہ محوِ حیرت تھا جب ناچ ختم ہوا۔ کنور نے خود ہی اس سے اپنا تعارف کروایا۔ حالانکہ مغربی طرزِ تعارف یہ ہے کہ کوئی تیسرا ملاتا ہے ورنہ یوں خود سے ملنا اور بات چیت کرنا کسرِ شان سمجھا جاتا ہے۔ ریحانہ کنور سے مل کر شرم سے پانی پانی ہوئی جاتی تھی۔ کنور میں وہ ایک روحانی عنصر جو تھا ہندوستان کی آب و ہوا میں پل کر جوان ہونے کا وہ اُبھر آیا تھا مغرب کا عارضی غازہ نکل گیا تھا۔ پہلے تو ریحانہ نے کنور کو بھی کرسچن سمجھا مگر کنور نام سن کر اس کے ہوش پرّاں ہو گئے۔ اس سے کچھ نہ بن پڑی اور وہ خاموش ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ کنور بھی موقع کی مصلحت دیکھ کر اس کے قریب جا بیٹھا۔ "مس ریحانہ۔ آپ کہاں رہتی ہیں؟ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ معاف کیجئے میری ناہموار، بے دھڑک و غیر متوقع طرزِ گفتگو کو۔ لیکن ہندوستانی معاشرت میں تو اس قسم کی خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں نا؟ ریحانہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ دل پر جبر کر کے جواب دیتے ہی بنی۔ "مسٹر کنور ـــــ میں کیا بتاؤں کہ میں کہاں رہتی ہوں۔ فی الوقت تو یہاں ہوں۔ آپ کی بے تکلفی کا شکریہ۔ لیکن مجھے تو آپ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی نے آپ کو میری ٹوہ لگانے یہاں بھیجا ہے۔" چور کی داڑھی میں شاید ایسے ہی سمے تنکا پڑ جاتا ہے۔ کنور نے دنیا دیکھی تھی ریحانہ سے بھی زیادہ۔ اس نے سوچا۔ سرکش گھوڑے کو نرمی سے رام کرنا چاہیئے۔ چابک سے اس کے اور سرکش ہو جانے

کا اندیشہ ہے ـــــ" نہیں مس صاحبہ میں نے یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ نہ بتایئے مجھے کچھ اصرار بھی نہیں وہ فی میں کون کہ آپ مجھے پہلی ملاقات میں ہی اپنا سب کچھ بتا دیں۔ ایک اجنبی کا حوصلہ ہی کتنا۔ مگر مشرق کو اپنی قدیم روایات پر ناز ہے اور مشرق مشرق ہی رہے گا مغرب بن نہیں سکتا۔ معاف کیجئے اگر میں یہ کہوں کہ اس اینگلو انڈین مخلوط حلقہ میں آپ کا اس طرح گھومنا، سیر و تفریح کرنا گویا ایک قسم کی اندھی تقلید ـــ یہ مجھے تو کیا کسی شریف ہندوستانی کو بھی پسند نہیں آسکتا ـــــ اور ـــــ ریحانہ نے قطع کلام کرتے ہوئے "مسٹر کنور آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ آپ ایک اجنبی لڑکی کو بے جانے بوجھے اس قسم کی باتوں سے ذلیل کریں۔ آپ کا انگلستان جانا میرے خیال میں محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ انسان کو آزاد خیال ہونا چاہیئے۔ آپ کے خیالات اس آزادی نے اور محدود کر دیئے ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کنول کیچڑ میں رہ کر بھی بھیگ نہیں سکتا۔" بس بس مس ریحانہ میں آپ کے بے دلیل دعوے کا کوئی قابل و سنجیدہ جواب نہیں دے سکتا۔ وہ محض ایک پھول ہے۔ انسان تو نہیں۔ آپ جانیں آپ کی مصروفیتیں جانیں مجھے اس سے بحث نہیں کہ آپ سوسائٹی کی جان بن کر رہیں۔ کلب و ناچ گھر کی روح رواں بن جائیں۔ یا ایک مشرقی پھول جس سے آپ نے اس وقت تشبیہ دی ہے۔ مگر شاید کنول بھی کیچڑ سے آلودہ ہوسکتا ہے اگر طوفان کا مقابلہ کرے۔ زمانہ پلٹ بھی سکتا ہے۔ اور اس زور سے ہوا چل سکتی ہے کہ یہی کنول ٹوٹ کر کیچڑ میں پھنس جائے۔ اس سے مجھے بحث نہیں ـــ بس اب ختم کیجئے میں محدود خیالات کا سہی۔ میرے خیالات پر مغرب کی فضا اثر نہ کرسکی۔ میری مشرقی روش میں سر مو فرق نہ آیا۔ میں ہر ہندوستانی عورت کا اسی طرح ادب و احترام کرتا ہوں جس طرح اپنی ماں اور بہن کا۔ اب رات زیادہ ہوگئی ہے۔ مجھے اجازت دیجئے۔"

ریحانہ خاموش ہو جاتی ہے۔ کنور چلا جاتا ہے۔ دونوں کے گھر پاس پاس ہیں۔ ریحانہ اپنی سہیلی شیلا کے ساتھ کار میں بیٹھی ہوئی آرہی ہے۔ سامنے ہی کنور کی کار چلی جارہی ہے۔ اور شیلا کی کار پیچھے پیچھے۔ ریحانہ شیلا سے کہتی ہے "ارے تم اس کار کا کیوں پیچھا کر رہی ہو شیلا؟ تمھیں کیا ہو گیا آج؟ پگلی کہیں کی؟" بات اصل یہ ہے کہ ریحانہ خود اس وقت غصہ میں بھری ہوئی ہے۔ اس کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ شیلا صرف اس کو دیکھ کر مسکرا دیتی ہے۔ ۲ بج چکے ہیں۔ کنور اور ریحانہ ساتھ ہی ساتھ اپنی اپنی موٹروں سے اپنے اپنے گھروں میں اترتے

جاتے ہیں۔ ریحانہ کی ماں تو جاگ رہی ہوگی۔ لیکن رکما سو رہی ہے۔ کنور دبے پاؤں اندر داخل ہوتا ہے۔ تبدیل لباس کے بعد چاندنی میں اپنے سفید اجلے بستر پر دراز ہو جاتا ہے۔ نینداس کی آنکھوں سے کسی نے چرالی ہے۔ اس کو ریحانہ کا خیال آتا ہے۔ ایک بغاوت کا جذبہ اس کے قلب میں موجزن ہے۔ وہ بہت دیر تک چاند کو گھورتا رہتا ہے ایک سوچ ہے کہ لگی ہے۔ زندگی کے اس معمہ کا اس کو کسی طرح حل نہیں ملتا کہ ریحانہ کو کس طرح اس بے راہ روی سے سیدھے راستہ پر لگایا جائے۔ میرے خیالات محدود ہیں اور اس بے چاری کے کتنے آزاد۔ میں نے مغربی تعلیم جو حاصل کی یہ محض تحصیل حاصل۔ اور اس کے اپنے نظریہ سے ایک ڈھکوسلا ہوگا۔ وہی ٹھیک اندازہ کر سکتی ہے یا اس کا ضمیر —— ایک لاشعوری جھٹکا اس کے سمندِ تخیل کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ اس کی آتما جیسے کسی نے راکھ کر کے رکھدی ہے۔ وہ بڑی سوچ بچار و کرب و اضطراب سے بدلتی ہوئی کروٹوں کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اس کی قوتِ ارادی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ کل ہی سے ریحانہ میں ایک نمایاں انقلاب دیکھے گا۔

چاند سے روشنی و دلکشی، پھول سے نکہت و لطافت، آفتاب سے تپش و سوزش، بلبل سے نغمہ و کیفِ سرود، آسمانوں سے نیل و رنگینی، دریا سے روانی و سکون، کیا یہ سب اس بلند معبود کے ایسے اجزائے ترکیبی نہیں جن کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا؟ پس ریحانہ بھی عورت تھی۔ ایک ہندوستانی شریف لڑکی جس کے دل کی دھڑکنوں میں زندگی کی آواز —— ساز میں راگنی کی طرح بھری ہوئی ہے۔ جو باوجود عقل رکھنے کے دل کی زیادہ مطیع ہو جاتی ہے جس کی قوتِ فیصلہ کمزور ہوتے ہوئے بھی مضبوط و مستحکم ہے جس کو آزادی کبھی دی نہیں گئی۔ جس پر اعتبار کبھی کیا نہ گیا جس پر بھروسہ کرنا مشرقی مرد اپنی فطری کمزوری سمجھتا ہے اس کو ایک ذرا سی خودرائی مل جاتی ہے تو وہ بس اس بچّے کی طرح بہک جاتی ہے جس کی دایا جو اس کے حق میں بہت سختیاں کرتی ہے تھوڑی دیر کے لئے اس کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف متوجہ ہو جاتی ہے —— بچّہ —— جس کو بڑی پابندیوں اور سختیوں سے اس نے رکھا ہے اس کی اس ذرا سی انجانی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور ایک خوب صورت گلاب کے پھول کو توڑنے کے لئے اس کی نظر بچا کر لپک جاتا ہے —— جس کی باڑھ میں نہ صرف کانٹے ہیں بلکہ ایک موہنی چال والا، خوب صورت چمکیلا سانپ بھی —— بچّہ کو کبھی آزادی

ملی نہ تھی۔ ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ، بندش، خطاؤں پر سزائیں۔ ماں کو اس کی دایا نے کبھی آشنا نہ بتایا تھا کہ گلاب کے اس جھنڈ میں نہ صرف ایک خوب صورت مہکتا ہوا پھول ہے بلکہ کانٹے بھی ہیں۔ اور اس کی خوشبو سے مست ہونے والا ایک زہریلا ناگ بھی ––– اُف۔ یہ دایا کے سہارے جینے اور پروان چڑھنے والا بچہ ––– اپنے مستقبل کے اَن دیکھے، اَن جانے راز سے قطعی بے خبر ––– نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ موذی جانور اس ننھی سی جان کو ڈس لیتا ہے۔ ریحانہ ––– اس بچے کی طرح ایک انجان لاابالی زندگی بسر کر رہی تھی۔ ماں لحاظ و پاس سے کچھ کہہ نہ سکی اور ان دونوں میں گفتگو کے مواقع بھی بہت کم آتے تھے۔ صحبت تو نورٌ علیٰ نور تھی۔ اور صرف ٹرننگ لینے سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے لکھا پڑھا خاک بھی نہ تھا۔ امداد اوّلین کی تعلیم کہیں دنیا کے نشیب و فراز سکھلا سکتی ہے؟ مانا کہ وہ جاہل بھی نہ تھی۔ لیکن کنور اس کی بے نور زندگی میں جس کا مستقبل تاریک ہونے کے قریب تھا ایک شمع کی طرح جھلملاتا ہے اور ریحانہ کی آنکھیں اس کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ وہ جھنجلانے لگتی ہے۔ اس کو یہ مداخلت پسند نہیں آتی۔ لیکن جس وقت وہ شمع کی حقیقت اور اس کے سودمند وجود کو تنہائی و تاریکی میں محسوس کرتی ہے تو اس کو خود اپنا جیون مضحکہ خیز و خطرناک معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس خواب کی تعبیر بھیانک دکھائی دیتی ہے اور وہ گھنٹوں کنور کی معنی خیز دل جلی نصیحتوں کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی گفتگو کی اہمیت پر غور کرتی ہے۔ کنور کی شخصیت کا اس کے دل پر گہرا اثر ہو گیا ہے۔ ڈانس ہال سے واپسی کے بعد اس کے خیالات میں کہاں تک تغیر آیا۔ اس کی زندگی نے کیسی کروٹ بدلی۔ اس کو واقعات ثابت کرتے ہیں۔ وہ ماں کو حسب عادت اپنا منتظر پاتی ہے۔ اس کی اور اپنی زندگی کے دو راہے کی نوعیت کو محسوس کرتی ہے۔ ایک کی زندگی کا مقصد کتنا پاک اور مقدس۔ دوسرے کی حیات کتنی بے معنی و بے مقصد۔ انسان اپنی نظروں میں نہ گرے دنیا کی نظریں خواہ اس کو کہیں سے کہیں ڈھکیل دیں وہ گر نہیں سکتا۔ سماج اس کو غار میں جھونک دے لیکن جب تک ضمیر کی آواز ہمنوائی کرتی ہے۔ زندگی پُرسکون رہتی ہے۔ زندگی میں الجھن کا پیدا ہونا تو ضمیر کی بدعنوانی و بے ربطی ہے۔ کنور نے اس کی دنیا بدل دی تھی۔ ایسے ایسے بہت سے خیالات اس کے دماغی توازن کو قائم نہ رکھنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ اب پھر وہ ایک گوشہ نشین سی ہو گئی ہے۔ دوستوں سے کنارہ کشی

اختیار کر کے سوسائٹی سے منہ موڑ کر وہ اب زندگی کے کسی اہم و خوش گوار پہلو کو سوچنے لگی ہے "مغرب زدہ" اور مغربی عورتیں کیا جانیں کہ ایک مشرقی عورت کی زندگی کا بندھن کتنا نازک اور کمزور ہوتا ہے۔

زبیدہ اس کی ان تبدیلیوں کا بھی مشاہدہ کر رہی تھی مگر خاموشی کے ساتھ۔ نہ اس نے جب کچھ زیادہ سختی کی تھی اور نہ اب کچھ استفسار کیا۔ نہ ریحانہ کی خاموشی اور کھوئے کھوئے رہنے کا سبب پوچھا۔ لیکن اس روش کو دیکھ کر اس کے خزاں رسیدہ چمن تخیل میں آج پھر سے بہار آئی ہے۔ اس کی از خود رفتگی سے وہ بھی کچھ زیادہ مطمئن نہ تھی۔ جانے وہ کیا کیا سوچتی رہتی تھی۔

شام کی چاہی کر ریحانہ نزدیک کے پارک میں چہل قدمی کو چلی جاتی ہے۔ اتفاق اور محض اتفاق کی بات تھی کہ وہیں کے ایک گوشۂ تنہائی میں اس کو کنور بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ ریحانہ بید لرزاں کی طرح کانپنے لگی ہے۔ ایک مہیب سا تصور جو رہتا تھا کہ اگر کبھی کنور کا سامنا ہو جائے تو وہ کیا کرے گی۔ اس سوال کا اس کو حل ہی نہ ملا تھا کہ اس کی حقیقت مل گئی لیکن اس کی قوت ارادی نے اس کا ساتھ دیا۔ وہ آگے بڑھی۔ کنور نے تعجب سے دیکھا۔ اس کو اپنی بصارت پر دھوکہ ہونے لگا۔ اسکی دنیائے تخیل کی دیوی جس سے وہ خیال ہی خیال میں رات دن بیسیوں معرکے سر کرتا تھا، اس سے لڑتا تھا، اس کو پھر سے منا بھی لیتا تھا لیکن دوچار ہونے کی دونوں میں ہمت نہ تھی۔ جیسے ایک مہذب چور چوری کرتا ہوا پکڑا جائے۔ ریحانہ کی بعینہ یہی حالت تھی۔ چور کو پکڑنے والا بھی شرمندہ ہی رہتا ہے اس نفسیاتی مسئلہ کے تحت کنور بھی محجوب سا تھا۔ آج ریحانہ سادے سیدھے لباس میں ایک آسمانی حور معلوم ہوتی تھی۔ آج اس میں وہ چنچل پن اور وہ شوخی نہ تھی۔ ایک وقار آمیز تمکنت، ایک عجیب سی سنجیدگی ــــ محبت یا نفرت بہ پہلی نظر میں ہوتی ہے۔ کنور تو پہلی نظر میں ریحانہ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ لیکن آج اس عنوان نفرت پر محبت نے اپنا پرتو ڈال دیا تھا۔ نفرت محبت سے بدل گئی تھی۔ بے لاگ، بے لوث، پاک و سچی محبت کے چشمے دو دلوں میں یکساں پھوٹ رہے تھے۔ یہ سکوت نہ جانے کب تک قائم رہتا ــــ کہ کنور نے اس مہر کو توڑ دیا جو ان دونوں کے لبوں پر لگی ہوئی تھی۔ "ارے ریحانہ تم پھر ڈانس ہال میں نظر نہ آئیں۔ مزاج تو اچھے ہیں؟"

میرے مزاج کو کیا ہوا مسٹر کنور ــــــ معاف کرنا میں نے آپ کو غلط سمجھا۔ آپ کے اعتراض اور آپ کی پُر خلوص نصیحت کا میں نے غلط اندازہ لگایا۔ اور مجھے بہت رنج پہنچا لیکن جب میں نے اپنے آپ کو اچھی طرح دیکھنے کی زحمت کی اور اپنے کارناموں کا جائزہ لیا تو واقعی مجھے یہ محسوس لگا کہ میں ایک غلط راستے پر جا رہی تھی۔ یہ آپ کا احسان ہے کہ آپ نے مجھے ڈوبنے سے پہلے بچا لیا۔ ٹھوکر لگنے سے پہلے مجھے تھام لیا۔ بعض کچے اور کمزور دل کے انسان ہوتے ہیں جنہیں اچھے رہبر کی ضرورت ہوتی ہے اور شاید میں بھی انہیں میں سے ہوں۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کی تو مجھ میں صلاحیت نہیں ہاں عفو خواہ ضرور ہوں کہ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔

یہ آپ مجھے اس طرح کانٹوں میں کیوں گھسیٹتی ہیں؟ میں نے کیا ایسی آپ کے ساتھ بھلائی کی ـ ایک بات اپنے ناگوارِ خاطر ہوئی تھی بس کہہ دیا کہ یہ راستہ ایسا ہے۔ ادھر سے جانے میں خدشہ ہے۔ یہ تو ایک انسانی فرض ہے۔ اور غالباً آپ مجھے انسان ہی تو سمجھتی ہیں؟

تو آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ نے میرے جیون کی نوعیت ہی بدل دی۔ یہ خوش آئند تبدیلی جو رونما ہوئی ہے اس کے صلہ میں میں آپ کو کیا دے سکتی ہوں؟ بتایئے کیا دوں؟
زندگی میں ایک سچے ہمدرد دوست کا ملنا یہ کیا کچھ کم ہے؟

جہاں بانو نقوی
ایم اے (عثمانیہ)

مانٹیسکو کا سیاسی نظریہ

زمانۂ حال کی عمومی حکومت کے آغاز اور خاص کر اٹھارویں صدی عیسوی کی سیاسی تحریروں میں یہ امر علم سیاست کے اہم مسلمات میں داخل تھا کہ حکومت کے یہ تینوں عناصر یعنی عدلیہ، مقننہ، عاملہ ایک دوسرے سے الگ رکھے جائیں۔ ان میں سے ہر ایک عنصر کا کام علیحدہ علیحدہ اشخاص کی جماعتوں کے سپرد ہونا چاہیئے اور کسی ایک جماعت کو کسی دوسری جماعت پر کسی قسم کا غالب اختیار نہ ہونا چاہیئے۔ اس خیال کی غایت اصلی یہی تھی کہ اس صورت سے عوام کی آزادی کی ایک خاص ضمانت ہو جائے گی اور در حقیقت اسی کو بہترین ضمانت خیال کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ تفریق اختیارات کے نام سے موسوم ہے۔ یہ خیال کوئی اٹھارویں صدی کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اس کا سُراغ ارسطو کے زمانہ تک چلتا ہے۔

پالیبیس نے اپنی تاریخ روما کی چھٹی کتاب میں جہاں رومانی نظام سلطنت پر بحث کی ہے وہیں تفصیل کے ساتھ ان متوازن اختیارات کا ذکر کیا ہے جو سنات، کونسل، اور ٹریبیون کے تفویض کے گئے۔ سولہویں صدی کا سیاست داں ژان بودین یورپ میں شاید پہلا شخص تھا جس نے یہ اصول پیش کیا کہ "فرماں روا کو عادلانہ فرائض خود اپنے آپ پورے نہیں کرنے چاہئیں بلکہ عدالت کا کام دوسروں کے سپرد کر دینا چاہیئے۔" وہ کہتا ہے کہ "اگر قانون سازی اور عدالت دونوں ایک ہی شخص کی سپردگی میں ہوں تو پھر اس کے معنے یہ ہوں گے کہ عدل و اختیار معافی قانون کا انطباق اور اس سے خود مختارانہ گریزان سب میں خلط مبحث ہو جائے گا۔" اس کے بعد جب یورپ نے اس تعنیم کاری کے اصول

پر زور دیا وہ انگریز مصنف لوک ہے جس نے اپنے "رسالہ جات متعلق حکومت" میں حکومت کے متعلق شعبوں کو ایک دوسرے سے ممیز کیا لیکن اس نظریہ کے اساس میں وہ اعضا نہیں ہیں جو اوپر بیان کئے گئے ہیں بلکہ وہ ایک طرف تو حکومت کو قانون ساز، عاملانہ اور وفاقی شعبوں میں تقسیم کرتا ہے جو اس کی دانست میں امور مملکت کی ہمیشہ نگرانی کرتا رہتا ہے لیکن جس شخص نے تقسیم کار کے اصول پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ فرانسیسی بیرن مانٹیسکو ہے جس نے اپنی کتاب "روح قوانین" کو اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھ کر اور اس میں تفریق اختیارات کے اصول پر زور دے کر دنیا کے بعض دساتیر پر براہ راست اثر ڈالا۔ یہاں اس کے نظریہ کو درج کیا جاتا ہے۔

نظریۂ تفریق اختیارات

"ہر حکومت میں تین قسم کا اقتدار مرکوز ہوتا ہے۔ اوّل اقتدار قانون سازی، دوسرے اقتدار عاملہ جس کے سپرد دو کام ہیں قانون اقوام کا نفاذ اور ملکی قوانین کی ترویج۔ تیسرے عدلیہ یہ اقتدار عاملہ سے جداگانہ ہوتا ہے جہاں ایک ہی شخصیت میں اقتدار مقننہ و عاملہ دونوں مرکوز ہوں وہاں آزادی کا بول بالا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ایسی صورت میں لوگوں کو ہمیشہ یہ خوف لگا رہے گا کہ ایک ہی حکمران یا جماعت ظالمانہ قوانین بھی بنائے گی اور ان کا نفاذ بھی ظالمانہ انداز سے کرے گی اس طرح رعایا کی زندگی اور آزادی دونوں پر مطلق العنانی کے ساتھ قابو یافتہ ہو جائے گی۔ اگر عدالت اور عاملانہ اقتدار دونوں ایک شخصیت کے سپرد ہوں خواہ وہ اعیان پر مشتمل ہو یا عوام پر تو پس ہر چیز کا خاتمہ ہی ہو جائے گا۔"

انگلستان کے مقنن بلیکسٹن نے بھی اپنی تصنیف "تشریحات قوانین انگلستان" میں اسی قسم کی رائے ظاہر کی ہے وہ لکھتا ہے کہ "تمام مطلق العنان حکومتوں میں اقتدار اعلیٰ اپنے قوانین بنانے ان کے نافذ کرنے کا اختیار ایک ہی شخص یا ایک ہی جماعت کو حاصل ہوتا ہے اور جب یہ دونوں قوتیں ایک ہی ذات واحد میں مجتمع ہو جاتی ہیں تو پھر آزادیٔ عامہ کوئی شئے باقی نہیں رہتی۔"

جس وقت مانٹیسکو نے یہ نظریہ پیش کیا اس وقت برطانوی وزارت نے ہنوز ایک

واحد کی حیثیت پیدا نہیں کی تھی - اس نظریہ نے بہت زبردست اثر ڈالا - اسکی کتاب ۱۷۴۸ء میں شائع ہوئی -

امریکہ اور فرانس پر اس نظریہ کا اثر

اٹھارہویں صدی میں سیاسیات کے لکھنے والوں کے نزدیک یہ ایک مسلمہ عقیدہ سا ہوگیا تھا کہ علیحدگی اختیار کا اثر آزادی عامہ پر پڑتا ہے - اس کا اثر ممالک متحدہ کی تاریخ پر پڑا جب ریاستوں کی حکومتیں قائم ہوئیں تو اس اصول مسلّمہ نے قول سے نکل کر فعل کی صورت اختیار کی اور حکومت کی مختلف شاخوں میں تفریق کردی گئی گورنر اور مجلس قانون ساز کے اختیارات علیحدہ تھے اور ان کے انتخابات بھی علٰحدہ ہوگئے - انہوں نے یہ طریقہ بالارادہ اختیار کیا - اس کا ثبوت میساچوسٹ کے ۱۷۸۰ء والے نظام حکومت میں ملتا ہے ۱۷۸۷ء میں جو مجلس عارضی متفقہ نظام سلطنت کے مرتب کرنے کیلئے مقرر ہوئی اس پر بھی اس نظریہ کا بہت اثر پڑا اس کے ارکان نے یہ ضرور تسلیم کیا کہ اصول تفریق کی سختی میں کسیقدر اعتدال پیدا کرنا چاہیئے - بہرکیف انہوں نے اس اصول کو تسلیم کرلیا تھا اور اسے نظام سلطنت کی بنیاد قرار دیا گیا -

فرانس کے دور انقلابی میں اس تفریق نے جو اثر پیدا کیا وہ کسی طرح اس اثر سے کم نہ تھا جو ممالک متحدہ امریکہ میں پیدا ہوا - چنانچہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے بعد فرانس کے پہلے تحریری دستور میں جو انقلاب کے بعد بنایا گیا انہوں نے سلطنت کے شروع میں تمہیداً "اعلان حقوق" شامل کیا - اس کی سولہویں دفعہ میں یہ لکھا ہے کہ " وہ تمام نظم معاشرت جس میں تفریق اختیارات معین و مشخص نہ ہو اس کا کوئی نظام سلطنت نہیں ہوتا " اس عام اصول کے موافق اس نظام سلطنت کی رو سے ایسی مجلس وضع قوانین مقرر کی گئی جس کے برطرف کرنے کا اختیار بادشاہ کو نہیں دیا گیا وزراء اور دوسرے حکام اسمیں شامل ہونے سے ممنوع قرار پائے - قانون کی ہدایت کا حق بادشاہ کو حاصل نہیں تھا - بعد میں ۱۷۹۵ء کے نظام سلطنت نے اس تفریق میں تبدیلی پیدا کردی کہ ایک مرکب جماعت عاملانہ یعنے ڈائرکٹری مقرر کی جس کا انتخاب خود مجلس وضع قوانین کیطرف سے ہوتا تھا - فرانس میں اس نظریہ کا اسوقت بھی اتنا اثر ہے کہ معمولی عدالتیں سرکاری عہدہ داروں کی ان خلاف ورزی کے مقدمات کی سماعت نہیں کرسکتیں جو ان سے سرکاری فرائض کی انجام دہی میں سرزد ہوتی ہوں بلکہ ان کی سماعت خاص عدالت ہائے انتظامی میں کی جاتی ہے - الغرض مانٹیسکو کے نظریۂ تفریق اختیارات کی وجہ سے ایک جدید طرز کی حکومت کی ابتدا ہوتی ہے جس میں عاملہ، مقننہ، اور عدلیہ ایک دوسرے سے جداگانہ عناصر حکومت سمجھے جاتے ہیں -

زمانۂ موجودہ اور یہ نظریہ

اس نظریہ کی قدر گھٹ گئی ہے جس کی سب سے بڑی مثال خود برطانوی حکومت ہے جو ان تینوں اعضائے حکومت کو ملا کر حکومت کر رہی ہے چنانچہ فرانس اٹلی کی موجودہ پارلیمنٹی حکومتوں میں بھی تقسیم اختیارات نہیں فرانس میں صدر جمہوریہ کا انتخاب مجلس وضع قوانین کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کے وزراء قانوناً تو نہیں مگر عملاً دار النائبین کے فریق غالب کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ اسی طرح شاہ اٹلی پر بھی فریقانہ وزارت کے ذریعہ سے حکومت کرنا ہے۔

ممالک متحدہ امریکہ کے نظام سلطنت کی رو سے تقسیم اختیارات کا اصول صرف متفقہ حکومت میں ایک معتدل حد کے اندر اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ جماعت عاملہ نہ وضع قوانین کی شرکت سے بالکل محروم ہو کیونکہ کانگریس کے منظور کردہ قوانین کے امتناع کا حق ایک حد تک رئیس کی طرف سے گورنر، جماعت عاملانہ، مجلس وضع قوانین اور ججوں کا علیحدہ علیحدہ انتخاب نظام سلطنت کی مروجہ ترتیب کے موافق ہر جگہ شائع و ذائع ہے ہر ایک ریاست میں والی کو امتناع کے جزوی اختیارات اور مجلس وضع قوانین کے نام پیغامات بھیجنے کے حق کا حاصل ہونا گویا اس اصول کی سختی کو نرم کر کے اس سے تجاوز کرنا ہے۔

اس نظریہ کی تنقید

جس وقت یہ نظریہ پیش کیا گیا اُس زمانہ میں یہ نظریہ بڑا خوشگوار معلوم ہوتا تھا لیکن عملی طور پر یہ نظریہ بے بنیاد ہے جس طرح انسانی جسم کے تمام اعضا مل کر کام کرتے ہیں اسیطرح گورنمنٹ کے یہ تینوں اعضائے حکومت چل سکتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو حکومت کے ان تینوں یعنی مقننہ، عاملہ اور عدلیہ کے درمیان ایسی تقسیم کار جسکی وجہ سے ان تینوں میں کسی قسم کا تعلق باقی نہ رہے نہ صرف ناممکن ہے بلکہ نقصان رساں بھی ہے حقیقت یہ ہے کہ مانٹیسکو نے جن حالات و واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا ان کی رفتار کو وہ سمجھا ہی نہیں۔ اس نے اپنی دانست میں دستور انگلستان کا غائر مطالعہ کر کے اپنے نتائج اخذ کئے تھے۔ یہ زمانہ تاریخ انگلستان میں نہایت ممتاز تھا اسلئے کہ دستاویز حقوق ۱۶۸۹ء اور قانون بندوبست ۱۷۰۱ء کے ذریعہ سے شاہ انگلستان کے اکثر ایسے اختیارات جو پچھلے پچاس سال میں اس کے اور پارلیمنٹ کے درمیان مابہ النزاع رہے تھے اس کی گرفت سے نکال لئے گئے اور موخر الذکر قانون کی رو سے ایک طرف تو محکمۂ عدلیہ بیرونی اثرات سے تقریباً آزاد ہو گیا تھا اور دوسری جانب یہ قاعدہ ہو گیا تھا کہ بادشاہ کا کوئی وزیر یا وظیفہ خوار

دارالعوام میں نشست نہ کرے تاکہ پارلیمنٹ شاہی اقتدار سے بالکل آزاد رہ سکے۔ اگر آخری قاعدہ باقی رہتا تو کابینی حکومت جو آج کل انگریزی دستور کی جان ہے قطعاً ناممکن ہو جاتی اور یہ طریقہ وزیر اعظم پارلیمنٹ کی اکثریت کا رہبر ہوتا اور یہ ممکن ہو دارالامرا میں مرافعہ بھی ہو سکتا جو اس نظریہ کے بالکل خلاف ہے۔ جرمنی اور دیگر آمریتوں میں بھی اسکو کوئی جگہ حاصل نہیں ہے دنیا کے کسی دستور میں قطعی تفریق نہیں ہو سکی۔ یہ ایک ناقابل عمل چیز ہے مملکت ایک وحدت ہے۔ اگر اس کے اعضار کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا جائے تو یہ وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی دراصل آزادئ عوام کیلئے اختیارات تفریق ہے کوئی ایک لازمی علاج نہیں ہے بلکہ عوام کی آزادی کیلئے چند اور اجزار کی ضرورت ہے۔ آزادئ عوام کے جذبے، ان کے قوانین اور اداروں پر منحصر ہے نہ کہ اداروں کی ترتیب پر بلحاظ میں قانون سے آزادی کی حفاظت کیجاتی ہے۔

اس کے علاوہ اس نظریہ میں ایک غلطی یہ ہے کہ یہ تینوں اجزار کو یکساں سمجھ کر ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا چاہتا ہے حالانکہ مقننہ حکومت کی جان ہے کیونکہ موازنہ پر اس کو پورا اختیار رہے۔

حقیقت کا پہلو مبادی سیاسیات جلد دوم میں اس نظریہ کے متعلق حقیقت کا پہلو بھی پیش کیا گیا ہے جو دلچسپی کیلئے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"اس نظریہ میں جو حقیقت مضمر ہے وہ یہی ہے کہ مختلف اعضار حکومت کے مابین ایک حد تک تقسیم کار کر دیا جائے تو قانونِ قدرت کے مطابق ہر عضو کیلئے اپنے متعلقہ امور کو بہ حسن و خوبی انجام دینے کا موقع حاصل ہو جائے گا لیکن یہ خیال کہ یہ تقسیم کار ایسا مکمل ہو سکتا ہے کہ ہر عضو حکومت کو دوسرے سے واسطہ ہی نہ رہے سراسر غلط ہے اس لئے کہ ان کے مابین کہیں نہ کہیں تماس ہونا لازمی ہے۔ مانٹیسکیو کے نظریے ہی کی برکت ہے کہ امریکہ کی اکثر ریاستوں میں عادلوں کا تقرر انتخاب عامہ کے ذریعے سے ہوتا ہے اور اس طرح جو رشوت چلتی ہے وہ اس عظیم الشان مملکت کے ماتھے پر گویا کلنک کا ٹیکہ ہے۔ اب اگر عام انتخاب نہ ہوگا تو یا تو یہ جماعت عاملہ عادلوں کا تقرر کرے گی ورنہ ادارۂ مقننہ اور جماعتِ مقننہ کے تقرر میں بھی اسی قسم کی خرابیاں ممکن ہیں جیسے عام انتخاب کی صورت میں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ممالک میں عادلوں کے تقرر کا اختیار جماعت عاملہ ہی کو دیا جاتا ہے۔ اس اصول کی ترویج کی وجہ سے دنیا کی دستوری حکومتوں کی دو شقیں ہو گئی ہیں۔ ایک وہ

ممالک جہاں کابینی یا ذمہ دار حکومت رائج ہے جیسے انگلستان، فرانس، کنیڈا، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا یعنی جہاں مجلس کابینہ جو جماعت عاملہ کے سرگروہوں پر مشتمل ہوتی ہے جماعت مقننہ کے سامنے ذمہ دار و جواب دہ ہوتی ہے اور اس کے اکثر افراد اسی جماعت مقننہ کے افراد میں سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ ممالک جہاں صدارتی یا غیر ذمہ دار حکومت رائج ہے جیسے ممالک متحدہ امریکہ اور کثیر دوسری امریکی مملکتیں یعنی جہاں مقننہ کا جماعت عاملہ کے تقرر یا برخاستگی پر مطلق کسی قسم کا قابو نہیں ہوتا دوسرے معنوں میں پارلیمنٹی ملک میں جماعت مقننہ، جماعتِ عاملہ کے ہر فعل کی بازپرس نہیں کرتی اور اکثر ایسے معاملات جیسے جنگ، صلح، فوج کی دیکھ بھال، عام انتظامات، ملکی خارجی معاملات وغیرہ کو جماعت عاملہ کی صوابدید پر چھوڑ دیتی ہے۔ وہاں ایسے ملکوں میں بھی جہاں غیر ذمہ دار حکومت رائج ہے جماعت مقننہ یا اس کا کوئی جزو بہت سے عاملانہ امور میں دخل رہتی ہے مثلاً ممالک متحدہ امریکہ میں مجلس سنات کے سپرد اعلے عہدہ داران جمہوریہ کا مواخذہ کیا گیا ہے جس میں جماعت مقننہ کا دوسرا جزو یعنی دارالنائبین بمنزلہ مستغیث کے ہوتا ہے اور جہاں تک محاصل کا تعلق ہے جماعت عاملہ کے رکنِ اعلیٰ کو قوانین پر حق امتناع حاصل ہوتا ہے خواہ وہ کیسا ہی کمزور یا محدود کیوں نہ ہو اور ہر ملک کے ہر محکمہ کو اندرونی تنظیم کے لئے قواعد بنانے اور ان کی تعمیل کرانے کا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔"

محمد یوسف زئی متعلم سال سوم

قطعہ

گرم اشکوں سے، سرد آہوں سے — راز دل آشکار کرتا ہوں
پھونک کر خود ہی آشیاں اپنا — برق کو شرمسار کرتا ہوں

صفی الدین صدیقی متعلم سال دوم

توازن تاریخ وحدیث

آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں علوم و فنون کے جو آثار دکھائی دے رہے ہیں اعتراف کرنا ہوگا کہ یہ ان الوالعزم قابل قدر ہستیوں کی یادگاریں ہیں کہ جنہوں نے تخیل اور تعصب کی راہ سے ہٹ کر علمی اور فنی خدمتوں کو ارتقائے بنی نوع انسان کے لئے ایک محکم اساس تصور کیا جن کے پائیدار نقوش سے دنیا کی مختلف قومیں اپنی اپنی منزل کی راہ تلاش کر رہی ہیں۔ ان علوم میں فن تاریخ کا ہم پر بڑا احسان ہے کہ جس کی بدولت ہم نے کھوئے ہوئے اشخاص اور واقعات کو پایا۔ تمدن قدیم اور تہذیب کہن کا سراغ لگایا۔ ان کے علمی اور فنی کارناموں سے دریافت کئے، قوموں اور ملکوں کی حالتیں معلوم کیں، گزرے ہوئے واقعات سے نتائج اخذ کئے، مستقبل کو ماضی پر قیاس کیا۔

اس معنی سے فن تاریخ کو دیگر علوم پر بڑی اہمیت اور برتری حاصل ہے۔ ہر قوم اور ملک کے سنجیدہ افراد نے ہر زمانہ میں اس کا استقبال کیا۔ اختلاف عقائد اور مذاہب کے باوجود ہر ایک نے اس کی بات مانی۔ اسی بناء پر علمی گروہوں میں بحث و نظر کے مواقع پر کسی صحیح تاریخی واقعہ سے استشہاد قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس قدر اہمیت اور عظمت فن تاریخ کو کیوں حاصل ہوئی۔ میں ابھی ابھی اس طرف اشارہ کرچکا ہوں کہ یہ مرتبہ اس کو اس لئے ملا کہ اس کے بیان کرنے والوں نے بنی نوع انسان کی فلاح وبہبود کی خاطر عصبیت سے کنارہ کش ہوکر آنے والی نسلوں کو گذری ہوئی قوموں کے حالات اور واقعات سے روشناس کرایا کہ وہ ان میں فکر ونظر سے کام لے کر اپنی زندگی کی تعمیر میں اس نقشہ کو پیش نظر رکھیں ۔ اگر مورخین کا یہ احسان نہ ہوتا تو محض فکر ونظر کی راہ سے اس گم شدہ منزل کا پتہ چلانا ناممکن تھا۔ پھر اس فن کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب "مخبر عنہ" کی حیثیت ارفع واعلٰے ہو۔ اور واقعات کے بیان کرنے والے بھی بلحاظ اخلاق واعمال ناقابل جرح متصور ہوں اور خود نفس خبر بھی کسی ایسی حقیقت کا پتہ دے رہی ہو کہ جس کے انکار کی کوئی عقلی وجہ بھی نہ ہوسکتی ہو۔ بتایئے کہ ایسی خبر کی تصدیق اور ایسے واقعہ کی تسلیم میں کیا کسی ذی شعور انسان کو کچھ بھی تردد ہوسکتا ہے۔

آیئے آج ہم ذرا اسی کا جائزہ لیں گے کہ کس کس قسم کے اخبار درایتہً بھی مان لینے اور تسلیم کرلئے جانے کے لائق ہیں۔

میرے اس مقالے کا موضوع "توازن تاریخ وحدیث" ہے اور آج کی صحبت میں اسی پر کچھ بحث کی گئی ہے کہ اگر تاریخی واقعات قابل تسلیم اور لائق حجت قرار دیئے جاسکتے ہیں تو روایتی اصول پر اخبار حدیث اس سے پہلے مان لینے اور قبول کرلئے جانے کے مستحق ہیں۔ اگر حدیث صحیح کے تسلیم کرنے میں توقف ہوسکتا ہے تو پھر دنیا کے ہر تاریخی واقعہ کے ماننے میں بھی تردد ہوسکتا ہے۔

ذیل کے چند نظریے اس حقیقت کے مزید انکشاف اور ارباب علم وبصیرت کے غور وتدبر کے لئے پیش کرتا ہوں کہ جن میں ادنے تامل سے آپ کو حدیث اور تاریخ کے توازن میں نمایاں فرق محسوس ہوگا۔ کہ حدیث کا مرتبہ روایتہً اور درایتہً تاریخ سے بہت بلند وبالا ہے۔

(۱) تاریخ قوموں اور ملکوں کے واقعات، قبائل اور افراد کے شخصی حالات، امن اور جنگ کے نقشوں، حوادث اور انقلابات عصر کے تذکروں کا نام ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موضوع میں جتنی وسعت ہوگی واقعات میں اسی قدر تکثر اور تشتت پایا جائے گا اور مورخ کی اثباتی ذمہ داریاں بڑھتی جائیں گی۔ بر خلاف

اس کے موضوع کی تحدید، واقعات کا اختصار اثبات دعویٰ میں زیادہ محفوظ اور مصئون ثابت ہوتا ہے ۔ یہی فرق تاریخ اور حدیث میں ہے ۔ تاریخ میں قوموں کا تذکرہ ہوتا ہے قوم ہزاروں افراد کے مجموعہ کا نام ہے اس میں ملکوں کے حالات درج ہوتے ہیں اور مختلف حصوں کے احوال پر مختلف حیثیتوں سے بحث ہوتی ہے لیکن حدیث کا تعلق نہ کسی قوم سے ہے نہ کسی ملک سے بلکہ ایک قوم اور ایک ملک کی ایک ایسی اُلوالعزم عظیم المرتبہ ذات سے ہے کہ جس کے اعلیٰ اخلاق، تقویٰ، حسن عمل، صدق، دیانت کا اعتراف اسلام کے نہ ماننے والوں کو بھی ہے ۔ ظاہر ہے کہ وہ واقعات جن میں تکثر اور انتشار ہو اور وہ بلحاظ موضوع کے وسعت بھی رکھتے ہوں وہ ان واقعات کے کبھی ہم پلہ نہیں ہوسکتے جن میں موضوع محدود ایک ذات خاص ہو ۔ اُلجھی ہوئی کثیر قول کے بیان اور ایک واحد مشہور ہستی کے حالات قلم بند کرنے میں بڑا فرق ہے ۔ اس نقطہ نظر سے بھی اخبار احادیث کو واقعات تاریخیہ پر برتری اور فوقیت حاصل ہے (اقتباس امامی گیلانی)

(۲) کسی زمانہ میں بھی تاریخی واقعات کا مدوّن کرنا کسی خاص قوم اور فرقہ نے مخصوص نہیں رہا اور نہ اس کی تدوین کبھی کسی قوم اور فرقہ میں جزو مذہب سمجھی گئی ۔ یہ واقعہ ہے کہ انسان جس چیز کو جزو مذہب اور عبادت تصور کرتا ہے وہ اس کے اخذ و قبول میں نقل و بیان میں غایت درجہ حزم و احتیاط کام میں لاتا ہے اور جس چیز کو محض ایک علمی خدمت سمجھتا ہے اس کے دل میں کبھی وہ احترام اور اہمیت پیدا نہیں ہوتی جو جزو مذہب سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے ۔ ناقلین حدیث گو نقل روایت کو عبادت تصور کرتے تھے لیکن حسن عقیدت سے واقعات کو رنگ دے کر مبالغہ سے کام لینا یا واقعہ کے کسی جزو کی غلط نسبت کو ایک نوع کا کفر خیال کرتے تھے ۔ تاریخ کی تدوین کبھی بھی اس اعتقاد و تصور پر نہیں ہوئی ۔ یہی ایک فرق تاریخ اور حدیث کے مرتبہ کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہے ۔ (بتذۃٌ فی مناظر حسنہ)

(۳) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخ کی تعمیر عموماً ایسی بنیادوں پر ہوتی ہے جو خود بہ نفسہ مستحکم نہیں ہوتیں ان کا ماخذ بیشتر آثار قدیمہ یعنے کتبات، کھنڈر، برتن، مورتیں، سکے اور کچھ شہرت یافتہ مصدق اور غیر مصدق خبریں اور افواہیں ہوتی ہیں ۔ مورخین اپنے ظن، قیافہ، قیاس اور اپنے اصول مفروضہ پر اُن کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ دنیا ان کی محنتوں اور کوششوں کی قدر کرتی ہے ۔ معدوم سے موجود کو غنیمت سمجھ کر اُن کو

قبول کرلیتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ وہ فن تاریخ کا ایک ناقابل انکار حصّہ سمجھ لیا جاتا ہے (تدوین حدیث) ۔
حدیث کی بنیاد اس نوع کے استنباط اور تخیل پر نہیں رکھی گئی محض قیاس اور ظن کو مدارِ حکم نہیں قرار دیا گیا۔ اس کے زرین اصول یہ ہیں کہ "جو واقعہ بیان کیا جائے اُس کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریکِ واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریکِ واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے کون لوگ تھے، کیسے تھے، کیا مشاغل تھے، چال چلن کیسا تھا، حافظہ کیسا تھا، سمجھ کیسی تھی، ثقہ تھے یا غیر ثقہ، سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بیں، عالم تھے یا جاہل (سیرت النبی) اس قسم کے جزئیات کا پتہ لگانے کیلئے سیکڑوں اور ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اس طلب و جستجو میں صرف کر دیں۔ ایک ایک شہر، گاؤں در گاؤں صعوبت سفر برداشت کرتے ہوئے پھرے۔ راویوں سے ملے اُن کے متعلق ضروری معلومات فراہم کئے جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود تھے ان کے ہمعصر دیکھنے و ملنے والوں سے حالات دریافت کئے۔ کیا کوئی شخص تاریخ کے کسی اہم سے اہم واقعہ میں یہ اہتمام و نظم دکھلا سکتا ہے۔ اب تک تاریخ نے ان منازل کو عبور نہیں کیا۔

(۴) مورخین عموماً معلومات فراہم کرکے اُن کو لکھ لیتے ہیں خود واقعات یا ان کے بیان کرنے والوں کے حالات پر انہیں تنقید مقصود نہیں ہوتی لیکن رواق حدیث کہ ان مورخوں نے واقعات کو پوری صحت کے ساتھ لیا اور پھر ہر راوی کو پرکھا۔ ان متابع اور شواہد ڈھونڈے۔ جس بات میں جس حصّہ میں ذرا بھی شبہ ہوا اس کو ظاہر کیا۔ جس راوی میں جو سقم نظر آیا اس کو بیان کیا۔ کسی کی جلالتِ شان، کسی کا زہد و تقویٰ اظہارِ حق کے لئے مانع نہ ہوا۔ جرح اور تعدیل کے اصول مرتب کئے۔ کھوٹا اور کھرا الگ الگ کر دکھایا۔ فن اسماء الرجال کی تدوین انہیں تصورات کے تحت عمل میں آئی ہے جس کی بدولت آج کم و بیش ایک لاکھ انسانوں کے حالات کتب رجال میں محفوظ ہیں۔

کسی واقعہ کی صحت کا مدار اگر صرف روایتی اصول پر قرار دیا جائے تو تاریخ تو تاریخ دنیا کا کوئی مذہب بھی اپنی کسی مذہبی روایت کو (مسلمانوں کے علاوہ) اپنے بانیٔ مذہب سے ثابت نہ کر سکے گا کہ قبولِ روایت کی ٹھوس، محیر متزلزل، بنیادی چٹان قصرِ اسلام کے سوا کسی کے محل میں نہیں۔ اسلام کا یہ کھلا اعجاز ہے کہ "رجال کے جواہر ریزے اُس کے سوا کسی اور کے خزانہ میں نہیں۔ ہر ہر راوی کے اخلاق و اعمال، دیانت، تقویٰ، حفظ، ضبط، تفقہ،

علم ضعف و نسیان اس نوع کے تفصیلی حالات کتب اسماء الرجال میں موجود ہیں۔

جرمنی کے مشہور ڈاکٹر اسپرنگر جو عربی داں فاضل ہیں جنہوں نے "اصابہ" کی تصحیح کی ہے اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ " نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری اور نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو" (سیرت النبی)

اس معیار سے بھی اگر حدیث کو جانچا جائے گا تو حدیث کا پلہ تاریخ سے بھاری ہوگا۔

(۵) یہ حقیقت بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں کہ جس واقعہ سے جتنی گہری دلچسپی ہوتی ہے اس کے بیان کرنے میں انسان فطرتاً اسی درجہ کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ دنیا کی کوئی تاریخ ایسی مثال نہیں پیش کرسکتی۔ کہ کسی ذات کے ساتھ نسل آدم کو ایسی عقیدت گرویدگی دلچسپی رہی ہو جیسی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے ساتھ تھی۔ واقعۂ حدیبیہ میں ہے کہ عروہ بن مسعود کو ان کی قوم نے اپنا نمائندہ بنا کر حضور اکرم کی خدمت میں روانہ کیا۔ وہ واپس آکر اپنی قوم قریش سے کہنے لگے کہ تم کس قوم کا مقابلہ کر رہے ہو۔ میں نے قیصر و کسریٰ نجاشی جیسے جلیل القدر جاہ وحشم والے سلاطین بھی دیکھے لیکن خدا کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسا بادشاہ نہ دیکھا۔ ان کے جاں نثاروں کا ادب و احترام کا یہ حال ہے کہ نہ وہ اپنے سردار سے نظر ملاتے ہیں نہ اُن کے آگے بہ آوازِ بلند بات کرتے ہیں۔ جب کسی کام کے لئے کہا جائے تو امتثالِ امر کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔ (الدین) درحقیقت صحابہ کرام اپنی جان و مال سب کچھ آپ کے آگے پیش کر چکے تھے۔ ایسی ذاتِ اطہر کے واقعات کو ان جاں نثاروں نے جس توجہ اور احتیاط کے ساتھ محفوظ کیا۔ کیا تاریخ اس نوع کا کوئی ایک واقعہ پیش کرسکتی ہے۔

(۶) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مورخین عموماً واقعات میں اپنی رائے بھی شریک کر دیتے ہیں اور بعد میں ان کی وہ رائے خود تاریخ کا ایک ورق بن جاتی ہے۔ رائے میں غلطی کا امکان ہے خصوصاً ایسی صورت میں کہ بُعد زمانی اور بُعد مکانی بھی ہو۔ واقعات کا بیان مشاہدہ پر مبنی نہ ہو۔ صحابۂ کرام کی زندگی کا مطالعہ کرنے والوں پر یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کی ذرا سی آمیزش بھی معصیت کبریٰ سمجھتے تھے۔ اس رخنہ کا انسداد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرمانِ اقدس

سے فرمایا "من کذب علیّ متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار" کہ جس نے دانستہ مجھ پر جھوٹ بولا اس کو چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔ اس وعید اور تہدید کے مدنظر رواۃ اسلام نے نقل و قبول روایت میں بہت ہی احتیاط برتی یہ نہیں کہ جو بات بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی وہ مان لی۔ بخاری اور مسلم اور ابو داؤد میں ایسی روایتیں ہیں کہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہما نے بعض راویوں کی روایت اس وقت تک قبول نہ فرمائی جبتک ان لوگوں نے اس پر شہادت نہ پیش کی۔ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے ایک عورت نے جو میت کی دادی ہوتی تھی میراث کا دعوے کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس باب میں مجھے کوئی روایت نہیں ملی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے شہادت دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصّہ دلایا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے واقعہ کی نوعیت کے لحاظ سے تنہا ان کی شہادت کافی نہ سمجھی مزید شہادت طلب کی جب محمدؓ بن مسلمہ نے مزید شہادت ادا کی تو آپ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت قبول فرمائی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ ابوموسیٰ اشعری آپ سے ملنے آئے۔ تین دفعہ اجازت طلب کی حضرت عمرؓ کی مشغولیت مانع جواب ہوئی وہ واپس چلے گئے۔ بعد میں جب حضرت عمرؓ کو ان کے لوٹ جانے کا علم ہوا تو حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بلوا بھیجا اور واپسی کا سبب پوچھا حضرت ابوموسیٰ اشعری نے روایت سنائی کہ تین دفعہ کی اطلاع کے بعد اذن نہ ملے تو واپس ہو جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس روایت پر گواہ لاؤ ورنہ میں تم کو سزا دوں گا جب اس پر شہادت پیش کی گئی تو تسلیم کر لیا (سیرت النبی) شہادت کے باب میں محدثین نے تو فقہا سے بھی زیادہ احتیاط کی ہے۔ اگر کسی شخص نے عمر بھر میں ایک بار دروغ بیانی سے کام لیا پھر تائب ہو گیا تو ہمارے فقہائے کرام اس کی شہادت قابل قبول قرار دیتے ہیں لیکن محدثین کے پاس یہہ ساقط الاعتبار رہے بلکہ وہ تو متہم بالکذب کی بھی روایت قبول نہیں کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ وہ بعض صورتوں میں راوی سے حلف تک لے لیتے تھے۔ ترمذی باب ما جاء فی الصلوٰۃ عند التوبہ میں حضرت علیؓ کا یہ قول نقل ہے کہ اذا حدثنی رجل منی

اصحابہ استحلفتہ فاذا حلف لی صدقتہ۔

بعض صحابہ کی احتیاط تو اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ انھوں نے روایت کرنا ہی چھوڑ دیا تھا اگر کرتے بھی تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے کہ اس طرح یا اس کے مثل یا جیسا بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا عمرو بن میمون نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہ واقعہ ذکر کیا ہے کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا کبھی یہ کہتے نہیں سنا کہ انہوں نے یہ کہا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا۔ ایک دن اثنائے کلام میں ان کی زبان سے بے ساختہ یہ نکل گیا کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح فرمایا" بس یہ کہتے ہی سر جھکا لیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ گریبان کھلا، پریشان حال رو رہے ہیں اور یہ کہہ رہے کہ حضور نے یوں فرمایا یا اس سے کچھ زیادہ یا اس سے کچھ کم یا مثل اس کے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت عثمان الفاظ حدیث بیان کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مسلم میں حضرت علی رض کا یہ قول نقل ہے کہ مجھے یہ گوارا ہے کہ آسمان مجھ پر ٹوٹ پڑے لیکن یہ گوارا نہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف کوئی غلط نسبت کروں۔

یہی احتیاط نقل روایات میں طبقۃً بعد طبقۃٍ چلی آئی۔ بڑے بڑے محدثین کوئی روایت بلا سند نقل نہ کرتے تھے۔ امام زہری ایک دن سفیان بن عیینہ کو ایک حدیث مع سند سنانے لگے۔ سفیان بن عیینہ نے امام زہری کے علم وفضل دیانت وتقوے کے مدنظر فرمایا کہ سند سنانے کی ضرورت نہیں اصل متن حدیث سنا دیجئے۔ یہ سنکر فرمایا کہ کیا تو بلا زینہ چھت پر چڑھ سکتا ہے (تدریب الراوی)

ائمۂ حدیث نے معمولی معمولی شبہات پر حدیثیں قبول نہ کیں۔ امام بخاری نے تدلیس کے شبہ پر بکثرت روایتیں ترک کردیں۔ امام احمد بن حنبل، امام مسلم اور ابو داؤد نے احادیث کے بہت بڑے ذخیرہ سے بہت تھوڑی حدیثوں کا انتخاب کیا۔ اس تفصیل سے میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ قبول روایت میں جو احتیاط و اہتمام اسلامی روایتوں میں کیا گیا ہے تاریخ کے ابواب اس سے عاری ہیں۔

(۷) یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ مورخین اور وقائع نویس کبھی کبھی دنیوی جلب منفعت اور حصول عزوجاہ کی خاطر واقعات قلم بند کرتے ہیں۔ سلاطین اور امراء نے جو تاریخیں لکھوائی ہیں وہ حکومت کے

اثر سے نہ بچ سکیں۔ اعتدال پسندوں کے قلم بھی لغزش کھا گئے۔ واقعات کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا کہ حقیقت کا چہرہ ہی مستور ہو گیا۔ متحارب اقوام کی تاریخیں میرے اس دعوے کی شہادت دیں گی۔ لیکن رواۃ حدیث دنیا طلبی کے لئے اس کو نہ لیتے تھے۔ ایک واقعہ بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا کہ جس کا مقصد حصولِ دنیا ہو یا حکومت کے دباؤ اور اس کی ترغیب یا ترہیب اور شدائد سے متاثر ہو کر رواۃ حدیث نے کچھ بھی مداہنت کی ہو۔ وہ حکومت کی طاقتوں سے ٹکرا گئے لیکن حق کے ساتھ باطل کی ذرا سی آمیزش کبھی کسی حال گوارا نہ کی۔ ہمارے آئمہ میں سے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے تذکرے پڑھ جائیے میرے دعوے کی شہادتیں دستیاب ہوں گی۔

پھر جن نفوس قدسیہ کے تصوّر میں دنیا حیفۃ و متاع غرور تھی جس میں سے وہ گذرتے تھے لیکن ٹھہرتے نہ تھے اور جو اپنی ضرورتوں پر دوسروں کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے تھے اور جن کی ہر قسم کی ایثار و قربانی کی مثالیں موجود ہیں اور ان کی بابت یہ وہم ہی نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے دنیا طلبی کے لئے کوئی روایت گڑھ لی ہو اور وہ دین کی راہ سے دنیا میں داخل ہونا چاہتے ہوں۔

پھر جس روایت کی بنیاد خدا پرستی نہیں، ہوا اور زر پرستی پر ہو وہ کبھی وہ مرتبہ نہیں پا سکتی جس کی اساس تقویٰ اور صداقت پرستی ہو۔ آج بھی انصاف پسند دل اور حق شناس نگاہیں تاریخ اور حدیث میں یہ کھلا فرق محسوس کر سکتی ہیں۔ مورخین کے پیش نظر ایسی کوئی تحدید نہ تھی کہ وہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتے۔ ان مقدمات کو پیش نظر رکھنے کے بعد کیا یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اصل "اسلامی تاریخ" جس کا دوسرا نام "حدیث" ہے جس ضبط اور اہتمام تدین اور صداقت پر محفوظ ہوئی دنیا کی کسی قوم اور ملک اور مذہب کی تاریخ کو یہ مرتبہ نہیں ملا۔

ابتک جو کچھ کہا گیا یہ تو تھا اس کا ایک ایجابی پہلو اس کے ساتھ اس کا سلبی پہلو بھی پیش نظر رہے تاکہ اصل حقیقت کے سمجھنے میں کوئی اشتباہ نہ رہے۔

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض واعظوں کے حکیمانہ نصائح یا حکماء کے مقولوں یا قرآن عزیز کے احتمالات اور ان سے مستفاد ہونے والے معانی یا اسرائیلیات یا تابعین کے اقوال کو حدیث سمجھ

لیا گیا۔ ابن عساکر دیلمی ابن حبان کنز العمال میں ایسی مرویات ملیں گی۔ اگر اس قسم کے ذخیرے پر کسی اعتبار و حیثیت سے کچھ کلام کیا جائے اور اس میں کوئی سقم نظر آئے تو اس کا اثر میرے دعاوی پر نہیں پڑ سکتا کہ درحقیقت اس نوع کی ساری روایتیں مفہوم حدیث سے خارج ہیں خواہ وہ بظاہر کتنی ہی اچھی باتیں ہوں لیکن وہ حدیث نہیں۔ مخالفین کے بیشتر اعتراضوں کا منشار و ماخذ اسی قسم کی روایتیں رہی ہیں۔

انہیں اندیشوں کی بنا پر علما ء فن روایت محدثین نے چند اصول و ضوابط احادیث کے پرکھنے اور صحیح کو غیر صحیح سے ممتاز کرنے کے لئے وضع کئے ہیں جن میں سے چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جن کو علامہ ابن جوزی اور ملا علی قاری اور حضرت شاہ ولی اللہ علیھم اللہ تعالیٰ علیہم نے بھی اپنی اپنی تصنیفات میں ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً یہ کہ

(۱) جو روایت عقل سلیم کے خلاف ہو۔ وہ حدیث نہیں جیسے بیان کیا جاتا ہے کہ عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز تھا۔

(۲) جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔ وہ بھی حدیث نہیں مثلاً یہ کہ محمد اور احمد جس کا نام ہو وہ آگ میں داخل نہ ہوگا حالانکہ نجات کا دار اعمال پر ہے نہ کہ نام پر۔

(۳) اسی طرح وہ روایت جو مشاہدہ کے خلاف ہو حدیث نہیں ہو سکتی جیسے دھوپ میں رکھے ہوئے پانی کے استعمال سے برص پیدا ہوتا ہے۔

(۴) یا جو روایت نص قرآنی کے خلاف ہو وہ بھی حدیث نہیں مثلاً یہ کہنا کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے۔

(۵) یا جس روایت میں تھوڑی سی عبادت پر بے اندازہ ثواب کا وعدہ ہو جیسے من صلی رکعتین فلہ سبعون الف دار و فی کل دار سبعون الف بیت و فی کل بیت سبعون الف سریر و علی کل سریر سبعون الف

(۶) یا جس روایت میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو جیسے من تکلم کلام الدنیا فی المسجد

فاحبط اللہ اعمالہ اربعین سنۃ۔

اس نوع کے اور دیگر اصول بھی محدثین نے لکھے ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ احادیث کے لینے میں جو احتیاط محدثین کو تھی وہ تاریخ تو تاریخ کسی اور مذہبی کتاب میں بھی نہیں کی گئی

یہ ایک واقعہ ہے کہ دنیا میں یہ عمل در آمد رہا ہے اور آج بھی ہے کہ جو بات قرائن اور شہادتوں کی بنا پر غلط اور وضعی ثابت نہ ہو اس کو دنیا صحیح تسلیم کرلیتی ہے۔ عدالتوں میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ کا دامن بھی اس سے نہ بچ سکا۔

لیکن محدثین نے نہ صرف قرائن اور شہادتوں کو دیکھا بلکہ جبتک اُن کے سارے راویوں کو پرکھ نہ لیا اور ان کے حفظ و ضبط، تقوی، ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کو نہ جانچ لیا۔ ان کے اخلاق و اعمال نہ معلوم کرلئے، اور روایت کے سارے پہلوؤں پر ناقدانہ نظر نہ ڈال لی اس وقت تک ان کو اپنی کتاب میں جگہ نہ دی اور ساتھ ہی ان روایتوں کا درجہ اور مرتبہ بھی بتلا دیا کہ یہ روایت اس پایہ اور مرتبہ کی ہے۔

کیا تاریخ نے اپنے سارے ابواب میں ان منازل کو طے کرلیا ؟

(۹) محدثین اصولِ تنقید میں اتنے سخت تھے کہ یورپ کے مایۂ ناز عالم سر ولیم میور جیسے نقاد کو بھی ان کی معقولیت کے آگے بادلِ ناخواستہ جھکنا ہی پڑا اور بالاخر وہ یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوگئے کہ محدثین نے اپنے اصول تنقید میں اتنی احتیاط برتی کہ انہوں نے سو حدیثوں میں سے (۹۹) روایتیں قبول نہیں کیں۔ گو وہ اس طرح حق میں بھی باطل کا ایک شوشہ چھوڑ ہی گئے اور در پردہ دبی زبان سے یہ کہہ گئے کہ بے شمار جھوٹی حدیثیں گھڑی جاتی ہیں۔ ان کے اس ضمنی دعوے میں کتنی صداقت ہے یہ ایک مستقل بحث ہے جس کو میں یہاں طول دینا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ حقیقت خود ان ہی کی شہادت اور اعتراف سے عیاں ہے کہ محدثین کا معیار تنقید بہت سخت تھا کہ جس میں خلافِ واقعہ بات داخل ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ دنیا کی ساری قوموں کو بلا تخصیص مذہب و ملت مسلمانوں کی اس علمی خدمت پر ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے ایک ایسی تاریخ مرتب کی جس پر عمل کرنے سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے

جو انسانی زندگی کے سارے شعبوں میں مشعل ہدایت ہے۔ حدیث نے نہ صرف انسانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح کی بلکہ ان کی علمی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی، تمدنی، ہر قسم کی بگڑی ہوئی حالتوں کی کایا پلٹ دی جس کا یہ اثر ہوا کہ عرب کے وہ جاہل بدوی جو کھڑے کھڑے پیشاب کرتے تھے، عقائد اور اعمال کی گندگیوں میں دھنسے ہوئے تھے وہ اس اسلامی تاریخ کو عملی طور پر قبول کر لینے کے بعد دنیا کو تہذیب اور شائستگی اور تکمیل انسانیت کا درس دینے لگے۔ اسی تاریخ کے علم و عمل کی بدولت جو کچھ نہ تھے وہ سب کچھ ہوگئے رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

میرے ان خیالات کا قطعاً یہ منشا نہیں کہ تاریخ کا سارا دفتر کھوکھلی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہی ڈھانچہ ہے جس میں مغز و روح کچھ نہیں۔ ایسا نہیں بلکہ ان ہڈیوں کی آواز بھی اثر رکھتی ہے۔ اس آواز سے بھی کتنے سوئے ہوئے جاگ اٹھے اور بھٹکے ہوئے مسافروں نے ان کے نشانات سے گم شدہ منزل کا پتہ پایا۔ میں اپنے مقالہ کے شروع ہی میں مورخین کی علمی کوششوں اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کا اقرار صالح کر چکا ہوں۔

میرا مقصد کسی علم و فن کی خدمتوں پر بار وا حملہ کرنا نہیں ہے بلکہ کچھ علم و دانش والوں کو یہ بتانا ہے کہ جس علمی بے تعصبی کا تم بھرتے ہو اور جس کا یہ بانگ دہل اپنی تقریروں، مقالوں اور صدارتی خطبوں میں اعلان کرتے ہو کیا یہی علمی بے تعصبی ہے کہ روم اور ایران، جرمن اور انگلستان، فرانس اور یونان، امریکہ اور جاپان کی تاریخیں تو پڑھی اور پڑھائی جائیں اور ان کے ذکر اور حوالوں کو مایۂ فخر و ناز سمجھا جائے اور روایات کا وہ عجیب و غریب سرمایہ جس کا نام "الحدیث والآثار" جو روایۃً درایۃً بہر پہلو قابلِ وثوق و اعتماد اور لائق قبول و عمل ہے اور جس کے مطالعہ سے دل میں نور اور دماغ میں روشنی پیدا ہو اور جس پر عمل کرنے سے اخلاقِ انسانی کی تکمیل ہوتی ہو خصوصاً مسلمانوں کیلئے تو "ذالک الکتاب" کے بعد ان کی دینی اور دنیوی زندگی کیلئے اساسی سرچشمہ کی حیثیت رکھتا ہو اس سے رخ پھیر لیا جائے ایسے لوگوں نے درحقیقت علم کا مرتبہ ہی نہیں پہچانا۔ وہ کھوئے گئے اور تعلیم پاکر۔ ذالک مبلغھم من العلم

نوٹ:۔ سیرت کی کتابوں میں جو روایات درج ہیں ان میں تنقیدی پہلو پر کچھ زیادہ توجہ نہیں

کی گئی اس لئے ان میں بعض معیاری روایتیں نہیں ہیں۔ ارباب سیرت کے پیش نظر بالعموم یہی تصور تھا کہ واقعات کو جمع کر لیا جائے۔ الفاظ کی نگہداشت، راویوں کے حالات کی چھان بین ان کا وظیفہ نہ تھا اسی بنا پر فن سیرت کو ایک علیحدہ مستقل فن قرار دیا گیا۔ اس کو بعینہٖ "فن حدیث" سمجھ لینا غلطی ہے گو فن سیرت کا ماخذ حدیث ہی ہے، باوجود اس کے وہ عین حدیث نہیں جیسے فقہ کو کوئی شخص قرآن یا حدیث نہیں کہہ سکتا حالانکہ فقہ قرآن اور حدیث سے ماخوذ ہے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنے کے بعد مخفی خدشات خود بخود زائل ہو جاتے ہیں۔

رہا الفاظ حدیث کا اختلاف و تعارض یہ اصل واقعہ کی صحت کے منافی نہیں۔ روایتوں میں عموماً جو اختلاف ہے وہ نوعیت کا نہیں کہیں اختیارات کا ہے جن کو متعارض سمجھ لیا گیا۔ کہیں واقعات کے تقدم اور تاخر کا صحیح علم نہ ہونے پر ان کو دو متضاد حدیثیں تصور کر لیا گیا۔ کہیں رخصت اور عزیمت میں فرق نہ کرنے سے لغزش پیدا ہوئی۔

ان گتھیوں کو بھی بہت ہی خوبی کے ساتھ علماء ائمہ نے سلجھایا ہے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

محمد علی
لکچرار شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ

فکر و نظر

شعر کے پردے میں ہے پوشیدہ ساری کائنات
شعر سے بڑھ کر نہیں دُنیا میں تفسیرِ حیات

ننھے فہیم سے

(نئی نسل کے نام اپنے دو سالہ بچے کے توسط سے)

میرے بچے، میرے دل کی آرزو، میرے فہیم — میرے ارمانوں کی دنیا، میرے گلشن کے شمیم
یہ تری معصوم نظریں، یہ ادھوری گفتگو — زندگی گم ہو کے بن جاتی ہے جس میں آرزو
یہ تری بھولی ادائیں، یہ ترے ننھے قدم — جن کو چھو کر ٹوٹتے ہیں فکر و غم کے پیچ و خم
یہ تری ضد، یہ شرارت، یہ تری فرمائشیں — رحمتوں کی بارشیں ہیں رحمتوں کی بارشیں

اس جہنم زار کو جنت بنائے جا ابھی
اس سکونِ عارضی میں مسکرائے جا ابھی

تجھ کو کیا معلوم دنیا ہے ابھی تک ناتمام — جستجو منزل کی کر دیتی ہے اکثر بے مقام
تجھ کو کیا معلوم مرگ و زیست کی یہ کارگاہ — کس طرح بنتی ہے نغمہ، کس طرح بنتی ہے آہ
یہ جہانِ آب و گل یہ کائناتِ خیر و شر — اک فریبِ جستجو ہے، ایک احساسِ نظر
کچھ نگاہوں کے تصور، کچھ تمناؤں کے خواب — ڈالتے ہیں اور بھی ہستی پہ دھوؤں کے نقاب
چند مبہم آرزوئیں، چند دھندلے سے خیال — زندگی کو کھینچتے ہیں اپنی جانب بن کے جال
تجربوں کی ناتمامی، حوصلوں کی گمرہی — بخشتی ہے عقل کو بر خود غلط سی آگہی
ایک مجبوری ہے جس کو مل گئے کچھ اختیار — اک قفس ہے جس میں گھٹ کر مسکراتی ہے بہار

لیکن اے نورِ نظر اس دہر میں اہلِ نظر
توڑ کر ہر حد کو کر لیتے ہیں پیدا رہ گزر

ان کی پیشانی کی شکنوں میں تبسم بے قرار
ان کے عزم و شوق کو مجبوریوں پر اختیار

زندگانی آزماتی ہے ڈرا سکتی نہیں
ان کی شمعِ عزم کو آندھی بجھا سکتی نہیں

جن کو منزل ہی کی دھن ہو وہ ٹھہر سکتے نہیں
جن کو جینے کا سلیقہ ہو وہ مر سکتے نہیں

کوندتے ہیں برق کے کاندھے پہ چڑھ جاتے ہیں وہ
سخت طوفانوں میں دریا بن کے بڑھ جاتے ہیں وہ

ان کے قبضہ میں جوانی' ان کے قبضہ میں حیات
رفتہ رفتہ اُن کی ہو جاتی ہے ساری کائنات

میری دنیا عقل کی اندھی نگاہوں کا جنوں
میری دنیا میں مگر تیرے تبسم سے سکوں

میری دنیا اک مسلسل فکر و غم میں بے قرار
میری دنیا میں مگر تجھ سے بہشتوں کی بہار

میری دنیا اک مسلسل رات اک بے صبح شام
میری دنیا میں مگر تجھ سے سحر کا اہتمام

تو سمجھ سکتا تو سمجھاتا کہ فکرِ روزگار
کس طرح آسودگی سے چھین لیتی ہے بہار

مجھ کو اتنا آزمایا ہے فریبوں نے کہ آج
زندگی کو دے رہا ہوں صرف سانسوں کا خراج

میں نے ہنس ہنس کر چھپائے اپنے دل کے اضطراب
میں نے ڈالے آنسوؤں پر مسکراہٹ کے نقاب

زور ہوتا ہے جو غم کا مسکرا دیتا ہوں میں
دل دھڑکتا ہے تو اکثر گنگنا دیتا ہوں میں

میں وہ برگِ گل ہوں جو جھڑتا ہوا پایا گیا
اور خزاں کی گود میں پڑتا ہوا پایا گیا

میں وہ دریا ہوں جو کہساروں میں ہو محوِ خرام
جس کے پیچ و تاب کو شاداب ساحل ہو حرام

میں وہ ٹوٹا ساز ہوں جس میں نہیں اب کوئی تار
جس کو کہہ سکتے ہیں نغموں کی جوانی کا مزار

لیکن اپنے آپ سے مایوس ہو سکتا نہیں
موج سے ڈر کر سفینے کو ڈبو سکتا نہیں

رک کھڑا جاتا ہوں لیکن پھر سنبھل جاتا ہوں میں   رک کے بڑھتا ہوں تو اور آگے نکل جاتا ہوں میں
اب بھی میرے حوصلوں کو گرم سانسیں ہیں نصیب   دور ہو کر بھی میں اپنی زندگی سے ہوں قریب
اب بھی اپنی آرزوؤں پر ہے اتنا اعتبار   میں اگر چاہوں تو ہر آنسو میں کھنچ آئے بہار
خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکتا ہوں میں   اس قفس میں گلستان تعمیر کر سکتا ہوں میں
میری یہ منزل، جہاں میں ہوں ہے اک ایسا مقام   جس جگہ کچھ سوچنے کو راہ رو کرلے قیام
ریت اور کیچڑ میں اپنی ناؤ کھے سکتا نہیں   دیر تک میں دلدلوں کا ساتھ دے سکتا نہیں

اب تو ڈھلتی چھاؤں ہوں میں دوپہر کی دھوپ میں
دن وہ آئیں گے نظر آؤں گا اصلی روپ میں

دیکھ کر تجھ کو جو خوش ہوتا ہے اُس کے غم نہ دیکھ   میرے بچے تو ابھی دنیا کے پیچ و خم نہ دیکھ
چاہتا ہوں میں کہ تیری زندگی کا ہر مقام   ہر قدم پر دے تجھے اک کامرانی کا پیام
میں اگر جیتا رہا دیکھوں گا تجھ کو میرے لال   اس بلندی پر جسے کہتے ہیں سب اوجِ کمال

میرے خوابوں میں جو پوشیدہ ہے وہ تعبیر دیکھ
میرے ارمانوں میں اپنی زیست کی تصویر دیکھ

صاحبزادہ میکش (عثمانیہ)

ستارے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

رات رات بھر جاگ جاگ کر کس کو گیت سناتے ہو
چپ چپ رہ کر، جھل مل جھل مل کس بھاشا میں گاتے ہو
جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو

رات اندھیری کالی کالی کس سج دھج سے آئی ہے
میرا کیا ہے میں سودائی تاروں کی رسوائی ہے
جاؤ جاؤ چھپ جاو ستارو

ہم جس نگری میں رہتے ہیں وہ نگری کیا دیکھو گے
تم جس بستی میں بستے ہیں وہ بستی کیا دیکھو گے
جاؤ جاؤ چھپ جاو ستارو

آپ تن آسانی راج دلارے میں وحشی طوفان بدوش
میری دنیا، جدل مسلسل آپ کی دنیا سیل خموش
جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو

جھوم جھوم کر، گرج گرج کر بادل بن کر چھانا ہے
دھرتی کے پیاسے ہونٹوں میں امرت رس برسانا ہے
جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

مخدوم محی الدین ایم اے (عثمانیہ)

عید کی رات

دور افق کے گھاٹ پر لیتا ہے چاند انگڑائیاں — چرخ کے سینے پہ جالے تن رہی ہے کہکشاں
اک سنہری محویت فطرت پہ ہے چھائی ہوئی — ایسی رنگیں ہے فضا جیسے بہار آئی ہوئی
چھاگلیں سی بج رہی ہیں خامشی کے پاؤں میں — چھیڑتے ہیں گیت تارے چاندنی کی چھاؤں میں
غرق ہیں موسیقیوں میں بربطِ گیتی کے تار — گر رہی ہے آسماں سے زندگی کی آبشار

عید بن کر کوئی آیا ہے کنارِ زیست میں
کیا کہوں کتنی بہاریں ہیں بہارِ زیست میں

دوش پر آنچل کا پرچم، زلف لہرائی ہوئی — اک مسلسل مسکراہٹ ہونٹ پر آئی ہوئی
میکدہ در میکدہ بدست آنکھوں کی شراب — باغ اندر باغ نکہت پاش عارض کے گلاب
فرق کے ایمن میں رقصاں بجلیوں کے کوہ طور — وادیٔ گیسو میں لرزاں ظلمتِ شامِ نشور
بجلیاں بن بن کے لہرانے کی رُت آئی ہوئی — آتشِ جذبات بھڑکانے کی رُت آئی ہوئی
لغزشِ رفتار میں شبنم کے رم کی داستاں — جنبشِ گفتار میں جنت کی کلیاں گلفشاں
نوجوانی دعوتِ صد رنگ و بو دیتی ہوئی — دل کے ساگر میں امیدیں کشتیاں کھیتی ہوئی

رنگ در آغوش ہے ہنگامۂ ذوقِ نظر
کروٹیں لیتے ہیں نغمے زندگی کے ساز پر

جذب ہوتی جا رہی ہے زندگی میں زندگی — رفتہ رفتہ پھول بنتی جا رہی ہے ہر کلی
ہو رہے ہیں گم فضاؤں میں ستارے ٹوٹ کر — دل کی ہر دھڑکن سے نغمے بہہ رہے ہیں گھُٹ کر

کیا کہوں اس سال کس انداز سے عید آئی ہے
اک نیا عنواں جوانی پیشکش کو لائی ہے

علی احمد بی اے (عثمانیہ)

قوتِ آرزو

نہاں ہے ایسی قوت آرزو میں　　ہے خود مطلوب تیری جستجو میں
کشش کا یہ بھی ہے قانون اے دل　　برس کر آئے قلزم آبجو میں

تمنائے ثمر رکھتا تھا دانہ　　نکالا خاک سے اس نے خزانہ
تراش اس میں سے جو صورت تو چاہے　　ہے سنگِ ناتراشیدہ زمانہ

ہے ذوقِ روح سے قالب کی تعمیر　　جہاں ہے یہ تمناؤں کی تصویر
تمنا میں ہے ایسی قوتِ خلق　　کہ وہ خود ڈھالتی ہے اپنی تقدیر

کہیں لعل اور کہیں ہے سنگ فطرت　　چڑھا لیتی ہے تیرا رنگ فطرت
نکال ایسا ترانہ سازِ دل سے　　ہو تیری جاں سے ہم آہنگِ فطرت

یقیں پیدا کر اور ایمان پیدا　　اسی سے ہوگا سب سامان پیدا
طلب جس چیز کی دل میں قوی ہے　　وہ کر لیتا ہے خود انسان پیدا

خلیفہ عبدالحکیم

غزل

دل کے آئینے میں اک داغ تمنا دیکھتے
عشق بن کر حسن میں چھپتے، تماشا دیکھتے

حسن بے تمثالِ یوسف ہے، نہ ہے ذوقِ بلند
ورنہ ہر جا عشق بلقیس و زلیخا دیکھتے

پاسِ وضعِ عشق نے ہم کو ڈبویا ہمنفس
رہ گئی حسرت کہ ان کا روئے زیبا دیکھتے

خود ہی ہو جاتیں عیاں ان پر مری بدمستیاں
جب مجھے وہ بے نیاز جام و صہبا دیکھتے

منحصر کچھ لالہ و گل پر نہیں حدِ نظر
ماہ و انجم میں بھی ان کا روئے زیبا دیکھتے

بے نیازِ ہر تماشا ہو گئے ہیں ہم کمال
سامنے وہ آ بھی جاتے تو انہیں کیا دیکھتے

رحیم الدین کمال متعلم سال چہارم

لمعات

فارغ تھا کشاکش جہاں سے — آسودہ ملال این و آں سے
نظروں سے حجاب ہٹ گئے تھے — سورج سے سحاب چھٹ گئے تھے
ڈالی جو نظر جہاں پہ میں نے — اس اپنے نئے مکاں پہ میں نے
دیکھا کہ وہ جگمگا رہا تھا — اپنے میں نہ وہ سما رہا تھا
لیکن یہ مرا ظہور تھا سب — نور اپنا قریب و دور تھا سب
خورشید کہیں چمک رہا تھا — تھا فیض گرفتہ داغ دل کا
محتاج تھا التفات کا چاند — منہ پھیر لیا تو ہو گیا ماند
گردوں پہ دمک رہے تھے تارے — یہ تھے مری آہ کے شرارے
تھی چشم غضب سے برق پیدا — ٹھوکر سے تھے زلزلے ہویدا
رقت نے بنائے تھے سمندر — نخوت کا تھا جوش ان کے اندر

دریا تھے کہیں بہاؤ میں جو — تھا طبع رواں سے فیض ان کو
چشمے تھے زمین سے اُبلتے — بیتابیٔ دل کا راگ گاتے
رنگینیٔ طبع سے گلستاں — شاداب تھے اور گل بداماں
غنچے مرا راز کہہ رہے تھے — شوخی سے مری چٹک رہے تھے
کہتے تھے یہ سب ہے نور تیرا — باعث ہے تو یہ ظہور تیرا

سید نور محمد نور متعلم سال دوم

مفلس ہندوستان

آہ اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں — آسماں بھی کر رہا ہے تیری حالت پر فغاں
پڑگئیں پھیکی خیابانوں کی تیری رونقیں — مٹ گئیں تیری فضاؤں کی سہانی رنگتیں
ہوگئیں سونی تری جاہ و حشم کی محفلیں — وہ نہ لیلائیں رہیں باقی نہ ان کی محملیں
اک زمانہ تھا رضائے دہر تھی تیری رضا — اک سکون و کیف سے لبریز تھی تیری فضا
واہ کیا انصاف کا پیرِ فلک تیرے ہے دور — ہم تہی ساغر رہیں ساغر بہ لب محفل میں اور
روند ڈالا اب تو گردش نے جہاں آباد کی — کھل سکیں آخر نہ تجھ سے بندشیں صیاد کی
ہند کی تصویرِ نکبت کھینچنا مقصود ہے — یاں بصارت ہے۔ بصیرت قلب کی مفقود ہے
ایک دوشیزہ جو فاقوں سے بہت بیتاب تھی — بیقراری میں مثالِ ماہیِ بے آب تھی
تھی نمایاں اک اُداسی چہرۂ غمناک سے — یاس و حسرت تھی ہویدا دیدۂ نمناک سے
عارضِ رنگیں پہ خشکی کی لہر نکھری ہوئی — جیسے کھلتے پھول پر کچھ گرد سی بکھری ہوئی
تھے خط و خالِ سبک پژمردہ حالت نیم جاں — خشک ہونٹوں سے عیاں تھی رنج و غم کی داستاں
آرہے تھے غش پہ غش اور چال اٹھلاتی ہوئی — جیسے موجِ بحر ہو ساحل پہ بل کھاتی ہوئی
اس قدر مجھ پر ہوا ہے اس کے حلیہ کا اثر — دل بھر آیا اس کی دردانگیز صورت دیکھکر

تا نہ ہر توے شود یک رشتہ و یک ریسماں
نیست امیدے کہ منزل می رسد ایں کارواں

سلطانہ عزیز رفعت۔ سال سوم

نقیب

دامن میں آندھیوں کے سسکتا ہوا دیا
ٹوٹے ہوئے رباب کی مغموم سی صدا
بجھتے ہوئے شباب کی سہمی ہوئی ندا

کچھ سایے رینگتے ہوئے بزم خیال میں
الجھی ہوئی حیات امنگوں کے جال میں
شانِ جمال بھی ہے "خدائے جلال" میں

مدھم سے کچھ نقوش ہیں اس رہگذار میں
کچھ شمعیں جل رہی ہیں اندھیرے دیار میں
امید جاگتی ہے دلِ بیقرار میں

تعمیر کر رہا ہوں تمناؤں کے محل
طوفان آرہا ہے ارے ناخدا سنبھل
او مستِ خواب حلقۂ گرداب سے نکل

اے پیکرِ شباب یونہی مسکرائے جا　　تھم تھم کے زندگی کے ترانے سنائے جا

سردار - الہام متعلم سال دوم

فریب تخیل

جو نیچی نگاہیں کسی نے اٹھادیں — مرے دل کی دنیا میں شمعیں جلادیں
پکارا جو دل نے کہ مسجود آیا — مری حسرتوں نے جبینیں جھکادیں
اس انداز سے ہم کو ظالم نے دیکھا — شب ہجر کی وارداتیں بھلادیں
ان آوارہ کلیوں سے اللہ سمجھے — مجھے دیکھ کر زیر لب مسکرادیں
نسیم سحر ہم رکاب اُن کے آئی — گلستاں نے پھولوں کی شاخیں جھکادیں
خرابات ہے اور بدمستیاں ہیں — بہاروں نے ظلمت کی راہیں دکھادیں
فضا مرتعش ہے، جہاں مرتعش ہے — پپیہے نے کچھ ایسی تانیں لگادیں
ٹپکنے لگے اشک آنکھوں سے پیہم — سُنانی کی جو کچھ تھیں باتیں سُنادیں
جو تم ہنس پڑے ہنس پڑا سارا گلشن — فضائیں بھی کچھ سوچکر مسکرادیں
اُسی سے ہے دامن بچا کر نکلنا — ہر اک گام پر جس نے آنکھیں بچھادیں

فریب تخیل یہ کب تک، کہاں تک
ستاروں نے بھی اپنی شمعیں بجھادیں

عزیز احمد (عثمانیہ)

ناکام تمنّا

پُردرد ہے ناکام تمنّا کی کہانی　　نالے ہیں کبھی اور کبھی اشک فشانی
چہرے سے ہویدا ہے عجب یاس کا عالم　　ہر لحظہ نیا رنج ہے ہر لحظہ نیا غم
سینے میں نہاں دردِ محبت کے پھپولے　　آہوں میں نکلتے ہیں تڑپتے ہوئے شعلے
آنکھوں میں مچلتی ہوئی جذبات کی دنیا　　ہونٹوں پہ عیاں عرضِ محبت کی تمنّا
تفسیرِ غمِ عشق ہیں بہکی ہوئی باتیں　　دیوانہ بناتی ہیں اسے چاندنی راتیں
رفتار میں ہر گام میں گرنے کا گماں ہے　　معلوم نہیں منزلِ مقصود کہاں ہے

اِس پیکرِ ناشاد کی حالت کوئی دیکھے
اِس خانماں برباد کی حالت کوئی دیکھے

عظیم الدّین محبت ایم اے (عثمانیہ)

غزل

کچھ اس ادا سے نگاہیں نیچی کئے ہوئے مسکرا رہے ہیں
لطافتِ نوبہار بن کر نفس نفس میں سما رہے ہیں

سمجھ رہا ہوں ہنسی کو اُن کی وہ ظرفِ غم آزما رہے ہیں
وہ ہستیٔ شوق نامکمل کو اور مکمل بنا رہے ہیں

الٰہی یہ انقلاب کیسا کہ وہ بھی آنسو بہا رہے ہیں
ستم تو یہ ہے مجھی کو میرا فسانۂ غم سنا رہے ہیں

نہ جانے کیوں آج بن گئی ہے خود آپ اپنی نظرہی پردہ
فضائیں بہکی سی ہیں، وہ شاید نقاب رخ سے اٹھا رہے ہیں

اگر مکمل ہے نظم ہستی تو آپ پھر کس لئے یہ خاکہ
بنا بنا کر مٹا رہے ہیں مٹا مٹا کر بنا رہے ہیں

وہ ناشناسِ لطافتِ غم فلک نشیں مہر و ماہ و انجم
ظفرؔ وہ کیا جانیں ہم جو بارِ امانتِ غم اٹھا رہے ہیں

منظفر الدین ظفرؔ بی ۔ ۲ (آخری)

غزل

یہ نئی نئی محبت، یہ نیا نیا زمانہ — وہ نہ سن سکیں گے شاید مرے درد کا فسانا
وہ حدیثِ شوق کہنا، مرا حالِ غم سنانا — دمِ صبح موجِ نکہت، کبھی اس طرف جو جانا
ترا حسن کافرانہ، مرا ذوقِ شاعرانہ — ان ہی دو سے ہے مرتب غمِ عشق کا فسانا
کفِ آرزو میں گویا، کئی طور جل رہے تھے — مجھے یاد ہے ابھی تک وہ کسی کا مسکرانا
تیری بے رخی سلامت، مری آہِ نیم شب سے — نہ پلٹ سکا مقدر نہ بدل سکا زمانا
ابھی آزما رہا ہے، مجھے خوفِ نا امیدی — ابھی بجلیوں کی زد میں رہے میرا آشیانا
وہ حجابِ نور بن کر بھی نہ چھپ سکے نظر سے — تجھے اے جنوں مبارک سرِ طور آنا جانا

مرا دل وصی ہے اتنا طربِ آشنائے حرماں
کہ خوشی بھی ڈھونڈھتی ہے مری موت کا بہانا

محمد وصی احمد ایم اے (عثمانیہ)

سُورَج

دیکھو سورج نکل رہا ہے!

بدل گیا ہے رنگ گگن کا   رنگ بھوم کا بدل رہا ہے
آسمان   زمین

(۱)

اندھا ہو کر چلا اندھیرا   کہیں ڈھونڈنے اپنا ڈیرا
ادھر اوشا کی اجیالی میں   بال کرن دل مچل رہا ہے
صبح کی سُرخی

(۲)

پھوٹی نوجیون کی کلیاں   ہل مل کھیل رہیں رنگ رلیاں
آشاؤں کے مکھ سے آنچل   ہٹ کر سر پر سنبھل رہا ہے
سمتوں

(۳)

دور ہوئی نشچل نیروتا   ناچ رہی جگ مگ چنچلتا
غیر متحرک خاموشی   حرکت
ست رنگی سفید تاروں سے   راگ سنہرا نکل رہا ہے

(۴)

جاگ اٹھی سپنوں کی دنیا   چہک رہی پرانوں کی چڑیا
زندگی
اٹھتی لہروں میں پرکاش کی   دلِ نویگ کا اچھل رہا ہے
روشنی   نیا زمانہ

پنڈت ونشی دھر ودیالنکار لکچرار ہندی جامعہ عثمانیہ

ولی

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد دکن کی دعوت پر یہ نظم کہی گئی تھی جو یوم ولی کے خصوصی مشاعرہ میں نشر کی گئی تھی۔ نیّر)

لطافتوں کا خزانہ لٹا دیا تو نے — سرور و کیف کا دریا بہا دیا تو نے
ترے سخن میں ہے رنگینیاں بہاروں کی — کلی کلی کو غزلخواں بنا دیا تو نے
ستارے ہنس پڑے شمس و قمر بھی جھوم گئے — کچھ ایسا عشق کا جادو جگا دیا تو نے
ترے ضمیر میں تھی برقِ مضطرب کی تڑپ — ہر ایک گام پہ طوفاں اٹھا دیا تو نے
ہر ایک شعر میں دنیائے رنگ و بو ہے ترے — سب اہلِ دید کو حیراں بنا دیا تو نے
اے راز دارِ بصیرت اے خوگرِ غمِ عشق — حریمِ زیست کا پردہ اٹھا دیا تو نے
تری نگاہ کا اعجاز و فیضِ عام یہ تھا — کہ ذرہ ذرہ کو اک دل بنا دیا تو نے
نشاطِ غم کی قسم، لطفِ آگہی کی قسم — طلسمِ دیر و حرم کو مٹا دیا تو نے
سنا کے زمزمۂ عشقِ آتشیں لے میں — چمن کو شعلہ بداماں بنا دیا تو نے
اسیرِ گیسوئے اردو ہوا زمانہ تمام — جمالِ شاہدِ ایراں بھلا دیا تو نے
زبانِ شعر میں سمجھا کے رازِ میخانہ — شرابِ شوق سے بیخود بنا دیا تو نے
ندا یہ عرش سے آئی زہے نصیب ترے — جہاں کو جادۂ منزل بتا دیا تو نے
نگاہیں ہو گئیں خیرہ سخنوروں کی ولی — کمالِ فن کا وہ جلوہ دکھا دیا تو نے

محمد علی نیّر ایم۔اے (آخری)

کلیّہ کی خبریں

مجلس ادارت

انجمن اتحاد کی غیر موجودگی کے باعث برادرانِ جامعہ کی سماجی مصروفیتوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ لیکن یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان کے علمی کاوشوں کا ترجمان "مجلہ عثمانیہ" کی اشاعت پر اس کا کوئی اثر نہ پڑسکا اور جامعہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مجلسِ ادارت کا انتخاب مسابقت کی اساس پر عمل میں آیا ہے توقع ہے کہ آئندہ اس طریقہ کو زیادہ موثر اور مفید بنایا جائے گا۔

ذیلی بزمیں

انجمن اتحاد کی عدم موجودگی کے باوجود برادرانِ جامعہ نے ذیلی بزموں کے توسط سے علمی اور معاشرتی جدوجہد کو جاری رکھا' اس سلسلہ میں ہم خاص طور پر بزم معاشیات کی ٹھوس اور عملی کاوشوں کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ تعمیری کام دوسری بزموں کے لئے بھی قابل تقلید ہے بزم معاشیات کے مخلص اور جواں ہمت کارکنوں اور اس کے صدر و معتمد کو ہم دلی مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کی انتھک کوششوں سے کلیہ میں انجمن امداد باہمی کا قیام عمل میں آیا۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی انجمن ہے۔ اس انجمن کا سرمایہ پانچہزار روپیے کے ایک ہزار مساوی حصص سے فراہم کیا گیا ہے' طلباء کے علاوہ جن اساتذہ کرام نے گہری دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے وہ بجا طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ صدر شعبہ معاشیات ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی کی رہنمائی میں ہم کو یقین واثق ہے کہ یہ انجمن دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گی۔

بزم قانون

بزم قانون کے صدر جامعہ کے ہونہار سپوتوں میں ہیں، بزم قانون کے علمی اور معاشری جلسوں سے انجمن اتحاد کی عدم موجودگی کی بڑی حد تک تلافی ہوئی ہے۔ اس بزم کی جانب سے طلبا اور اساتذہ میں تماس پیدا کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں وہ جامعہ کی ایک اہم ضرورت ہے۔

بزم اُردو

اُردو، فارسی، مرہٹی اور طبیعیات کی بزموں کی جانب سے مختلف جلسے منعقد کئے گئے۔ بزم اُردو نے اردو کانفرنس کا انعقاد کرکے ایک اچھا اقدام کیا ہے اس کے لائق صدر مولوی محمد علی صاحب تیر کی کاوشوں سے توقع ہے کہ اس نوعیت کے جلسے آئندہ بھی جاری رہیں گے۔ جامعہ کو چونکہ اردو سے خاص مناسبت ہے اس لئے بزم اُردو کو بھی اس جامعہ میں خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیے اس کے دائرۂ عمل کو وسیع کرکے اُردو زبان کے معیار کو بلند کرنے کا ہر قدم مستحسن ہوگا۔ ان کانفرنسوں میں اضلاع کے طلباء کو بھی مدعو کیا جائے تو زیادہ مفید نتائج برآمد ہوں گے۔

علمی کانفرنس

اقامت خانہ الف کی جانب سے علمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس سلسلہ میں مولوی قاضی کبیر الدین صاحب بی۔ اے نے نہایت ہی سرگرمی اور جوش سے حصہ لیا۔ اور اس کانفرنس کی کامیابی کا سہرا ان کے سر ہے۔ اقامت خانہ ب میں بھی اسی نوعیت کا ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی نے اقبال کی شاعری کے ایک خاص اور دلچسپ پہلو (فلسفۂ موت) پر روشنی ڈالی اس ضمن میں مولوی سید عبدالرزاق صاحب قادری جعفری ام۔ اے نائب مودب اقامت خانہ ب کی کوششیں لائق ستایش ہیں۔ اس نوعیت کے جلسوں سے اساتذہ اور قدیم و جدید طلباء میں تماس پیدا کرنے کے علاوہ علمی فضاء کو

خوشگوار بنانے میں بھی مدد ملتی ہے ہمیں توقع ہے کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ لیکن ہماری رائے ہے کہ پہلی میقات ہی میں ایسے جلسوں کا سلسلہ ختم ہو جانا چاہئے تاکہ امتحانوں کی تیاری پر اس قبیل کی مصروفیتوں سے کوئی مخالف اثر نہ پڑے۔

بی۔کام اور جغرافیہ

اس سال جامعہ میں دو اور شعبوں کا اضافہ کیا گیا ہے، بی۔کام کی جماعت مولوی امتیاز حسین صاحب کے تفویض کی گئی ہے اس جماعت کی افادیت سے ہر شخص واقف ہے۔ جنگ کی کٹھن آزمایش سے گزرنے کے بعد دنیا میں جو اہم تغیرات ہوں گے ان کا اقتضا یہ ہے کہ حیدرآباد کو اہم تجارتی مقام حاصل کرنے کے لئے ابھی سے سازگار حالات پیدا کئے جائیں مولوی امتیاز حسین صاحب سے قوی توقع ہے کہ وہ عثمانیین کی اس راہ میں صحیح رہبری کر سکیں گے۔

سید احمد صاحب بی اے۔ بی ٹی (علیگ) ام۔ اے (اڈنبرا) ایف۔ آر۔ جی ایس مہتمم تعلیمات ضلع نظام آباد کی منتقلی جغرافیہ کی لکچراری پر عمل میں آئی ہے۔ صاحب موصوف کو جغرافیہ سے خاص شغف ہے۔ تعلیم و تدریس کا بھی آپ کو وسیع تجربہ ہے۔ لندن کی رائل جغرافیکل سوسائٹی کی جانب سے آپ کو فلوشپ کا اعزاز بھی دیا گیا ہے۔ عثمانیین کے لئے آپ کی خدمات یقیناً مفید ثابت ہوں گی۔

ترقی و تقرر

مولوی یونس وفاقانی صاحب سے وہ براہ ران جامعہ اچھی طرح واقف ہیں جنہیں صاحب موصوف کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے آپ شفیق استاد اور مہربان مودب کی حیثیت سے طلباء برادری میں ہمیشہ مقبول رہے ہیں اب آپ کو نائب معین امیر جامعہ کے پرسنل مددگاری کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے ہم کو توقع ہے کہ اب پوری برادری کو صاحب موصوف کے وسیع اخلاق سے مستفید ہونیکا

موقع ملیگا۔ ہم صاحب موصوف کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی جامعہ کے ان چند قابل سپوتوں میں ہیں۔ جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ اُردو ادب میں آپ کی تخلیقی کاوشوں سے طلباء برادری اچھی طرح واقف ہے۔ شعبۂ اُردو کی سینیر لکچراری پر آپ کا تقرر ہم سب کے لئے مسرت کا باعث ہے۔

شعبۂ انگریزی میں لکچراری کی خدمت پر مولوی محمد نعیم الدین صاحب ام۔ اے کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ آپ نے انگریزی ام۔ اے میں اول درجہ کا امتیاز حاصل کیا ہے صاحب موصوف سے ہمیں بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ ہم آپ کی آئندہ ترقی و کامیابی کی خوش آئین توقعات کے ساتھ اپنا پُر خلوص ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔

مولوی حکیم الدین صاحب ام۔ یس سی، مسٹر گنیش پرشاد ام۔ ایس سی اور مولوی اعظم خاں صاحب ام۔ اے کے تقررات بھی ہوئے ہیں۔ ہم ان سب حضرات کو پُر خلوص مبارک باد دیتے ہیں۔

کھیل اور اسپورٹس

کھیلوں میں حاضری کی پابندی نے ان شعبوں میں ایک نئی روح دوڑا دی ہے۔ ٹینس کے سلسلہ میں ہم اس کلب کے صدر محترم ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور معتمد مولوی اشہد خاں صاحب کو ان کی غیر معمولی دلچسپیوں کے لئے مبارکباد دیتے ہیں۔

بین الجامعاتی ٹینس ٹورنامنٹ میں ہمارے کھلاڑیوں نے جنوبی حلقہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ میکنزی ٹورنامنٹ میں جامعہ کے ہر دلعزیز اور مایۂ ناز کھلاڑی محی الدین صاحب قیصر نے حیدرآباد کے بہترین کھلاڑیوں کو شکستیں دیں۔ اور مسٹر وجیہ الدین، مسٹر مقصود، مسٹر رحیم الدین، مسٹر لطف اللہ، اور مسٹر رشید نے بھی

اس سال اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ ہم ان تمام برادران کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ٹینس کلب سے نواب مہدی نواز جنگ بہادر کی دلچسپیاں بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ نے نہ صرف طلباء کو تقسیم انعامات سے سرفراز فرمایا بلکہ کلب کو ایک ایور رولنگ کپ کا بھی عطیہ دیا۔ ہم تمام اراکین کلب کی جانب سے نواب صاحب کی اس ہمت افزائی کے لئے ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔

یہ سال ہمارے کرکٹ کے کھلاڑیوں کے لئے کچھ سازگار ثابت نہیں ہوا۔ سالار جنگ کرکٹ ٹورنامنٹ میں تین گیند انداز کھلاڑیوں کے زخمی ہونے کی وجہ سے کامیابی کا سہرا نظام کالج کے سر رہا۔ سال حال مسٹر آصف علی خاں، مسٹر کفیل احمد محی الدین، مسٹر اصغر، مسٹر شاہد علی خاں، مسٹر حسام الدین اور راجکمار سنگھ وغیرہ نے اپنے بے مثال کھیل سے مقابلہ کو بہت دلچسپ بنا دیا تھا۔ گیند اندازی، بیٹنگ اور فیلڈنگ کا مظاہرہ بھی روایات کا آئینہ دار تھا۔

فٹ بال اور ہاکی کے کھلاڑیوں نے اس سال بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا۔ فٹ بال کلب کے کپتان محی الدین شاہ خاں صاحب اور ہاکی کلب کے کپتان قاضی اقبال احمد صاحب ہاشمی اور معتمد عبدالرحمٰن صاحب نے نہ صرف ان خاص کھیلوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں بلکہ کھیل کے دوسرے شعبوں میں بھی ان کی صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ ہوتا رہا ہے۔ ہاکی اور فٹ بال کی ٹیموں نے بین الکلیاتی مقابلہ میں کامیابیاں حاصل کیں۔ بین الجامعاتی ٹورنامنٹ میں ہماری ہاکی ٹیم حلقہ جنوبی کو جیتنے کے بعد بدقسمتی سے جامعہ پنجاب ٹیم کے مقابلہ میں ناکام رہی۔

سال گزشتہ ہاکی کے بہترین کھیل کے مظاہرہ کے صلہ میں معتمد کلب عبدالرحمٰن صاحب اور مسٹر آغا علی حسن کو کلر دیا گیا۔ ہم ان دونوں اصحاب کی خدمت میں اپنی

پُرجوش مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

والی بال اور باسکٹ بال کے کپتان مسٹر اظہر اور مسٹر محمد علی سجن لال کی کوشش بھی ان کھیلوں کے وقار کو بڑھانے میں بہت مفید ثابت ہوئی ہیں۔

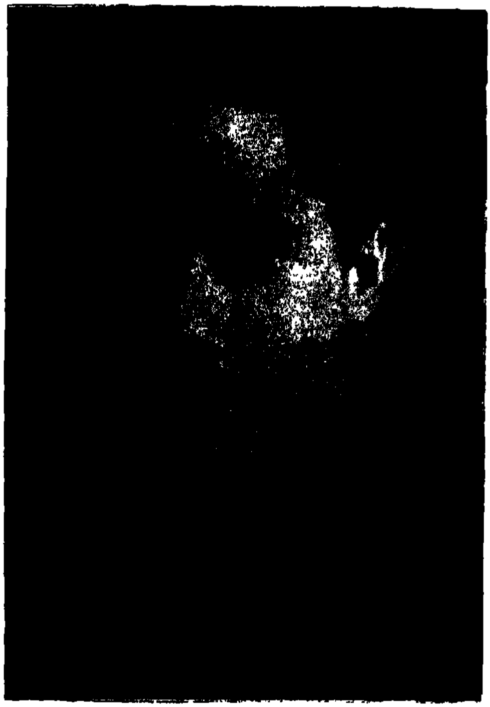
اسپورٹس کے انٹر کالج ٹورنامنٹ میں ہمارے نمائندوں نے گذشتہ تمام سالوں کے مقابلہ میں زیادہ اعزازات حاصل کئے اور تقریباً تمام مقابلوں میں اول آئے۔ اس سلسلہ میں مسٹر محمد علی کپتان، مسٹر اظہر، مسٹر عبدالولی، مسٹر احمد حسین، مسٹر سعادت اور مسٹر مصطفیٰ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مسٹر احمد حسین اور مسٹر مصطفیٰ ہماری جامعہ کے ایک ہونہار نوجوان ہیں اور ہمیں ان سے آئندہ بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ کھیلوں اور اسپورٹس کی کامیابی کا سہرا دراصل مسٹر ثناء اللہ خاں صاحب صدر اسپورٹس کلب، مسٹر عبدالستار اور مسٹر شریف حسن کے سر ہے ہم ان سب حضرات کی خدمت میں اپنا دلی شکریہ پیش کرتے ہیں۔

مجلۂ اتحاد اقامت خانہ (د) میں ایک قلمی مجلّہ مولوی عبدالخالق صاحب کی کوششوں اور دوسرے مقیمین کے تعاون سے جاری ہوا تھا ہم کو یہ معلوم کر کے مسرّت ہوئی کہ مجلّہ اب بھی محمد عبدالقادر صاحب کی ادارت میں حسب روایات جاری ہے۔

آئندہ شمارہ ہماری مادر جامعہ کا جشن سیمیں ماہ بہمن میں منایا جارہا ہے۔ اس موقع پر مجلّہ کا ایک خاص نمبر شائع کرنے کا منصوبہ مجلس ادارت کے پیش نظر ہے جو گزشتہ پچیس سالہ جامعہ کی علمی اور تمدنی جدوجہد کا آئینہ دار ہوگا۔

رحیم الدین کمال ظہیرآبادی

نائب مدیر حصۂ اُردو مجلہ عثمانیہ



مسٹر سید عبدالرشید قریشی ایم - اے (عثمانیہ)

مسٹر رشید قریشی جامعہ عثمانیہ کے مشہور طالع افسانہ نگار ہیں - ان کے افسانوں کے مجموعہ " من کی دنیا " کو جو ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے شائع کیا گیا ہے ، کل ہند مقبولیت حاصل ہوئی ۔ کردار نویسی ، جزئیات کی مصوری ، اور انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی میں انہیں خاص مہارت حاصل ہے ۔ ہندوستان کے مشہور نقادوں نے ان کے فنی کمالات کا اعتراف کیا ہے — (نیر)



Mr. KHAJA HAMEEDUDDIN SHAHID, M.A. (Final),

Managing Editor, The Sabras.

He has a glorious record of literary qualifications to his credit, and he read a paper this year on the Development of Urdu at the All India Urdu Conference held at Bangalore, which was highly appreciated.



Mr. S. M. HYDER RAZA ZAIDI, M. Sc. (Osmania)

Ex-President Science Union

Mr. Zaidi is a brilliant student of Chemistry, and has done research on some important problems of Industrial Chemistry under the auspices of The Hyderabad Scientific and Industrial Research Board. now he has been appointed in our Department of Applied Chemistry

Printed at the

AZAM STEAM PRESS,

Government Educational Printers,

Hyderabad-Dn.

Different games and sports have been drawing an unusually large number of students this season and this, we expect, will help to raise the standard of the games.

N. B.—We hope our readers will excuse us for not giving a fuller resume of the activities our Sports Clubs but it has been with-held for want of space and will appear in our next issue.

Our Magazine.

It is regrettable that inspite of several invitations, the contrbution of the Women's College to our Magazine has invariably been meagre.

We are very thankful to the Pro-Vice-Chancellor, who in spite of his multifurious engagements elsewhere, always found time to listen to matters directly concerned with the Magazine.

It would be unjust, if we do not express our heartfelt thanks to our Adviser Prof. Doraiswami, who was always willing to attend to the affairs of the Magazine with unabated attention.

SAEED AHMAD MEENAI, M.A. (Previous),
Joint Editor.

the year and the Ibne-Hasan Writing Contest was also conducted under its auspices. It also invited Sir Feroze Khan Noon to address the students. The P. V. C. had agreed to the celebration of the College Day proposed by its energetic president Mr. Zaki and Vice-President Mr. Mathur but the idea had to be abandoned due to some unforseen difficulties. It is scarcely possible to express adequately the debt of gratitude this Society owes to Prof. Sherwani who was always a great source of active support and inspiration to this Union.

The Economics Union.

President:—Mr. Ata-ur-Rahman.
Vice-President: Mr. Ghulam Muhammad.
Secretary:—Mr. Hamid Mohiuddin.

The Society was very active during the last academic year. It held several discussion meetings and also conducted an Essay Competition on economic topics. But the highest achievement to the credit of this Union was the inauguration of a Co-operative Sales Store. Here we cannot but record the unremitting labours of Dr. Qureshi and it was, no doubt, very largely due to his enthusiastic endeavours that this proposal initiated by the president and the enthusiastic Secretary of the Union so gloriously culminated.

Sportfolio.

We give our hearty felicitations to Messrs. Asghar and Kafeel on being elected Captain and Secretary of the Cricket Club respectively and we hope that they will spare no effect to justify the trust reposed in them. The Cricket practice has long started and we look forward to a triumphant year for our Cricket eleven.

We are glad to record the appointment of two old Osmanians Messrs. Fakhrul Hasan and Taqi Hashmi as Junior lecturers in Economics in the Osmania College and Chaderghat Intermediate College respectively.

Air Training Corps.

The training of the first batch has long finished and the second batch is quickly being enlisted. We note with satisfaction that the students are displaying keener interest in this direction and the number of applicants this time is greater.

Terminal Examinations.

For some years past there used to be no terminal examinations in our College, but this year with a view to seeing that our students distribute their labours evenly throughout the three academic terms, the authorities have revived the terminal examination.

Inside Our Societies.

The History Union.

President:—Mr. Zakiuddin.
Vice-President:—Mr. Ishwar Raj Mathur.
Secretary:—Mr. Shahid Ali Khan.
Editor:—Mr. Hanumanth Reddi

The last academic year was one of unparalleled activity. With a view to removing the sectarian tendencies, the right of franchise which had hitherto been restricted to the formal members was extended to all History students. The installation meeting was held under the presidentship of Honourable the Finance Member. The Union held ten discussion meetings during

A New Intermediate College.

There being a very great rush of applicants for admission to the Junior Intermediate Class, and in order to give a larger number of students the benefits of higher education, the Chaderghat Government High School has been converted into an Intermediate College. We hope this College will have a great future.

Transfers and Appointments.

Dr. Khalifa Abdul Hakim, Head of the Philosophy Department has proceeded on three years' long leave preparatory to retirement. His departure from our College, is a matter of regret to us. Two traits were manifest in his character. First, his capacity to adapt himself and feel at home in every company and secondly his rollicking sense of humour.

We offer our congratulations to Dr. S. Vaheeduddin who has been appointed Lecturer in Philosophy. Dr. Vaheebuddin is an old Osmanian, who after taking his degree from our University went to Germany and obtained his Doctorate in Philosophy from the University of Marburg.

Dr. Yusuf Husain Khan who was away on deputation is once again in our midst and we welcome him heartily.

The sad demise of Mr. Yousufuddin having robbed the University of its Librarian, Mr. Masood Yazdani has come to fill his place. We welcome him and hope that with his zeal and enthusiasm he will be able to institute necessary reforms in the Library administration and increase its efficiency.

We are glad to record the appointment of two old Osmanians Messrs. Fakhrul Hasan and Taqi Hashmi as Junior lecturers in Economics in the Osmania College and Chaderghat Intermediate College respectively.

Air Training Corps.

The training of the first batch has long finished and the second batch is quickly being enlisted. We note with satisfaction that the students are displaying keener interest in this direction and the number of applicants this time is greater.

Terminal Examinations.

For some years past there used to be no terminal examinations in our College, but this year with a view to seeing that our students distribute their labours evenly throughout the three academic terms, the authorities have revived the terminal examination.

Inside Our Societies.

The History Union.

President :—Mr. Zakiuddin.
Vice-President :—Mr. Ishwar Raj Mathur.
Secretary :—Mr. Shahid Ali Khan.
Editor :—Mr. Hanumanth Reddi

The last academic year was one of unparalleled activity. With a view to removing the sectarian tendencies, the right of franchise which had hitherto been restricted to the formal members was extended to all History students. The installation meeting was held under the presidentship of Honourable the Finance Member. The Union held ten discussion meetings during

A New Intermediate College.

There being a very great rush of applicants for admission to the Junior Intermediate Class, and in order to give a larger number of students the benefits of higher education, the Chaderghat Government High School has been converted into an Intermediate College. We hope this College will have a great future.

Transfers and Appointments.

Dr. Khalifa Abdul Hakim, Head of the Philosophy Department has proceeded on three years' long leave preparatory to retirement. His departure from our College, is a matter of regret to us. Two traits were manifest in his character. First, his capacity to adapt himself and feel at home in every company and secondly his rollicking sense of humour.

We offer our congratulations to Dr. S. Vaheeduddin who has been appointed Lecturer in Philosophy. Dr. Vaheebuddin is an old Osmanian, who after taking his degree from our University went to Germany and obtained his Doctorate in Philosophy from the University of Marburg.

Dr. Yusuf Husain Khan who was away on deputation is once again in our midst and we welcome him heartily.

The sad demise of Mr. Yousufuddin having robbed the University of its Librarian, Mr. Masood Yazdani has come to fill his place. We welcome him and hope that with his zeal and enthusiasm he will be able to institute necessary reforms in the Library administration and increase its efficiency.

COLLEGE CAUSERIE.

The New Academic Year.

The University re-opened after the Summer Holiuays on 30th June 1943. This year the number of applicants seeking admission to the Junior Intermediate class was larger than in previous years and consequently the total number of seats had to be increased.

The Opening Day Ceremony was, as usual, performed by the Vice-Chancellor, Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur and our Pro-Vice-Chancellor in his speech on that occasion summed up the many and diverse activities of our University during the past academic year.

Department of Commerce.

Knowing the part commercial education can play in building up the wealth and prosperity of our State and with a view to rendering our educational system more practical and realistic, a separate department of Commerce has been inaugurated this year and Mr. Imtiaz Husain Khan has been placed in charge of this department. We offer him our hearty congratulations and hope that under his guidance a golden future lies for this new department.

Obituary.

The shocking news of our old librarian, Mr. Yusufuddin's demise, came to us like a bolt from the blue. He appeared so robust and strong that one could scarcely think he would pass away from our midst so soon.

success is beyond doubt. But if in spite of all these efforts you fail to achieve the earthly paradise, curse the hour you were born and quit life through the gates of suicide which is so common in the land of General Tojo.

K. SHAMSUDDIN, B. A. (Final).

sory contraband. So be very liberal in religious belief. If you cannot afford to be an atheist at least be a cosomopolitan so that religion may not hinder your progress.

It is necessary that you should know something about everything, you need not go into details: a superficial knowledge can serve your purpose. You must be well-equipped with ready-at-hand, set answers for the oft-discussed problems of modern society; be always prominent in conversation; for talking too much, instead of revealing emptiness of mind, shows wide knowledge and deep learning.

The cultivation of the habit of favouritism, that is becoming a puppet in the hands of any great personality and propagating his greatness and your intimacy with him, also makes you famous and leads you up. At public places you should be very particu'ar about greeting great men and should avail yourself of every opportunity of speaking to them with a smile of familiarity on your face so that others may admire your relations and influence.

It is also important that you should be in touch with politics, but here you are apt to be led astray; therefore, guard yourself against several pitfalls. You should take only a passive interest in matters political, better if you are in the good books of Government. In peace time labour movements should be your pet aversion but it is paying to be a labour leader during war.

These are the few methods which if adopted can bring success to the social climbers in every department of life, though they have not been put to test, their

sense. This is a time for gaining and retaining popularity so you should be talkative, gay, and good-humoured otherwise your accomplish-ments will not be known and you will lose your chances in life.

The art of camouflage has achieved great success in this war but it is capable of doing wonders if applied to modern society. You should camouflage by representing yourself as wealthy and quite well off so that you may be admired and treated on an equal footing by the aristocrats of society. In this age, poverty is a social crime and a ban on progress. By camouflaging yourself you can feel at home in all circumstances.

Always move in the new-fangled circles and speak of fashionable things, the best topic for light discussion is pictures; the names of Clark Gable, Norma Shearer, Ashok Kumar and Leela Chitnis should be on the tip of your tongue. You should be sober in your tastes and liberal in your ideas which are the signs of enlightenment; you should cultivate a contempt against the poor and a strong passion and sympathy for capitalism. Truth and justice are mere slogans, justice is now a purchaseable commodity and the proclamation of truth, an act of commission; therefore you should not stress these things. Expediential lie already prevails and is quite permissible; it solely rests on you to defend every lie with the shield of expediency.

Rid yourself of staunch orthodoxy for it speaks of regression. Religion has been reduced to the status of a hackneyed and commonplace institution; it is like opium as John Gunther puts it; it is more suited to discussions at dinner tables than to be followed. There is no place for religious persons in modern society; it is like a social blockade in which religiousness is a compul-

The maxim "Honesty is the best policy" has yielded place to "Flattery is the wisest device;" so make it your second nature and flatter every man whom you think useful for your purpose. When you meet a person, always speak on the subject of his interest and pretend to be interested in his discourse and he will be obliged to take interest in you. If you ever happen to meet the editor of a newspaper or a magazine always ta'k of the wide circulation of his paper and the great hold and influence it has on the minds of the readers, praise the high standard of articles and specially the stimulating editorials which have become indispensable for the readers. In this way you can gain his favour and will get a sure chance of finding yourself in print in the next issue. Not only editors but almost every man can be made to melt by means of flattery and when all efforts prove of no avail this device will surely account a victim for you.

Self-respect was a noble quality, no doubt, in the past, but now it is a mere obstacle in the way of progress. Self-respect is no end in itself, it leads to an end, but on the contrary if it comes in the way of progress it is negli gible. In gaining popularity you will have to sacrifice your self-respect by flattering your antagonists and by praising fools, but never mind it for it is not dearer and more precious than popularity. Do not criticise anyone, however loathsome he may be, for by doing this you will be inflicting injury on his feelings; anyhow, by hook or by crook, try to get popular; it will place you on the highway to earthly paradise.

R-servedness makes people the blanks of society; it is considered next to shall owness of mind and want of

A Short-Cut to Paradise.

The reward of numerous self-denials, several voluntary restrictions and a virtuous life is the promise of paradise in the other world. Besides the element of uncertainty in this promise, it is not worth while to receive the benefits of the present monotonous and dry abstinence in the world after death, the merits or virtues of any object become manifest only in the presence of a contrast but this condition is absolutely non-existent in paradise. Every man should get the divine consent and heavenly reward in this very world so that virtue and vice may be discriminated and the reward should be ready at hand, for in this age of gilt-edged securities no one is inclined to lock up his capital for the remuneration accruing to him after a long period of time.

As it is beyond human power to alter this old convention it is more beneficial to concentrate your efforts on the achievement of paradise on earth that is the success of means over ends. The true essentials of earthly paradise are wealth, power, and name; the possessors of which can certainly provide for themselves all the legendary comforts of the divine paradise and thus become superior beings. The world is changing very rapidly; the things which were in Vogue yesterday are stale and worn-out to day. Similarly the methods of achieving greatness, the substitute for paradise, have also changed and only those who can keep pace with the changing world can succeed. With this aim in view, I have depicted some very novel methods of attaining eminence which will prove to be of invaluable help to the ambitious young men who aspire to wordly glory.

of many societies, all of which ceased to function even before they were named. He has lately started writing dramas for the screen and it is one of his proudest boasts that in rejecting one of his plays, a certain little known company of film producers thanked him for his interest in, and appreciation of, their pictures.

The last of our company is a young person of clear-cut features, who takes great interest in jobs peculiarly feminine. He is well dressed very fashionable, indeed, and never goes out before taking a "pan," which serves him as a lipstick. He is a very enthusiastic cinema pedant. The love affairs of screen celebrities and their artistic capacities are his special field of research. He has, in short, lost himself in the film world and has but this one topic to harp on.

To conclude, this attempt of mine should in no way be misinterpreted as a satire on particular individuals or as an effort to expose their limitations, of which almost every individual has only too many in this imperfect world. My only aim is to direct the attention of those of my fellows who have not already tasted its joys to a field of study which has yielded me a world of interest.

"AUTOLYCUS".

of his own superiority over the illustrious writers of old. Buffoonery is his stong point and, provided the necessary opportunities are not denied him, this "doting parrot," as his friends have nicknamed him, bids fair to develop into a very successful clown.

But others await our attention! Here is a thin young man, whom one often sees in a warm suit or sherwani, emerging from Bogul-kunta. slum His gait is a glide and as he glides forward or gracefully leans against a wall or lolls in a chair, he frequently passes a hand over his head to make sure that he has not disturbed his profusely brilliantined hair. You will often see him tightening his belt a hole or two as his waist is even narrower than that of the purely imaginary sweetheart of Oriental poets. He can talk of nothing but girls and affairs of the heart and his delight in relating fanciful love-yarns is both full and genuine. He is naturally a bit shy in the company of men, but talks to every member of the fair sex in a manner far surpassing her own incoquetry and womanly blandishments. He seems to be lost at the very sight of a girl and this singularity of his behaviour proceeds from his deep-seated, but ill-founded, conviction that he is too attractive to escape the amorous attention of any girl. Alas, he has lately deserted us, in search of pastures new and this is a grievous loss to us on account of his enjoyable eccentricities.

Then comes a square-shouldered chap whose ideals are lofty but awkward. He hopes to become a pioneer of Muslim Emancipation someday. His literary taste is somewhat peculiar and his interest in psychological topics is profound and inborn. He has been the founder

Oxford manner and consequently never pronounces a word again which he has mispronounced once. He is, indeed, a poet in the making and you may often catch him trying to pass off as his own verses stolen from some celebrated man of song:

> Wooden phrases cut and dry
> Evermore thy tongue supply

His proudest boast has been that he had "almost secured a first class," in his vernacular at one of his much - talked - of examinations and he honestly takes it to be the most monumental success that human intellect has ever achieved. This unique triumph has, doubtless raised him very high in his own esteem and he really believes himself to be a man of remarkable genius.

He has quite a wide range of acquaintances but none of these is less than forty, from which it would appear that he is a great respecter of gray hairs and cannot put up with the frivolities of youth. Yet, strangely enough, one of his greatest accomplishments is mimicry. He honestly believes himslf to be a real wag and is always busy trying to roast somebody, his elders in particular. Constant indulgence in very bitter criticism has become his second nature and it does not worry him at all whether he has understood what he is criticising or not He takes very great pleasure in delivering never-ending war commentaries, which may well be called "soliloquies," for his audience cannot help thrusting their fingers in their ears, when he starts reeling off his views. He is a great reader of newspapers, so that he is a living index in respect of advertisements. His joy knows no bounds when he points out a misprint in a classical composition, for this adds to his assurance

Tansen, in witness whereof you will often see him reproving Saigal for his unclassical music. He is inclined to dispute anything one may say; for instance, he will wax eloquent by the hour to convince you that the Sun rises in the west. A typical unconscious humorist is he and has been the unwilling cause of so much merriment. If one says so much as "How do you do?" to him, he goes off like a naval gun. To crown all, for the last few months he has been straining every nerve to gain a bride, and this as may be guessed, has given a headache to all his relations, friends and acquaintances. I have heard him speaking incessantly for hours on the essential qualities of a worth-the-having bride. But the long and short of all his inexhaustible rhetoric on this fascinating subject is, that the first and last attraction and virtue of a marriageable girl is a very large dowry. He has not had any success in attaining his heart's desire, but he is one of those determined individuals who believe that their defeats are but additional guarantees of their ultimate triumph.

The next idividual on my list is a bulky person, attired in a fancy sherwani, with big sun glasses ever astride his nose. His walking stick is as inseparable from him as his sun glasses and his manner is both composed and assertive, I had almost said, combative. His gait is a genuine counterpart of the one seen in the "hop-step and jump race." He has merely entered his twenties, but his mien is of one about to complete his three score and ten. His demands in the way of reverence from others are naturally exorbitant and his face worth walking a mile to see, when any one fails to show the respect which is his just due. He is often overheard reading some book aloud in a travesty of the true

Sidelights.

"Autolycus" meets some of our friends.

[Our readers will be delighted to know that, finding his existence in the pages of Shakespeare's 'Winter's Tale' unendurable and monotonous, our jovial friend "Autolycus" has changed his abode. Quitting the realms of mere fancy, he has clothed himself in flesh and blood and promises to adorn the columns of our college Magazine. Wit and humour are, doubtless, the salt of life. Over earnestness is in many cases the fundamental cause of the pessimistic and somewhat defeatist outlook which characterises many young men. Consequently we introduce this new section, as the exclusive province of "Autolycus" who shall write in the vein which is so peculiarly his own, for the special benefit of the most heavily taxed of our readers.]

Saeed.

Hobbies are of various kinds, but the hobby of character-study remains unique in its interest. Following in the footsteps of Mr. Spectator, I have found perpetual delight in reflecting over human charater. In this article I shall endeavour to give genuine and precise sketches of persons I have observed closely enough for my purpose. The task of evaluating their virtues and foibles, I am content to leave to the critical faculties of the readers themselves.

Behold, here comes a thin fellow with a bony, wrinkled face and a neck as stiff as a flagstaff. His laughter is akin to the laughter of a hyæna. Yet he is a musician, too :- an enthusiastic disciple of the great

of my life, shall I stand before thee face to face?........... Under the great sky in solitude and silence.........among hurrying crowds shall I stand before thee face to face?"[1] This vision of God in his poetic inspiration and intuition gives us:

> "The wisdom which is wiser than things known,
> The beauty which is fairer than things seen,
> Dreams which are nearer to eternity
> Than that most mortal tumult of the blood.[2]

Because Tagore withdraws from all conscious selfhood, by that very act he emerges into the busy centre of life's vital forces. In so doing he hears the sound of a ray, sees the hues of a grin, feels the touch of a wail.

> "I hear beyond the range of sound,
> I see beyond the range of sight,
> New earths, and skies and seas around,
> And in my day the sun doth pale his light."[3]

What is this hearing which ears cannot hear and the sight which eyes cannot see? Read Tagore's poetry!

SIDDAYYA PURANIK, B A,
(OSMANIA).

(To be Continued).

1. Gitanjali.
2. Arthur Symons.
3. Henry David Thoreau.

"Some have smiles, sweet and simple, and some a sly twinkle in their eyes. Some have tears that well up in the day-light and others tears that are hidden in the gloom. They all have need for me and I have no time to brood over the after-life."[1] Tagore's poetry is at once a dialogue with Nature and a fountain-head of love for mankind. In this search for reality in Nature and human nature, 'the great heart of man', in this dual aspiration—union with man and union with the universe he transcends all in the breadth and depth of his vision. "Thy world is weaving words in my mind and thy voice is adding music to them."[2] But, 'when one knows thee, alien there is none, then no door is shut Oh, grant me the prayer that I may never lose the bliss of the touch of the one in the play of the many." Tagore loves Life in all its manifestations, the earth, the sky, humanity!

But his universal love is no longer the mystic ectasy that burns the heart and destroy the individuality. It is a communion which holds within it the beauty of external nature and the breath of humanity. His intensity of emotion has mingled with the stream of love that flows through nature and man. His individuality merges in the absolute and yet asserts itself not merely in resignation to, and deep enjoyment of, the divine, but in the spirit of the age he incarnates, the spirit that is prepared to take humanity as its God, but yet assembles within it the depth of the meditation of the Yogin and the ecstasy and love of St. Francis who proclaimed,—"Love is of God!" Again in this dual aspiration—his oneness with humanity and his aloofness from it in solitary saintly life-he stands unique in the galaxy of the 'the unacknowledged legislators of the world." "Day after day, O lord

1. Gardener. 2. Gitanjali.

waves that ripple on beauty's stream[1],' and to play on his own instrument in the 'eternal symphony played on innumerable instruments.' He approached nature which to him was not merely the separated phenomena, but a living personality. This direct communion with nature as a living person, the contact of the two personalies forms the essence of his poetic inspiration. To Tagore, therefore, it is not the details, that have their appeal, but the whole—the whole flowing life and flowing joy. This perception is not a mere biological concept. but a spiritual concept.

In this silent and solitary communion with Nature—" whenever the landscape is immense, the sky unlimited, clouds intensely dense, feelings unfathomable, that is to say where infinity is manifest, its fit companion is one solitary man[2],"—Tagore is face to face with the Universal Life, the Master Musician of the eternal symphony.

"Take me up Master Musician! and make me thy harp.

Let your delectable fingers sweep over my heart-strings and produce divine melody." But Tagore is not a misanthrope. Humanity is as dear to him as God or Nature.

"They kneel down,—the king and the beggar, the saint and the sinner, the wise and the fool—and cry:

"Victory to man, the new-born, the ever-living!"[3] This efflorescence of the Bengali genius exhibits as its dominant tone the glorification of human individuality and human values and Tagore's poetry is resplendent with this.

1. Tagore's own words. 2. Reminiscences. 3. The Child by Tagore.

and gives insight into things. It penetrates through the outer coverings of men and things and makes their inner beings visible to the poet. To Tagore this was a vision of things seen through the inner consciousness, not 'with' the eyes. "What!" it will be questioned, "when the sun rises, do you not see a disc of fire...........?" "Oh no-no! I see an innumerable company of heavenly host crying, 'Holy, holy, holy is the Lord God Almighty!, I question not my corporeal eye......... I look 'through' it and not 'with' it" (1) To such a person the whole world becomes dear. "God gave all men all earth to love (2)." In one moment the poet perceived all the pulsations of activity throughout the world bubbling in a dance of joy and beauty and he heard whistling through them the echoes of a great infinity. One who realises this fundamental unity of life, one who realises that the Great Atman has manifest Himself in the form of all the living beings of the world (*asmin-sarvani-bhootanyat-maivabhoodvijanatah tatra komohah kaha-shoka ekatva manupashyatah* (3)); he has no illusion, no misery.

> "The doors of my heart have been suddenly opened.
> The world has crowded in with embracing hands."(4)

Now, even the poorest soul, even the most trivial episode, the most trifling occurence appeared to him as tossing waves on the surging sea of joy that rocked in the cradle of the universe.

Thus, the voices get inaudible in the air, the dreams in the bosom of the silent mountains, the earliest tidings of the unborn flower, the living hearts and moving voices of various plants invited him to 'fill his eyes with

1. Emerson.
2. A. E.
3. Ishopanishad
4. Gitanjali

mist, one can see the glow of the sun, so through this world of inert matter and living beings he perceived the glowing personality of a super-person whose spontaneous powers were flowing in streams of light and colour and shaping in forms and hues the beautiful world that stood dancing before his eyes. This is his vision, the artists' self-discovery, and mystic self-enlightenment, that gave the key to opening the mystery of microcosom and miacrocosom.

This revelation of his inner consciousness dawned on the poet when he was in his teens! One morning and one evening he stood on the roof of his house and saw the world all bathed in a new beauty.[1] He felt that a black veil was slowly withdrawn from his eyes and the world was floating everywhere in joy and beauty. So long as he carried his own egotism with himself, the world could not appear to him in its true light; now leaving the self aside he could look upon the world, beautiful and joyous, in its true perspective. This was not only a revelation, but, "......... a steady light in the brain,............ a candle upon the forehead............ it was revealed in ecstacy of thought or power in speech, and in a continuous welling up within myself of intellectual energy, vision or imagination. It is the afflatus, or as an ancient scripture says of it, 'the Illuminater or inspirer of the poet, the musician.........and all who work in art.' It is the Promethean fire, and only by mastery of this power will man be able to ascend to the ancestral paradise."[2] Always the face of truth is covered by the curtains of gold; (*hiranmayena - patrena - satyasiyapihitam-mukham*[3]); such enlightenment removes the curtain

1. Reminiscences.
2. A. E. – The Candle of Vision.
3. Ishopnishad.

Universal Life. "We feel that this world is a creation; that in its centre there is a living idea which reveals itself in an eternal symphony played on innumerable instruments all keeping perfect time. We know that this great world-verse, that runs from sky to sky .... has its direct revelation in our delight. That delight gives us the key to the truth of existence; it is personality acting upon personalities through incessant manifestations."[1] Thus the Personality, that ultimate Being or Life, within which all our little systems and incalculable universes revolve and all other lives have found their place as cells in a body, is the Master Musician playing on "innumerable instruments." "The light of thy music illumines the world. The life-breath of thy music runs from sky to sky. The holy stream of thy music breaks through all stony obstacles and rushes on."[2] This realisation of the existence of a Personality, behind all the forces of nature, the source, the spring from which all the life and energy of nature flows, led Tagore to feel 'the actual immanence of God in the infinitesimal atoms in the vastest system,'[3] and believe that 'there is not a pin-point in visible space which does not contain a microcosm of heaven and earth;[4]' and that 'O'er' the wide earth, on mountain and on plain, dwells in the affections and soul of man, a God-head;[5]' and his faith in the Mantras '*isha-vasya-midam sarvam*'[6] and '*sarvam-siva-mayam jagat*,'[7] becomes unwavering. "Hidden in the heart of things, thou art nourishing seeds into sprouts, buds into blossoms and ripening flowers into fruitfulness."[8] As in a wintry dusk, through the hazy clouds of

1. Tagore—Creative Unit.
2. Gitanjali.
3. Tennyson.
4. A. E.
5. Wordsworth.
6. Ishopanishad.
7. Sivagam.
8. Gitanjali.

"the beloved brotherhood" of the poets. The sighs[1] and sounds and pantings of this brotherhood incessantly transmit waves of music to the core of the poet's heart.

> How sweet the moonlight sleeps upon this bank!
> Here we will sit, and let the sounds of music
> Creep in our ears: soft stillness and the night
> Become the touches of sweet harmony.
> ....
> There's not the smallest orb, which thou behold'st,
> But in his motion like an angel sings.[2]

This universal music—not the traditional music of the spheres manifests itself in the ceaseless motion of the forces of nature and touches the music of the poet's soul, which, responds to it in return. Tagore confesses it: "Endlessly varied art thou in the exuberant world, Lady of Manifold Magnificence! Thy path is strewn with lights, thy touch thrils into flowers;........ and thy many-toned music is echoed from innumerable worlds through signs and colours."[3]

Behind every wave of music there is a heart beating to the rhythm of life, every sigh has a throb of pulsation behind it. These varied tones, these manifold voices that mingle in one harmony to sweeten the celestial music in heard and unheard melodies, remind us of the living hearts behind them. "The same stream of life that runs through my veins night and day runs though the world and dances in rhythmic measures."[4] Therefore, "May I find my place in the light of the sun, in these flowering gardens, in the midst of living hearts!"[5] Thus all the melodies of the earth are mere waves on the ocean of

1. Shelley, —Invocation to Nature.
2. Shakespear.
3. Tagore The Fu itiv .
4. Gitanjali.
5. Tagore

Rabindranath Tagore as Poet of Nature and of Man.

Blessings be with them and eternal praise,
Who gave us nobler loves, and nobler cares,
The poets—who on earth have made us heirs
Of truth and pure delight by heavenly lays!

— *Wordsworth.*[1]

(What shall I do with that wihch will not give me immortality?)

Maitreyi.[2]

Only an ever-aspiring soul could utter this:—"How little do I know of this mighty world. Myriad deeds of men, cities, countries, rivers, mountains, seas and desert wastes, so many unknown forms and trees, have remained beyond my range of awareness.

Great is life in this wide Earth and small the corner where my mind dwells."[3]

Vast and endless, indeed, is this range of the poet's awareness, and his sympathy for the men, mountains and rivers of this earth. Nothing is trivial to him. 'The meanest flower that blows,' gives him, 'thoughts that do often lie too deep for tears.'[4] "The dewy morn, and odorous noon and even, with sunset and its gorgeous ministers, solemn midnight's tingling silentness,.......the seasons with thier sighs, sounds, snow-crowns and pantings,.......the earth, ocean, air," all these form,

1. Wordsworth, Personal Talk.
2. Maitreyi to her husband Yajnavalkya.
3. The Great Sympathy, Tagore.
4. Wordsworth.

The gardener frightfully whispered, "Anarkali Begum, Your Majesty!"

Anarkali! The Emperor appeared to be in a reverie as if revisiting after the lapse of all these years the scenes of his youth. They flashed in his memory like lightning. He raised his eyes. The evening star was glittering on the horizon. It made past memories fresh. He visualised Anarkali as he had met her for the first time. He remembered the smile which had cost her dear life. Then that gloomy dungeon in which he had gone to see her. Then the treachery of the gaoler which ended a life so lovely in so horrible a manner.

Next day, the Royal Command was delivered that a magnificent monument be at once raised over the tomb of this Queen of pomegranates and the following lines be engraved as an epitaph,

> 'I would send thanks to my God till the day of Resurrection
>
> If I could behold but once again the face of my beloved'.

SAEED AHMED MEENAI,
(OSMANIA), *April 1943.*

---

herself on the stony floor propping herself on her hand; there was a strange smile on her lips and her eyes were half-open—the tiny spark of life that lingered in her beautiful body had flickered and died out.

And when day dawned and the warders came to execute the king's commands, they paused a little. Down went the blinds and the golden rays of the sun shone her cheerful face. She resembled the Goddess of Beauty. The sun was rising higher and higher flushing the distant hills with fire.

(VIII)

The greatest of the Moghal Monarchs Akbar was enjoying eternal rest in his grave and Nooruddin Jehangir was the Emperor of India. The heart-rending scene of Anarkali's sad death he remembered no more. He had found an image of greater beauty—Mehrunnisa.

It was a calm evening and Emperor Jehangir was enjoying a promenade in the Royal Garden. All of a sudden his eyes fell on a white grave laden with pomegranate flowers. He had never seen it before, nor did he know who lay under it.

An old gardener was watering the plants not far away. He called him.

"Who sleeps underneath that grave?" questioned the king.

The gardener glanced at the grave but could not speak.

"Who lies enjoying eternal rest underneath that grave?" The Emperor repeated his query.

Saleem had come to bid farewell to his sweetheart. But he little knew that they wanted to escape. When he heard them, he found himself on the horns of a dilemma. If the prisoner escaped, his life stood in peril. But he did not want to displease the Prince as well, for he realised that the Emperor was old and Saleem's star was in the ascendant.

Time passed. The gaoler was in a fix for he very well knew that the Prince would approach the prison again. Suddenly he beheld a ray of hope amid universal gloom.

"Would your Highness like to cool your heat—oppressed brain by drinking a little wine," exclaimed the gaoler. Saleem's throat was parched. He assented. The gaoler went in and drugged the wine. He brought it before the Prince who poured it down his throat. Now the gaoler was certain that the Prince would doze till morn.

(VII)

Anarkali waited for Saleem. She was still hopeful. But morning was fast approaching and the gloom of her dungeon was being gradually dispelled by light.

Suddenly she beheld a diamond ring which was shining brightly. She remembered that it was given to her by her dead mother when she was breathing her last. Her words echoed in her memory, 'If you find no other way out of a difficulty, lick this ring.' She took out the stone and kept it on her parched tongue. The thoughts of her infancy, the image of her mother, and the love making of the Prince all swam before her eyes. She stretched

Saleem was on tentherhooks.

"I cannot leave you to be overtaken by this cruel fate. There is no other way but flight. Come on. Make haste. Pick up courage."

Anarkali listened to the Prince with patience but kept silent. The Prince could endure no more. Tears brimmed over his lids.

Suddenly Anarkali wavered in her firm determination.

"Is there still time? Can we still escape?" she exclaimed.

Saleem clasped her hand and tried to console her. They were about to step out when the gaoler entered frightened and scared.

"Your Highness," gasped he, "the Emperor is coming this way."

Saleem's face fell.

He pressed her to his bosom.

"I will be back in a moment. You be prepared."

Anarkali looked at him -her breast wildly heaving. Her eyes were thoughtful as if they beheld the impending destiny.

The Prince stole down the stairway of the dungeon and she was all alone—perhaps for ever.

(VI)

No one entered her dungeon. The gaoler had determined to remain faithful to the Prince. He thought that

Anarkali wept and then fell into a lonely musing. Had she committed a sin? Is love a sin, a crime or mistake?

She thought, 'O God! then why do you show such dreams which end in despair? Why do you fill the human mind with a desire which is impossible of realization? Tell me! Yes, Tell me! Why? Why? Why!" Nothing could lesson her grief. Now her fancy turned towards her lover. "Will he do nothing to save me from the clutches of death?" Now a fresh thought lighted in her mind. "Does the Prince really love me or was this all a cruel jest?" The idea was even more agonizing for her than the thought of death.

All of a sudden the door opened and Saleem appeared. They embraced each other and broke into weeping. Saleem tried to comfort her.

"My heart," whispered Saleem, "Do not grieve; we will be saved."

Anarkali recovered from her paroxyism of grief and her face lit up with hope.

Saleem said, "I have completed all preparations. Two fleet steeds are waiting for us."

"Our escape is possible." she replied, "but we shall be pursued. Why do you place your life in danger for my sake?

"Don't be afraid," exclaimed the Prince, "My companions will mislead our pursuers."

But Anarkali hesitated. She realised that she had no right to place the Prince in peril.

pointing towards her, her blood suddenly congealed within her veins. She became dizzy. The camphor lamps were taken away and ere she could think darkness began to hold sway.

Suddenly a cold hand grasped her shoulder. It was the gaoler's. A shriek escaped her lips in utter despair. Trying with all her might she was successful in disengaging herself from the iron grasp of the gaoler. She fell at the feet of the Emperor and fainted away.

(V)

Darkness and Solitude that darkness which the flame of a gradually extinguishing candle has made still darker, that silence which becomes more solitary due to the shrieking of the nightbird. It was in this mute gloom that Anarkali came to her senses.

Her eyes were wide open. The past appeared to have been absolutely razed from her brain. But gradually the frightful incident returned to her memory. Ah misfortune! She was now a prisoner and lay on the stony floor of the dungeon. Moonbeams were slowly creeping in and she was waiting for her impending fate. Her heart ceased beating when she thought that her thrilling life would end in a few hours. Tremoor seized her body. Death is horrible but it becomes still more horrible when one awaits it.

Anarkali stood up but she was still dizzy and with a heart-bursting pang again fell down like a wounded stag. Suddenly came the thought of Saleem for whose sake alone she was rushing headlong into the jaws of death. She started weeping aloud.

This song seemed to open an altogether new shpere in her vision. She had absolutely sunk in love and now she was singing songs before her lover—songs in which she laid open her heart. Sheesh Mahal appeared to lose itself slowly in delicious oblivion. She forgot that she was singing in the presence of the Emperor. She forgot everything but that she was singing before her lover Saleem. She took a turn in her dance and fixed her eyes upon the Prince. Her eyes were illumined with a sense of triumph.

All of a sudden a commanding voice was heard. It was the Emperors. At once the music ceased. The Emperor appeared in great rage; his brows were knitted. He had seen and understood the whole drama Doubtless, the king was kind and noble hearted. But a great struggle was going on in his breast. Could he leave his son, the apple of his eye, the only solace in his old age, who was to wear the scarlet and gold of Royalty to fall a prey to the charms of a slave girl?

"Take this girl" declared the Emperor pointing towards the bewildered Anarkali, "and place her behind the bars. Tomorrow before the day dawns she shall be buried alive. This is a suitable punishment to be meted out to those degraded daughters of Eve who do not hesitate to rain arrows out of the golden quiver of their charms, without pausing to think whom they are assailing."

The words of the king echoed in the palace and died away.

Anarkali had also stopped her song and stood bewildered. But when she noted that the Emperor was

The Emperor looked at her and smiled.

"Lovely girl," he said, "the full moon needs no other assistance to outshine the glittering stars. Why have you put on this gaudy robe?"

Anarkali slightly blushed. She could not reveal her inner feelings to the Emperor--Saleem was there and all this toilet and decoration was for his sake alone.

The melodious but trembling notes of the violin filled the atmosphere. Absolute silence held sway. Anarkali lifted her foot and the symphonic notes produced by the golden bells tied round her ankles floated into the atmosphere. She danced as if she beheld some sweet dream. She raised her voice to sing as some one whispers a secret into somebody's ears. The audience was spell-bound. Her voice was still so low that only her trembling lips showed that she was singing. Gradually her voice became distinct a voice which was even more thrilling than the sweetest carol of birds

She felt as if she had lost herself in some sweet dream where true love was all in all. She lifted up her head and her eyes held Saleem's. There was something arresting in his eyes. Anarkali recollected their past meetings; they had met many a time after their first memorable meeting. Her countenance beamed with joy and her eyes lit up with a strange light, as if her Reason was wrenched away.

And Saleem? for him Anarkali was the deity of love. He reflected how beautiful, how loving were her eyes.

Anarkali sang,

"I be you and you be me, I be the body and you the soul,
So that nobody may say that we two are apart."

thoughts. Idea after idea swam before her. 'Saleem will marry me--Ah, if that day of joy could dawn earlier and I could be spared, the ordeal of waiting for it in tantalising suspense!

She absolutely lost herself amid these beautiful ideas.

Saleem was no less impatient; he was not yet a grown up. But who else can love more passionately than a lad? For his love, free from all thought of sin, gushes from the very core of the heart. The castle of his heart had easily fallen before the female self of sweet Anarkali. Sometimes he thought of her irresistible charms, sometime of the melody of her voice, sometimes of her rosy lips and sometimes of her dark black eyes. He was restless throughout the night—It was his first night of love.

(IV)

A few days passed by and there was music and dance in the Royal Palace. Anarkali was without a peer in the art of music and it was perhaps due to this alone that Emperor Akbar took a special fancy to her.

Sheesh Mahal was brightly lit with camphor candles. The floor was heavily carpetted. The Emperor was seated on the silken Masnad and the Begums reclined against the soft cushions.

The music had long started. Many girls had finished singing. But Anarkali had not yet turned up. Her turn was not long to come. She appeared and bowed before the Emperor. She was dressed in a gold and saffron robe. It was heavily studded with shining jewels. She had never put on a costlier costume.

Her dear doe ran away as if she had awakened from a horrible dream and when she glanced at them two big tears trickled down from her eyes and shone like two bright pearls in moonlight.

(III)

That night Sleep deserted her eyes and joy filled her heart.

The moon, which looked like a great golden disc in a starry blue sky, was slowly rising, shedding a soft but glistening radiance over her bed.

She recounted in her memory the incident that had taken place in the evening. How Saleem had addressed her. How melodious, sweet and musical was his voice. How she herself had felt that she was blushing when Saleem clasped her. How her figure gently trembled. How their eyes had met. How his eyes were pouring love And after this? Alas! how sweet was that moment when without any effort, without any feeling their lips had joined in a kiss. At that time she felt as if her effeminate heart was throbbing. The memory of this incident made her cheeks rosy. Her heart began to beat faster. She had a feeling of suffocation. How could she sleep when her mind was being haunted by such ecstatic thoughts.

Love! Romance!! Yes, the Prince had fallen in love with her. This was no ordinary thing. The poor girl was at sea to reason it out. She thought, 'Perhaps I am very beautiful, very attractive.' Yes she felt that she was indeed fascinating. And this fit of intense joy filled her heart with feelings of pride and drew a curtain on her Reason. She revelled in the vision of future

She could not complete her sentence "But no, Anarkali," exclaimed the Prince, "Since I had detained your Ara it is I who should seek pardon."

There was something in this vague but greedy voice which surprised her.

"Do you know why I had detained your doe," continued the Prince, "because her eyes are very similar to yours."

Anarkali caught his words. She had long been hearing that Prince Saleem loved her but could not believe it. Today, the reality had at last lighted. She stood bewildered: all her suspicions quickly disappeared. Intense joy seized her such as she had never felt before—She could not reply.

Saleem stood near her. She lifted her face and their eyes met. Saleem gazed at her with a smile on his countenance. Love thrilled along one single glance. Anarkali's lips moved but could not smile. This made the Prince still more impatient. He slowly slipped his hand on her shoulder and passionately drew her in his embrace.

"Darling Anarkali, you are mine and mine alone," slowly whispered Saleem."

Then their lips met in their first kiss and Anarkali was distinctly trembling.

The stars seemed to twinkle with an added lustre as if they smiled on the two lovers who were plighting their first vows.

The words uttered in her sweet and musical voice, floated away on the scented atmosphere. A sharp jingling sound came in response.

" Ara ! Ara !! "

The jingle was repeated. But Anarkali could not decide whence it came. It was beyond doubt that the doe had heard her sweet mistress' call, otherwise she could not have responded. But where was she ?

Anarkali repeated her call. The jingling sound was heard again and she hastened towards the scene Again she paused and cried in a moving voice, " Ara ! whither have you gone ? "

The doe came leaping from behind a tree as if in intense joy. The necklace of golden bells wrapt round her neck tingled loudly and filled the atmosphere with sweet melody. Anarkali stooped forward to embrace her and whispered passionately.

" Hullo, my little witch, who had detained you ?"

" Myself."

Anarkali was startled and swiftly turned round. The lustre of her dark black eyes was quenched with fright. She noticed a shadow slowly flitting across the bars of moonlight and Prince Saleem stood behind her.

He smilingly said, " It was I who stood in the way of your Ara."

Anarkali blushed and her cheeks became red as cherries. She pulled down her veil and bowed before the prince.

" I beg pardon of your Highness, I was ignorant that............ ..."

flutters about among the dancing flowers. She was like the cypress that gracefully sways in the night wind and glistens in the sheen of the stars.

But a blossom is not ever a blossom. The golden ray of the Sun kisses it and it exhales fragrance. The approach of the spring of life added to Anarkali's charms and she entered her womanhood. This was no ordinary change. Her childish naughtiness soon departed. There was lightning in her smiles and magic in her eyes. At times she was blithe, at times impatient and restless,—— ever like a butterfly.

The aged women of the harem watched her and heaved a deep, cold sigh—she revived the sweet memories of their youth. Her friends would say, "The petals of the blossom are gradually opening." And Anarkali would lose herself in the clouds.

Now she was fast changing and the little blossom had soon grown to be a blooming flower. No strict Purdah was observed in the Royal Harem and Prince Saleem also saw her.

Anarkali soon stole the heart of the impatient Prince. Now there was but one reflection in the mirror of his heart, but one solitary desire in his mind. He was on fire to declare his love.

It was a moon-lit evening. A shower of rain had washed the picturesque garden. Tiny drops of water trickled down the green leaves and produced a symphonic sound. The clouds were slowly clearing away and the moonlight was broadening over the tree-tops. Anarkali stood on the wet marble floor and looked towards the radiant horizon. She was impatiently waiting for her dear doe.

"Ara! Ara!!"

Anarkali.

[This tragic story of love at first sight needs but little introduction. It has formed the theme of a hundred celebrated compositions. Its truth has often been questioned and it is said that the sad end of Anarkali is too savagely cruel an act to be associated with the fair name of the Emperor Akbar. But a dispassionate view shows that the appalling conclusion of the tale is quite consistent with the moral standards of the times. Even today, despite all our vaunted justice and equality, many a human drama is enacted which ends even more pathetically owing to the social fetters of our enlightened twentieth century. Hence the story, even if admitted to be true, cannot detract much from the fame of the great Emperor.

Anarkali committed the sin of loving a prince and paid for it with her life. But how cruel is man! He for whom Anarkali sacrificed her dear life could not even cherish her memory. The following version is based, to a very great extent, on an Urdu Translation of the story as outlined in Bengali by the celebrated writer Babu Samirendra Nath Gupta, and is particularly intended for the English reading public, so that it too, may enjoy this tale, so full of thrill, emotion and pathos.]

Saeed.

Nadira was Anarkali's real name. Her mother was a dancing girl in Akbar's harem. The Emperor once called her Anarkali and by this name she was known ever afterwards. She roamed about in the palace, as a butterfly

Why then cannot we re-mould our way of thinking? Why cannot we devote more time to deeper thinking, and less to the trivialities and superficialities of our worldly existence? Why, then does class distinction arise, when all, even "the paths of glory lead but to the grave?" Why then the desperation of Disraeli in calling the classes two nations? Why, in fact, everything that adds more to worldly troubles and quarrels, and less to that peace which should bless one here, where he is on a journey from one world to another, is tired yet strong, footsore yet ambitious?

The passing and shadowy dream that is life, leaves one pondering over the truth contained in the lines:

"Oh threats of Hell and Hopes of Paradise!
One thing at least is certain——this Life flies,
One thing is certain and the rest is Lies;
The flower that once is blown for ever dies."

SHAHID ALI KHAN, B.A.,
(OSMANIA).

of our time in idling away. Perhaps that is the very art of life as Charles Morgan points out, "some instants are so precious in themselves that they cannot be used; the art of life is to waste them."

However when we realise that,

> "All beauteous things for which we live,
> By laws of time and space decay,"

we begin to grow sceptical about the very aim of life, and cannot, by any stretch of imagination, reconcile this ultimate truth with the ambitions of man for worldly power and position; with his lust for wealth and fame; or with the so-called realism of our age which presents the "phenomena" as Cole points out, "of glut and starvation, of armies of unemployed, and of rotting wheat and burning coffee."

Everything here seems so empty, so fleeting, so very ridiculous. "Why" then, as Proctor asks, "do our fond hearts cling to things that die?" Why the lust for power, why the wars that bring such a lot of misery and destruction in their wake? When we ponder over this law of nature ——the law that ordains that everything must eventually perish—— we cannot but think that the war-lords who spread destruction are either empty-headed, or superficial, or lob-sided, or people with entirely wrong values with which to judge life. One should have thought that after all the experience of the generations, man would settle down to higher values and a more peaceful way of life.

We are today in the midst of a horrible struggle for the survival of the fittest — in the midst of an all-embracing war which is casting its cataclysmic influence over the whole of mankind. Why do we fight thus, and

Stray Thoughts.

"Alas, that Spring should vanish with the Rose!
That Youth's sweet-scented Manuscript should close!
The Nightingale that in the branches sang,
Ah, whence, and whither flown again, who knows!"

Omar Kahyyam.

To see a rose in a moonlit garden, to see also its changing hues, its increasing beauty with the advance of night, is so exquisite; but is it the same to feel that by morning the same rose might be moon-blanched or might fade? Like the rose, life itself is waning; we are born, we live, and then die; the rose of life vanishes in spite of its sweetness, and takes away the springtime of joy and happiness with it.

Life is mortal; happiness, a mere bird on the wing. To think of the greatness of man, his achievements, his capabilities, his power of thought; and of the beauties of nature, of the landscape by sunset, of the shadow of trees on a moonlit lake, of the fragrance of flowers, of the melody of music; of these and of the tragedy of life and its fleeting nature; of the landscape fading beyond the scope of human sight into nothingness, of the moonlight that exists not everyday: of the fragrance of flowers that needs must lose its scent; in fact to think of everything that is mortal and perishable in a world so beautiful, so exquisite, and yet so mysterious, is in itself so paradoxical that imagination staggers at its contemplation.

Even knowing that life is mortal, that man is here for just "three-score years and ten", we waste such a lot

independence and pride. Byron revealed this strange tendency by making Lucifer, in the drama of 'Cain' "a champion of man's thirst for intellectual emancipation." Shelley regarded his Prometheus as "a kindred figure, superior, however, because his activities were directed to man's good instead of his destruction."[21] The influence of Milton on Keats is largely, though not exclusively, concerned with style and diction. The richness and exuberance of Milton's expression was "naturally attractive to his temperament." His 'Hyperion,' says Hanford, "represents an attempt to compose a blank verse epic on the Miltonic plane. In both conception and style, the poem owes much to 'Paradise Lost'."[22] The early sonnets of Keats were modelled on those of Milton, but later he gave it up for the Shakespearean sonnet with the concluding couplet.

In the later 19th century Milton's influence continued to exert itself. The sublimity of his style, no longer regarded as being attainable by lesser poets, still remained a source of inspiration for Tennyson, Swinburne, and others. A critic believes that in 'The Two Voices' "we cannot fail to catch an echo of Milton".

The Titanic personality of Milton still looms large and continues to inspire the poets of the contemporary age. Among these, Bridges has acknowledged his indebtedness to Milton. His tow Spring odes are inspired by, if not exactly modelled on, Milton's 'L'Allegro' and 'Il Penseroso.' His 'Prometheus the Fire Giver' and 'Achilles in Scyros' are the first considerable attempts modelled on 'Samson Agonistes'.

M. NAIMUDDIN SIDDIQI, M.A.

21. Hanford : A Milton Handbook
22. Ibid.

In the late eighteenth century Blake was also considerably influenced by Milton. Milton "contributed largely to the materials of his imagination in poetry and art."[19] Blake's own "fantastic cosmology and the philosophic ideas" embodied in the poem 'Vala' are indebted to Miltonic system.

But it was with the Romantic poets of the 19th century that Milton became a dynamic influence. Wordsworth was profoundly influenced by the spirit and art of Milton. His sonnet, 'Milton, thou shouldst be living at this hour' shows how deeply he had assimilated "the ethical idealism" of his master. Wordsworth's sonnets, greater indeed than Milton's in some respects, nevertheless owe their inspiration to Milton. Wordsworth has little of the freedom of poetic energy which characterised Milton, and without Milton some of his greatest sonnets "could never have been attempted." As Bailey remarks, all the sonnets that utter Wordsworth's "magnanimous patriotism, his dauntless passion for English liberty, his burning sympathy with the oppressed, the 'holy glee' of his hatred of tyranny, are of the right lineage of Milton himself."[20] Apart from the sonnet, some of the greater poems of Wordsworth written in blank verse are reminiscent of Miltonic phrase. A critic remarks that it is in the 'Prelude' and 'Excursion' of Wordsworth that "more profoundly than anywhere out of Milton himself, Milton's spiritual legacy is employed".

The spiritual rebellion of the younger group of the Romantic poets, chiefly Byron and Shelley, led them to the worship of Satan as the impersonation of the spirit of

19. Hanford, 'A Milton Handbook'.
20. John Bailey 'Milton'.

blank verse in his 'Night Thoughts'. Johnson thought that blank verse was rightly used in Thomson's 'Seasons' and Young's 'Night Thoughts'; but by the middle of the century, as Nichol Smith says, "blank verse had become the customary measure for the didactic or philosophic or meditative peom".[17] Of the poems written in blank verse in the period between the appearance of 'Night Thoughts' and 'The Task', Akenside's 'Pleasures of the Imagination' and Dyer's 'Fleece' are to be mentioned.

Milton's two idylls, 'L'Allegro' and 'Il Penseroso' exercised considerable influence on the poetry of the latter half of the eighteenth century. Lyricism was "dead in the first half of the period. Its revival after 1740 among men of Romantic inclinations took place in part under the influence of these two exquisite companion pieces"[18] The tone and style of these poems were particularly adapted to "a transition stage between classicism and Romanticism." They became the source of inspiration for Collins and Gray; and the personifications used by these poets, the prevailing tone of their poems, and to some extent the rhythm which they employed, can be traced back to Milton. Thomas Warton the younger was a "more thorough-going imitator" of Milton, and in his descriptions of English rural landscape the influeuce of Milton's idylls is clearly visible. The increasing popularity of these two poems resulted in a continuation of their influence in later centuries, and particularly in the "great lyric movement of the early nineteenth century." Milton's 'Il Penseroso' also established the fashion of 'poetic melancholy', and probably influenced the "Night and Graveyard School" of which Gray's 'Elegy' is the most unmistakable product.

17. Nichol Smith: "Observations on 18th Century Poetry
18. Hanford, A Milton Handbook.

Thomson had a "thin vein of originality" and a genuine love of nature; but by employing Miltonic diction in the descriptions of nature, he often unconsciously fell into extravagance and absurdity, though it is true that he sometimes achieved an eloquence which approximated that of his great predecessor. But Milton saw nature "through the spectacles of books", and thus could not be regarded as an ideal poet of nature. The besetting sin of Milton's imitators was that "the grandiose expressions, which were natural and fitting in their application to the remote and lofty matters with which Milton dealt, became a grotesque affectation when employed, as they often were by Thomson and others, as a means of elevating the commonplace."[15] Thomson's 'Seasons' was the first serious attempt at the employment of the diction of 'Paradise Lost', and it "set the pattern for much subsequent blank verse." The diction of 'Seasons,' as Johnson believes, is "in the highest degree florid and luxuriant. It is too exuberant, and sometimes may be charged with filling the ear more than the mind." Wordsworth, in a less judicious manner, has condemned it as being "a vicious style." Nichol Smith believes that "on a style naturally rhetorical and Latinized, Thomson superimposed a Miltonic element. He found in Milton a language after his heart."[16]

Cowper avoided the excessive Miltonism of Thomson, but he was so steeped in Miltonic scholarship that his own blank verse was to a great extent moulded by that of his master. "One feature or another of Milton's style and diction," says Havens, "occurs in almost every paragraph of 'The Task'." Another conspicuous imitator of Milton in the eighteenth century is Young, who employed

15. Hanford, 'A Milton Handbook'
16. Nichol Smith, 'Observations on 18th Century Poetry'.

of the school of Pope, people had begun to regard Milton as the representative of genuine poetry. The "sublimity and fervour of his poetic imagination" and his style and versification fascinated by contrast with the prevailing literary forms, and the result was that he became "a quarry of poetical phrase for everybody, even for Pope, and a direct model for the vast school of blank versifiers who maintained what might be called the other poetical tradition of the eighteenth century".[12] Some of these imitators, like Thomson and Cowper, were stirred by genuine poetic feeling, and in them the underlying currents of Romanticism are distinctly discernible. Thus Milton's influence on the eighteenth-century poetry is twofold: it modelled the form of blank verse poetry on the one hand, and influenced the tendencies of the Pre-Romantic poets on the other. Raleigh is justified asserting, in this connection, that "the study of in L'Allegro' and 'Il Penseroso' and 'Comus' helped toward the Romantic Revival".[13]

One of the earliest imitators of Milton in the eighteenth century was John Philips, who in his burlesque poem, 'The Splendid Spilling' (1701) adopted the dignified diction of 'Paradise Lost'. But parodists alone did not go "Milton-mad" in this period; even Pope frequently borrowed Miltonic phraseology; and as Raleigh thinks, "the mock-heroics of 'The Dunciad' are stilted on Miltonic phrases".[14] Thomson, Young, and Cowper were much more deeply influenced by Milton, and it was they who prepared the ground for the immense popularity of blank verse,—a popularity which reached its culmination in the time of the Romantic poets.

12. Hanford. 'A Milton Handbook'.
13. Raleigh: 'Milton'.
14. Ibid.

Milton had created and wielded an instrument which was beyond the control of any less than himself".[9] And Raleigh's remark is no less true that Milton's "imitators and followers, hoisting themselves on the Miltonic stilts, brought the very name of 'poetic diction' into a contempt that has lasted for more than a century, and is not yet wholly extinct".[10]

The poetry of the eighteenth century is often fallaciously regarded as being written chiefly in the heroic couplet. Apart from Dryden, Pope, Johnson, and Goldsmith, there is no other poet who can claim eminence as a writer of the couplet. In this period, a large body of poetry was produced in blank verse; and since apart from drama there was no other model but Milton, it is natural to conclude that "practically all of it is Miltonic". In the opinion of Hanford, "the Miltonic manner, as distinct from his spirit and inspiration, was not difficult to catch. His use of Latinisms, his inversions of natural word-order, his collocations of sonorous proper names, and many other conspicuous external traits furnished a ready means of stylistic ornamentation which an age largely destitute of poetic originality was too ready to adopt".[11]

But the influence of Milton on the eighteenth century was not merely confined to the blind adoption of blank verse as a fashionable vehicle of expression. The beginnings of the Romantic Movement had become distinctly perceptible in the last twenty years of the eighteenth century. Tired of the monotonous uniformity of the heroic couplet, and the artificiality of the poetry

9. Mark Pattison: 'Milton'.

10. Sir Walter Raleigh. 'Milton'.

11. Hanford: 'A Milton Handbook'.

continuous series. He used the sonnet for the expression of a variety of sentiments. It was in the hands of the Romantic poets that the sonnet attained to a higher perfection; but Milton deserves the honour that is due to an innovator and reformer.

(2) Milton's Influence.

It is impossible to support the statement of T.S. Eliot that Milton was a great poet, but a bad influence. The reputation of a great writer cannot be marred by the mediocrity of his followers and blind imitators, and their consequent inability to grasp the finer excellences of their model. Milton exercised a paramount influence on the eighteenth century poets and the early Romantics, but this influence was directed towards blind imitation in many cases. It is true that Milton was, by an irony of fate and quite undevisedly, responsible for the promulgation of that 'poetic diction' which Coleridge and Wordsworth so vehemently denounced in the Preface to the 'Lyrical Ballads'. Milton had introduced a style of almost superhuman sublimity for the treatment of a subject which was in perfect harmony with such a style. But his imitators, incapable of a sustained elevation of thought and feeling, adopted his dignified diction for trivial subjects, and thus marred the effect and power of association which his diction originally possessed. It was the incongruity between style and subject-matter in the poetry of Milton's imitators which justly became the butt of ridicule at the hands of Wordworth and Coleridge. As Mark Pattison has judiciously remarked, "Milton's language had become in the hands of the imitators of the 18th century sound without sense, a husk without the kernel, a body of words without the soul of poetry.

probability and briskness in the dialogues which are the chief characteristics of a drama. It is "a Puritan hymn to chastity". Johnson believes that in it "may very plainly be discovered the dawn or twilight of 'Paradise Lost'".[7] 'Lycidas' is one of the most famous pastoral elegies in English literature, and in spite of Johnson's ferocious attacks, has continued to appeal to the readers on account of the nobility of its sentiments and the melody of its diction. Grierson has pointed out some of the defects of these earlier effusions: "if these poems are Milton's in the perfection of their elaborate, decorative art, their finely built texture, they are also...... Miltonic in their limitations, the rather self-centred nature of the emotions of which they are the beautiful expression. A kind of fastidious Puritan Epicuranism is the tone of these poems".[8]

Next to be mentioned are his hymns and sonnets. 'On the Morning of Christ's Nativity', composed in 1629, is a remarkably successful juvenile attempt. The introductory part is written in stanzas slightly different from the Spenserian stanza, and the 'Hymn' that follows has a spontaneous flow of verse and melody. Milton's sonnets occupy an important position in English literature, not only for their intrinsic merits, but for the influence which they have exercised on the sonnets of the Romantic period. They show a divergence from the tradition of the sonnets of Spenser, Sidney, and Shakespeare. Milton does not make them the vehicle for the presentation of amoristic adventures,—often imaginary and almost invariably sentimental—as his predecessors had done. He also defied the tradition of writing them in a

7. Johnson: 'Lives of the Poets' —Milton.

8. Grierson: 'Cross-currents in 17th Century Literature'.

In it Milton presents the tragedy of his own life with the thinnest disguise, and with an intensity of feeling which makes it deeply pathetic. It is, in the opinion of Bailey, like the Greek tragedies, "in the solemn music of its utterance: in its deep sense of the gravity of the issues on which human life hangs. It is like them also in technical points as the use of a chorus to give expression to the spectator's emotions".[6] In the opinion of Goethe, it has "more of the antique spirit than any production of any other modern poet". It is Milton's last word, and on the whole, his saddest.

Apart from the theme, the most characteristic feature of these poems is the use of blank verse; and herein lies the main source of Milton's influence on the poetry of the eighteenth century and the Romantic period. Apart from the drama, blank verse had never been used by his predecessors. He can rightly be called the re-creator of blank verse. He "takes non-dramatic blank verse in hand once for all, and introduces into it the order, proportion and finish which dramatic blank verse had then lost".

When we turn from these poems, written when Milton had "fallen on evil days and evil tongues", and in the midst of poverty and persecution, blindness and disillusionment, to those of the sunnier period of his life, we perceive a change in the pervading mood, but almost the same perfection of form and harmony of numbers. The two idylls, 'L'Allegro' and 'Il Penseroso' have a raciness and spontaneity, indicative of a serene and meditative sensibility in the poet's heart. 'Comus' can be more justly regarded as a lyric than a drama, for it lacks that air of

6. *John Bailey*: 'Milton'.

is treated by Milton. Dryden has justly called it "one of the greatest, most noble, and most sublime poems which either this age or nation has produced." In the opinion of Johnson, "the characteristic quality of this poem is sublimity. He sometimes descends to the elegant, but his element is the great. He can occasionally invest himself with grace, but his natural port is gigantic loftiness. He can please when pleasure is required, but it is his peculiar power to astonish".[2] The most striking characteristic of his poem, according to Macaulay, is "the extreme remoteness of the associations by means of which it acts on the reader".[3] In the opinion of Landor, it is "the noblest specimen in the world of eloquence, harmony, and genius". Beeching has justly remarked that Milton "is no whit behind Homer in nobleness, in the sustained dignity of his poem, and his perfect sureness of touch".[4]

In 'Paradise Regained' the art of Milton chastens into simplicity. It is a less decorated poem than 'Paradise Lost', but in the opinion of John Bailey, "if the narrowness of its subject and the austerity of its style be admitted, 'Paradise Regained' is a poetic achievement as great as it is surprising...ordinarily the poem is grave, plain, and unadorned, engaged in the discussion of moral problems which give little opportunity for the more obvious graces of poetry."[5] Wordsworth regards 'Paradise Regained' as "the most perfect in execution of anything written by Milton"; and Coleridge believes that "in its kind it is the most perfect poem extant".

'Samson Agonistes' is modelled on the Greek drama, and its chief interest lies in its autobiographical character.

2. Johnson: 'Lives of the Poets'—Milton.
3. Macaulay. 'Milton'.
4. Beeching: Introduction to 'Paradise Lost,' Book I.
5. John Bailey: 'Milton'.

Milton's Position and Influence in English Literature.

Milton's reputation as a great poet remains undiminished in spite of all the changes in literary taste and critical tendencies. His great trilogy—'Paradise Lost', 'Paradise Regained', and 'Samson Agonistes'—constitutes one of the monumental achievements that human intellect has ever produced. The greatest poets of the succeeding generations have acknowledged their indebtedness to him, and paid reverential tributes to his greatness. But he was too great to be perfectly imitated, too sublime to be successfully parodied. It cannot be said of him that he had " the largest and most comprehensive soul", but still his range is wide enough—we have to consider him as a writer of epic, drama, idylls, pastoral elegy, sonnets, and hymns. His soul was "like a star and dwelt apart", but it is sufficient testimony to his greatness that in spite of intellectual isolation he had attained a mastery over so many forms of verse.

(1)

Epic poetry, according to the famous Johnsonian dictum, "undertakes to teach the most important truths by the most pleasing precepts, and therefore relates some great event in the most affecting manner."[1] Judged from this standpoint, Milton's 'Paradise Lost' can be regarded as one of the greatest epics of the world. Nothing could be more universally and perpetually interesting than the theme of the Fall of Man, and nothing could be more sublime and affecting than the manner in which it

1. Johnson: "Lives of the Poets." Vol. I.

happens around him. Free and untrammelled discussion of the varioue social, political and economic problems confronting modern civilization should be an essential part of academic freedom.

The present war has shown the failure of various attempts at establishing world peace. If history is not to repeat itself, the Four Freedoms of President Roosevelt and the Atlantic Charter should be made a reality. A well-planned system of education could go a long way to develop the world idea. At a time when the words *post-war reconstruction* are on the lips of every intelligent citizen, is it too much to expect that our country will find a suitable place in that comity of nations which Tennyson calls *The Parliament of Man?* It is the business of the universities in India to create and foster that hope for a better future which constant discussion of the New World Order implies. The Osmania University could do much in this connection, if the various organs of the University take the business seriously..................... We need not state that the facilities provided by this university for a healthy development of the world idea are abundant. Our duty is to take advantage of them.

Finally, we would like to thank the Pro-Vice-Chancellor, the Adviser, English Section and others associated with the Magazine for the helpful attitude they have constantly shown towards us.

K. R. REDDY,
Editor.

EDITORIAL

THE Osmania Magazine enters the sixteenth year of its life with the present issue. We regret we could not bring out this issue earlier than now for reasons which need not detain us here.

We are sorry to state that, in spite of our best and most earnest endeavours, we could not get the type of articles we had intended to publish. While there is no lack of students and teachers at the University who can write excellent articles for the Magazine, it is a pity that no attention should be bestowed on the simple task of contributing articles to the Magazine. We are firmly convinced that so long as they are indifferent to our attempts at raising the standard of the University Magazine, the efforts of the Editorial Board are bound to fail. Is it improper, therefore, to appeal to the students and teachers and other well-wishers of the Magazine to offer their active co-operation in all possible ways in making the Magazine a correct picture of the ideals which a University ought to uphold?

The student of to-day is the citizen of tomorrow. The magazine, the union, the play-field and the hostel are intended to be the training grounds for the all-round development of the student. It should be the duty of the university to make the student an intelligent and responsible citizen with a scientific attitude of mind. While refusing to tread the noisy path of practical politics, he should keep himself completely aware of what

CONTENTS

Annual Subscription.

1.	Present Students, Osmania University	... ...	4
2.	Old Boys, Members of the Teaching Staff	... ...	5
3	General Subscribers	... ...	6
4	Single Copy	... ...	2

Note:—**Registration and V. P. Charges Extra.**

Can be had of:

OSMANIA MAGAZINE OFFICE

OSMANIA UNIVERSITY

HYDERABAD-DECCAN.

The Osmania Magazine

Vol. XVI. No. 1.

THE

OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

The Osmania University

HYDERABAD-DECCAN.

Managing Editor:

MOHAMED ALI NAYYER, M.A. (Final).

Editor:

K. R. REDDY, M.A.
(Final)

Asst. Editor:

SAEED AHMED MEENAI, M.A.
(Previous)

Vol. XVI. 1943 No. 1.

مجلّۂ عثمانیہ

(جلد ۱۶ شمارہ ۲)

طلباء جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مہتمم مُدیر و مدیر حصّہ اردو

محمّد علی نیّر ایم۔اے (آخری)

نائب مدیر

رحیم الدّین کمال بی۔اے (آخری)

مطبوعۂ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن۔

مجلس انتظامی

سنہ ۱۳۵۲ف

صدر

پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب ایم۔اے ایل ایل۔بی (کنٹب)

نائب معین امیر جامعہ

مشیر حصۂ اردو

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

مشیر حصۂ انگریزی

مسٹر ایم۔ایس ڈی سے سوامی بی۔اے (آکسن) ایم۔اے۔ایل۔ٹی (مدراس) ریڈر انگریزی جامعہ عثمانیہ

خازن اعزازی

مولوی وحید الرحمٰن صاحب بی۔ایس سی۔ پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

معتمد مجلس مشاورت

مولوی سید محمد یونس صاحب وفاقانی بی۔اے (عثمانیہ) ایم۔ایس سی (ڈھاکہ) اے۔ایم آئی۔آر۔ای (لندن)

معتمد اعزازی مجلس انتظامی

محمد علی نیّر ایم۔اے (آخری) مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو

اراکین

مسٹر کے آر۔ریڈی ایم۔اے (آخری) مدیر حصۂ انگریزی رحیم الدین صاحب کمال بی۔اے (آخری) نائب مدیر حصۂ اردو

سعید احمد صاحب مینائی ایم۔اے (ابتدائی) نائب مدیر حصۂ انگریزی

مجلس مشاورت

(صدر)

پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب

ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (کینٹب)
نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصۂ اردو)

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے، پی ایچ۔ ڈی پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصۂ انگریزی)

مسٹر ایم ایس دورے سوامی بی۔ اے (آکسن) ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی (مدراس) ریڈر انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمن صاحب بی ایس سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد اعزازی)

مولوی سید محمد یونس صاحب وفا قانی بی۔ اے (عثمانیہ) ایم۔ ایس سی (ڈھاکہ) اے۔ ایم۔ آئی۔ آر۔ ای (لندن)

اطلاع

(۱) تمام مضامین نظم و نثر مدیرانِ متعلقہ کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔
(۲) خریداری اور دیگر امور کے لئے مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ سے مراسلت کی جائے۔
(۳) چندہ کی تمام رقمیں خازنِ اعزازی مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کیجائیں۔

چندہ

(۱) موجودہ طلبہ جامعہ عثمانیہ سے .... للعہ ر
(۲) طلباء قدیم و اساتذہ جامعہ عثمانیہ سے .... صہ ر
(۳) عام خریداروں سے .... لے ر
(۴) فی شمارہ .... عال

سالانہ اخراجات ڈاک حسب ذیل ہونگے اور بصورت منی آرڈر اخراجاتِ ڈاک میں کمی ہوگی۔
۱۔ بذریعہ رجسٹری ایک روپیہ آٹھ آنے کلدار۔ ۱۲ر سکہ عثمانیہ
۲۔ بذریعہ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کے وی پی کے اخراجات ۱۴ر کلدار، ۶ر سکہ عثمانیہ
۳۔ بذریعہ بک پوسٹ ۹ آنے کلدار، ۶ آنے سکہ عثمانیہ۔

ارشادات ہمایونی

حضرت بندگان عالی مدظلہ العالی

مشورۂ نیک برائے طلبائے عثمانیہ یونیورسٹی

درخیالِ ما برائے اینہا دورانِ حصولِ تعلیم حصہ در اُمورِ سیاسی مُلک گرفتن (یعنے در پالٹیکس) مُفید نہ باشد کہ ہرچہ نتائج آن در مُماثلِ مُقدمات خواہ اندرون ملک باشد یا بیرون بہ وقوع آمدہ اند وآن ہم از چشم ایشان پوشیدہ نیست بلکہ عالم آشکارا نظر برآن این ہا را لازم کہ قبلِ اختیار کردن اَمرے بر مالہٗ وما علیہ آن نظرِ غائر بہ دارند تا کہ پشیمانیٔ غلط اقدام دامنگیر ایشان نہ شود!! آرے این ممکن است کہ بعد حصول تعلیم اگر این ہا خود را قابل ثابت کردہ در اُمورِ متذکرۂ صدر شرکت بہ کنند وآن ہم با حزم و احتیاط و ہم با فراست و دانشمندی کہ شیوۂ ہمہ عُقلاء و مُدبرین جہا است (یعنے ہلتی پالٹیکس) مُضایقہ نہ باشد بشرطیکہ ہر شئے اندرُون حُدودِ مُعیّنہ باشد و ہم اختیار کردہ بعد غور و خوضِ بسیار کہ واقعیٔ رہ نوردی در این کوچۂ پُرخار آسان نیست بلکہ خیلے دشوار و ہم ایشان باید دانست کہ بغیر آمدِ بہار صَبا در چمن جلوہ خرامی نہ نماید و ہم بہ طرفِ دیگر گلہائے نوع بہ نوع تبدیلِ لباس نہ کنند تا وقتیکہ لوازمۂ بساطِ گلزار بہ احسن الوجوہ مہیا نہ باشد ورنہ کسے خواہشمند نظارہ مَنظر خوش نخواہد شد و این ہمہ اسباب از "فیضان قدرت" پیدا می شوند تا کہ آبیاری وشادابیٔ چمن مفقود نہ شود بلکہ بر جائے خود بر پایہ استوار باقی ماند۔

طبع شدہ

در اخبار صبح دکن ششم ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۶ ہجری

کلیہ مسلمہ دُنیا

آنان کہ در دماغ خُود مادّۂ تکبّر و نخوت می دارند یا جلب منفعت پیشِ نظر ایشان باشد یا خُود را عادی زندگی عیش و عشرت ساختہ اند یا قلوب ایشان از خدمت بنی نوع انسان خالیست یا از جوہر ہمدردی و اعانت محرُوم۔ ہرگز در مقاصدِ خود کامیاب نمی شوند یا خود را برائے خدمتِ خلق اللہ اہل ثابت نمی کنند و اصل سبب ناکامیٔ این امور فقدان استقامت مذہب و ہم عقائد باشد و ہم قصورِ ہمت و جرائت در تکمیل امور دینوی کہ حق و صداقت چہ چیز ہست از ان یک لخت آں ہا ناآشنا کہ نتیجہ اش بجز این چیزے دیگر نیست کہ در راہ ظلمت منزل مقصود را تلاش کناں سرگردان می باشند ازین سبب گفتہ اند کہ "آبِ حیوان" را بدست آوردن آسان نیست۔ بجز رہنمائی خضرؑ یا این آن دُرِ شہوار است کہ در قعرِ دریا بہ بطنِ صدف نشستہ است و تا وقتیکہ غوّاص جوہر شناس دری نہ نماید آن در کفش نمی آید کہ بغیر زحمت نوالہ ہم در دہان نمی رسد۔

خلاصہ اینکہ انسان را باید کہ حتی الامکان اوصاف برگزیدہ در خود پیدا کردہ دعوی نشستن در صف صاحبانِ ضمیر و کردار بہ کند و رنہ بغیر این شرط دعوی او بلا تدلیل ہیچ وقعت نزد منصف مزاجان یا عقلائے جہان نمی دارد۔

بہ بہ چہ کلیۂ زرّین است!!

طبع شدہ در اخبار نظام گزٹ یازدہم ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ ہجری

مسئلۂ علم و فضل

لاریب کہ این شیئے گران بہاست و صرف در حصۂ آن ہا (بہ حصۂ رسدی) می آید کہ فطرتاً برائے این "عطیۂ قدرت" مخلوق گشتہ اند و بہ طرف دیگر تکمیل ہمہ امور دینی باشند یا دنیوی بر آن منحصر از این سبب گفتہ اند کہ انسان بغیر علم و فضل و ادراک ما فیہا از صفتِ انسانی متصف نمی شود (در صحیح مفہوم) و ہم خدا و رسولؐ را نمی شناسد و آنچہ فرائض کہ بر دوشِ او عائد اند پابجائی ایشان از و ناممکن تا وقتیکہ شعور نزاکتِ آن ہا بہ ذاتِ خود نمی دارد۔

خلاصہ اینکہ این آن شیئے کمیاب ہست کہ در حصولِ آن تگ و دو بسیار گردنیست تا آنکہ او در دامنِ مراد بہ افتد۔ دیگر از علم و فضل منصب یا منزلت انسان شناخت کردہ شود کہ او چہ پایہ درمیان ابنائے جنس یا بنی نوع انسان می دارد۔ الحاصل ضرورتِ علم و فضل درین دنیا از حد ضروریست خصوصاً می بینیم کہ حالات عالم را چہ تغیر دامن گیر شدہ است و ہم بہ چہ رنگ واقعات گیتی قلا بازیان می خورند کہ در این سیلاب صرف اقدام آن گروہ بر جادۂ استقامت می مانند کہ دل و دماغ ایشان از ضیائے علم و فضل منور ہست و ہم آن ہا مادۂ غور و فکر یا بالغ نظری در فن رائے زنی بر امورِ متنوعہ می دارند ورنہ ممکن نیست کہ از گردابِ انتشار ایشان رہائی یابند کہ طوفانِ باد و باران بہ شدت و مد نمودار شدہ است کہ کشتی بانی بہ پیشِ این موانعات خیلے دشوار می نماید لہذا ضرورت است کہ بہ عقل و تدبیر کار کردہ زورق را بہ ساحل سلامتی بہ رساند و این خدمت مدبرین یا عقلائے جہان است۔

طبع شدہ در اخبار صبح دکن چہاردہم ذی قعدہ ۱۳۶۰ھ

فہرست مندرجات مجلہ عثمانیہ

جلد (۱۶) شمارہ (۲)

(ادبی تحقیقات)

(علمی تنقیدات)

(سوانح حیات)

(لطائف و رومان)

(افسانے)

(قطعات و رباعی)



محمد علی نیر ایم۔اے (آخری) مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو مجلۂ عثمانیہ
سابق صدر بزم اردو جامعۂ عثمانیہ

اداریہ

حرفِ اوّلین

مجلہ عثمانیہ کی سولھویں جلد کا دوسرا شمارہ طمانیت کے احساس کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے چند اساسی حقائق کے اظہار کی اجازت دیجئے گا۔ مجلہ کا بنیادی مقصد معیارات پیش کرنا ہے ——— علمی و ادبی معیارات، تنقیدی و تحقیقی معیارات، شعری و افسانوی معیارات ——— اگر زیرِ نظر اشاعت کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں یقین ہے کہ آپ اس کے مندرجات کے میلانات کو مجلہ کی نصب العینی غایت کے ساتھ ہم کنار پائیں گے۔

جامعہ میں اس وقت متعلمین کی تعداد بارہ سو سے متجاوز ہے۔ اس عظیم تر جماعت کی ذہنی و فکری صلاحیتوں اور تنقیدی بصیرتوں سے کون انکار کی جرأت کر سکتا ہے؟ یہ گروہ حیدرآباد کی نشاۃِ ثانیہ کا پیغام بر اور تہذیبی و ثقافتی تحریکات کا علم بردار ہے۔ اس کے ہاتھ میں حیاتِ نو کی مشعل ہے۔ لیکن جامعہ کی وسیع تر علمی فضا کے باوجود ہم نے محسوس کیا ہے کہ مجلہ کے لئے معیاری مضامین فراہم کرنا جوئے شیر لانا ہے۔ اس امر معترضہ سے قطع نظر ہم نے اس اشاعت کو ہر حیثیت سے ممتاز بنانے کی امکانی کوشش کی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری مساعی اور اس پیش کش کا آپ دلی خیر مقدم فرمائیں گے۔

مضامین

حصۂ نثر کا افتتاح محترم ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ کے رشحاتِ قلم سے کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اِس محققانہ مقالہ میں ہمیں عہدِ محمد قلی قطب شاہ سے قبل کے ایک باعظمت اردو شاعر فیروزؔ سے روشناس فرمایا ہے۔ اِس گراں مایہ کارنامہ کی دنیائے تحقیق ہمیشہ ممنون رہے گی۔ ڈاکٹر زورؔ زبان وادب کے ان چند رفیع الشان محسنوں میں سے ہیں جن کا نام ہر اُس مقام پر عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے جہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ شعرائے اُردو سے متعلق اُردو اور فارسی میں بیسیوں تذکرے لکھے جاچکے ہیں۔ تاہم ہنوز یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ اُردو کا پہلا باعظمت سخن طراز کون ہے۔ عرصہ تک ولیؔ اورنگ آبادی کو بابائے ریختہ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا، بعد کو محققین ادب نے یہ اعزاز محمد قلی قطب شاہ کو بخشا۔ لیکن اب ڈاکٹر صاحب موصوف کے مضمون سے بحث وتنقید کے ایک جدید باب کا اضافہ ہو رہا ہے۔

" جنوبی ہند کی اردو خدمات " جناب خواجہ حمیدالدین صاحب شاہدؔ متعلم ایم۔اے (آخری) کے اُس اہم مقالہ کا اقتباس ہے جو انھوں نے کل ہند اردو کانفرنس منعقدۂ بنگلور کے ارباب کار کی خواہش پر تیار کیا تھا۔ اس کانفرنس کا افتتاح آنریبل لفٹننٹ کرنل ڈی۔ایم۔ فریزر رزیڈنٹ میسور کے ہاتھوں عمل میں لایا گیا تھا۔ جناب شاہدؔ نے یہ مقالہ رکن الملک کی صدارت میں پڑھا تھا۔ شرکائے کانفرنس نے اسے بہت پسند کیا تھا۔ میسور کے مقامی اخبارات میں بھی اس مقالہ کی بیحد ستائش کی گئی تھی۔ اس مقالہ میں جنوبی ہند میں اردو کی نشو و نما اور ارتقاء سے متعلق ٹھوس معلومات پیش کی گئی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم عدم گنجائش کے سبب پورا مقالہ شائع نہ کرسکے۔

" مرہٹی ادب بیسویں صدی میں " جناب امجد علی خاں صاحب یوسف زئی بی۔اے (عثمانیہ) کی تحقیقی کاوش کا ثمرہ ہے۔ امجد کو ہندی اور گجراتی زبانوں سے بخوبی واقفیت ہے۔ مرہٹی ادب سے تو انہیں خاص طور پر شغف ہے۔ آج کل یہ بڑی سرگرمی اور خلوص سے

مذکورہ زبانوں کے شاہکاروں کو ہماری زبان میں منتقل کر رہے ہیں۔ اِس مضمون میں انہوں نے بڑی شائستگی کے ساتھ متعلقہ مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا اندازِ بیان بھی بیحد شگفتہ ہے۔

محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ قانون نے شدید تقاضوں اور مسلسل جدوجہد کے بعد اپنا گراں بہا تنقیدی مقالہ " اجنبی اقوام کو مراعاتِ خصوصی" دو نشستوں میں راقم الحروف کو تحریر کروایا۔ ڈاکٹر صاحب مادرِ جامعہ کے اُن گرامی قدر فرزندوں میں سے ہیں جن کا وجود عثمانیہ برادری کے لئے متاعِ عزیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے اس مقالہ میں اسلامی قانون کی انفرادیت و ہمہ گیری اور مسافر مسلمانوں کے لئے شرعی احکام پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ممالکِ غیر میں مسلمانوں کے مراعاتِ خصوصی کے مسئلہ پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ عالمانہ بحث فرمائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ غیر معمولی علمی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی اشاعت پر ہم خود کو مستحق تبریک سمجھتے ہیں۔

" سوویٹ جمہوریت میں انسانی حقوق" جناب سید عالم صاحب خوندمیری ایم۔ اے (عثمانیہ) متعلم ایل ایل۔ بی (ابتدائی) کا مقالہ ہے۔ اس میں انہوں نے اشتراکی معاشرہ کی بنیادی خصوصیات، وسائل دولت کی قومی تنظیم اور سوویٹ جمہوریت و سرمایہ دارانہ جمہوریت کے فرق پر تنقید کرتے ہوئے ۱۹۳۶ء کے دستور کے بعض اجزا کو واضح کیا ہے۔ مقالہ پوری تیاری کے بعد سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

" روس کا شکسپیر" اور " عرفی پر ایک اجمالی نظر" دو سوانحی مضامین ہیں۔ ان میں علی الترتیب جناب علی احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) اور جناب محمد مصلح الدین صاحب صدیقی متعلم بی۔ اے (ابتدائی) نے روس اور شیراز کی دو غیر فانی ہستیوں، پشکن اور عرفی کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

لطائف و ظرائف کو پڑھتے وقت غیر ارادی طور پر آپ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگے گی۔ یہ جناب محمد بن عمر صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) لکچرار ادبیات انگریزی جامعہ عثمانیہ کا

دلچسپ مضمون ہے۔ صاحب موصوف مشاہیر کے لطائف جمع کرکے کتابی صورت میں شائع کردیں تو یہ ادب لطیف کی ایک مفید خدمت ہوگی۔

جناب عبدالمجید خاں صاحب یوسف زئی متعلم بی۔ اے نے "روسو کا ایک رومانی خط" پیش کیا ہے۔ زندگی کا صبر آزما سفر بغیر رومان کی لطافتوں کے بے کیف ہے۔ رومان کہاں نہیں شاعر اور ادیب کی نگاہ تو قدرت کے ہر منظر میں رومان کی تجلی دیکھتی ہے —— پھولوں کے تبسم میں رومان، ستاروں کے رقص میں رومان، موجوں کے نغموں میں رومان —— رومان تو کائنات کو محیط کئے ہوئے ہے۔

افسانے

"دو سیکلیں" —— حیدرآباد کے ایک نوجوان انشا پرداز جناب افضل عابدی صاحب کا طبع زاد افسانہ ہے۔ اس افسانے کی ٹکنیک پر بظاہر آپ کو مغربی ٹکنیک کا دھوکا ہوگا۔ لیکن دراصل یہ ایک نئی ساخت کا افسانہ ہے۔ عالمگیر تاثر اور وسعت اس افسانے کی خصوصیات ہیں۔ اس افسانے کو پڑھنے کے بعد آپ محسوس فرمائیں گے کہ افسانہ نگار کی طبیعت میں غیر معمولی ذکاوت ہے اور اس کی نگاہ زندگی پر وسیع ہے۔ افسانے کی ابتدا اور اختتام دونوں شاندار ہیں۔ ان میں فنی حسن ہے۔ اس قسم کے اپچی کارناموں کی داد حال سے زیادہ مستقبل کا مورخ دے گا۔ لطیف طنز کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"رات ڈھل چکی تھی۔ بادلوں کا لشکر تیزی سے کسی ایک طرف بھاگا بھاگا جارہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قریب ہی میں گھمسان کا رن پڑنے والا ہے۔ آسمان سے خون برسے گا۔ قانون اور لوہے کے دیوتا اسی خون میں نہاکر اپنے ہزاروں لاکھوں گناہوں سے بے نیاز ہوجائیں گے۔"

"دور سے موذن کی آواز سنائی دی جس میں عبودیت کے عجز سے زیادہ

تقدس کا زعم ملا ہوا تھا ــــ اللہ اکبر ــــ اللہ اکبر ــــ اللہ اکبر"

"کیلنڈر" جناب محمد عبدالقادر صاحب فاروقی کی ذہنی تخلیق ہے۔ فاروقی صاحب جامعہ کے ایک ممتاز فسانہ نگار ہیں۔ اس افسانہ میں انہوں نے ایک غیر شادی شدہ استانی کے قلبی واردات اور نفسی کیفیات کے مرقعے چابک دست مصور کی طرح نفاست کے ساتھ پیش کئے ہیں "کیلنڈر" افسانہ نگار کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کرتا ہے۔

جناب سید محی الدین احمد صاحب متعلم بی۔اے (آخری) ایک ہونہار افسانہ نگار ہیں "پہلی کہانی" ان کا ایک ہندی سے ماخوذ افسانہ ہے یہ افسانہ جس قدر مختصر ہے اس سے زیادہ دلچسپ ہے۔

منظومات

آہنگِ نو

"رنگین خیالات" مولوی فضل الرحمن صاحب بی۔اے (آنرز) ناظم محکمۂ نشریات لاسلکی کی جدت آفریں نظم ہے۔ یہ پُرکیف نظم لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد کے غیر معمولی نشری مشاعرے منعقدہ ۳ امرداد ۱۳۵۳ف میں جس کا افتتاح ڈاکٹر والاشان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجیع کے کلام بلاغت نظام سے کیا گیا تھا، داد و تحسین کے ہجوم میں پڑھی گئی تھی۔ خیال کا متاثر کن پس منظر، واقعات کی شاعرانہ تعبیریں، اسلوب بیان کی جدت، زبان کی شیرینی اور ترکیبوں کی دلکشی اس نظم کی چونکا دینے والی خصوصیات ہیں۔

"دست برداری" جناب علی احمد صاحب بی۔اے (عثمانیہ) کی نظم ہے۔ موصوف جامعہ عثمانیہ کے ممتاز شعراء میں سے ہیں۔ ان کا ادبی مذاق نہایت پاکیزہ ہے۔ انھوں نے

مجلہ عثمانیہ

اُردو ادب کے ساتھ ساتھ مغربی شاعری کا بھی وقت نظر سے مطالعہ کیا ہے اور کئی انگریزی نظموں کو اُردو میں منتقل کرچکے ہیں۔ یہ نظم بھی انہوں نے ایک انگریزی نظم سے متاثر ہو کر کہی ہے۔

"دکن میں عیدین اور تہوار" ایک مضمون کا عنوان تو ہو سکتا ہے لیکن جناب امیر احمد صاحب خسرو (عثمانیہ) نے اس موضوع پر نہایت لطافت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ شاعر نے تاریخ دکن کے اتحاد آفریں پہلو کی ایک دلکش تصویر پیش کی ہے۔

جناب نور محمد صاحب نوؔر اکیلوی متعلم بی۔ اے ایک خوش فکر ہیں۔ "نوائے شاعر" میں ان کے ذوق کی پاکیزگی نمایاں ہے۔

سوز و ساز

حصۂ غزل کا افتتاح نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیؔز کی کیف پرور غزل سے کیا جارہا ہے۔ عزیؔز دبستان داغ کے ممتاز ترین علمبردا ہیں۔ ان کے یہاں بھی وہی سادگی و پرکاری، وہی زبان ومحا کی چاشنی، وہی طرز ادا کی شوخی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے جو داؔغ کا مخصوص رنگ ہے۔ ا کی یہ غزل سال نو کے مشاعرے میں جو بزم اُردو جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام ۱۵؍ آذر ۱۳۵۳ف کو خود انہیں کی صدارت میں منعقد کیا گیا تھا پڑھی گئی تھی۔

جناب میر حسن صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) سابق صدر انجمن اتحاد و مہتمم مدیر مجلہ عثما جامعہ عثمانیہ کے سربرآوردہ مصنفین میں سے ہیں ان کا کلام پہلی مرتبہ مجلہ میں شائع کیا جارہا۔ میر صاحب نے اپنے افکار کی بنیاد عصری میلانات پر رکھی ہے اور روایتی موضوع و آہنگ سے گریز کر کے غزل کی امکانی وسعت کی طرف بلیغ اشارہ کیا ہے اگر اس رنگ کو فروغ دیا جائے تو کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو سکتا ہے اور اس کی فضا پھر چمک سکتی ہے۔

جناب وصی احمد صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) کی غزل میں آپ الفاظ کی خو آہنگی کے ساتھ ایک سرمستی بھی پائیں گے۔

جناب عبدالحفیظ صاحب قتیل ایم۔ اے (عثمانیہ) فانیؔ کے اندازِ فکر سے متاثر معلوم ہوتے ہیں اور راز و نیاز کی تصویریں حسن کے ساتھ پیش کرتے ہیں ان کی غزل جاذبِ توجہ ہے۔

جناب لطیف شریف صاحب سابق متعلم سال سوم جامعہ کے ایک نوخیز شاعر ہیں انکی غزل بھی بہت دلچسپ ہے۔

شہزادی برار کی انسانیت پرور اپیل

علیا حضرت شہزادی برار کو ملک کی دفاعی و رفاہی مسائل سماجی و تعلیمی تحریکات اور قومی تعمیری سرگرمیوں سے عمیق ترین دلچسپی ہے۔ ملک کی مختلف انجمنوں اور اور جماعتوں کو ان کی حوصلہ افزا سرپرستی اور رہبری کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ حیدرآبادی خواتین کی شہری دفاعی جماعت اور مرکز خواتین مساعی جنگ نے شہزادی ممدوحہ کی ولولہ خیز قیادت میں دوررس اقدامات کئے ہیں۔

شہزادی موصوفہ کا دل انسانی ہمدردی کے بے پایاں احساسات سے مملو ہے۔ انہوں نے ملک کے غذائی بحران کی نزاکت کو بروقت محسوس فرماکر بڑے عزم کے ساتھ مصیبت زدوں اور حاجت مندوں کے لئے ایک امدادی مہم کا بھی آغاز فرمایا ہے۔ ان کی اس قابل ستائش ہمہ گیر شخصی دلچسپی نے معاشرہ کے دیگر طبقوں پر بھی نفسیاتی اثر ڈال کر حصولِ مقصد میں بڑی سہولت پیدا کر دی ہے۔

شہزادی محترمہ نے سرمایۂ امداد اغذیہ کے سلسلہ میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ صاحبان اور طلباء سے بھی تعاون و اشتراکِ عمل کی بہ نفس نفیس اپیل فرمائی ہے۔ اس خصوص میں عالیجناب نائب معین امیر جامعہ نے اساتذہ اور طلباء کا ایک نمائندہ جلسہ بھی طلب فرمایا تھا۔ اس جلسہ میں اساتذہ میں سے پروفیسر درے سوامی ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی اور جناب امتیاز حسین خاں صاحب بی کام اور طلباء میں سے جناب سید عابد حسین صاحب رضوی بی۔ اے (آخری) صدر بزم معاشیات اور جناب شیخ حیدر صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی صدر بزم قانون نے غذائی

صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے شہر کا جلسہ سے ملک کے مستحقین کی مالی امداد کے لئے اپیل کی۔

ہم بھی اس موقع پر برادران جامعہ سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ملک کے نادار اور غیر مستطیع طبقوں کو گرانی کے مصائب سے نجات دلانے اور انہیں فاقہ کشی کی بھیانک موت سے بچانے کے لئے علیا حضرت شہزادی برار کی اپیل کا خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیں گے۔ بالخصوص ہم جامعہ کے خوش حال طلباء سے متوقع ہیں کہ وہ سنگ دل و بے رحم انسانوں کی طرح "تماشائے اہل کرم" نہ دیکھیں گے بلکہ ان سے جو خوش آئند توقعات اور خوشگوار تصورات وابستہ کئے گئے ہیں ان کے مدِ نظر وسیع تر نقطۂ نظر کے ساتھ اپنی معیاری و مثالی کوششیں صرف کرینگے۔

توسیعی تقاریر

جامعہ عثمانیہ اعلیحضرت سلطان العلوم کا ایک عہد آفریں کارنامہ ہے اس عظیم الشان علمی و ثقافتی ادارہ کی جانب سے جن وسیع تر بنیادوں پر بلا واسطہ و بالواسطہ اہل ملک کی جو خدمت کی جارہی ہے اس کی نظیر حیدرآباد کی گزشتہ ربع صدی کی علمی تاریخ نہیں پیش کر سکتی۔

ہر سال جامعہ کی جانب سے توسیعی تقاریر کا نظام نامہ ترتیب دیا جاتا ہے جو ہمہ گیر موضوعات پر حاوی ہوتا ہے۔ اس سلسلۂ تقاریر سے اہل ملک کی ذہنی و تمدنی زندگی پر دور رس اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

اس سال بھی محترم ڈاکٹر رید حسین صاحب مجل جامعہ نے ایک معلوماتی نظام نامہ مرتب فرمایا تھا۔ اس کی مطبوعہ کاپی ہمارے پیش نظر ہے۔ موضوعات کی افادیت اور معیار سے ہمیں انکار نہیں، لیکن ہم نے اس میں ایک کمی محسوس کی ہے وہ یہ کہ ان توسیعی تقاریر کے نظام نامہ میں ہمیں زبان و ادب کے مسائل سے متعلق کوئی موضوع نظر نہیں آیا۔ یہ ملک کی کس قدر بدقسمتی ہے اور یہ حقیقت کس درجہ دل خراش ہے کہ مختلف جماعتیں ہماری زبان کے خلاف مخالفانہ محاذ تیار کرنے میں سرگرم کار ہیں اور پینترے بدل بدل کر اس کی گلو تراشی کی کوشش

کر رہی ہیں۔ اُردو کے خلاف ذہنیتوں کو مسموم کرنے والا جو تعصب آمیز پروپگنڈا کیا جا رہا ہے اس کے اعادہ کی ہم یہاں ضرورت نہیں سمجھتے۔

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ اُردو کسی خاص فرقہ کی زبان نہیں بلکہ بین قومی تعلقات کا ایک خوشگوار اور یادگار حاصل ہے۔ اس کی تشکیل، نشوونما اور توسیع میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مساویانہ حصہ لیا ہے۔

موجودہ زمانے میں اعلیحضرت جلالت الملک اردو زبان کے سب سے بڑے سرپرست ہیں اور جامعہ عثمانیہ اس کی عظیم ترین محافظ ہے۔ اِن حالات میں ہماری رائے ہیں اگر جامعہ کی توسیعی تقاریر میں زبان و ادب سے متعلق موضوعات بھی شریک کر لئے جائیں تو ہمارے فاضل پروفیسر صاحبان اپنی حیات بخش قوتوں اور واضح تفکر سے ملک کی صحیح رہبری کر سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہماری ایک اور تجویز یہ ہے کہ اب تک توسیعی تقاریر کے لئے اساتذہ صاحبان جامعہ عثمانیہ اور بیرونی مشاہیر کی خدمات حاصل کی جاتی رہی ہیں۔ ہماری رائے میں ایسے فارغ التحصیل عثمانین کو بھی جو اصابتِ فکر کے باعث حیدرآباد کی ادبی و سماجی زندگی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اور جن کا تعلق جامعہ کے طبقۂ اساتذہ سے نہیں ہے، توسیعی تقاریر کی دعوت دی جانی چاہئے۔ اس سے ایک طرف فارغین جامعہ کی عزت افزائی ہوگی جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں تو دوسری طرف اربابِ جامعہ اور وابستگانِ جامعہ کے رشتۂ اتحاد و یگانگت اور روایات خلوص و مودت کو تقویت پہنچے گی۔

ہمیں محترم ڈاکٹر سید حسین صاحب سے یقین ہے کہ وہ آئندہ مذکورۂ بالا کی خاطر خواہ تلافی فرمائیں گے اور ہماری دوسری تجویز کو بھی رو بہ عمل لائیں گے۔

صحافت کی تعلیم

اردو کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں جو محترم

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ کی ممتاز صدارت میں کلیۂ فنون میں منعقد ہوا تھا' راقم الحروف کی مرتبہ قراردادوں کو شعبۂ اُردو اور دیگر شعبہ جات کے مختلف طلباء نے پیش کر کے ایوان کی منظوری حاصل کی تھی۔ ان قراردادوں میں جامعہ میں شعبۂ صحافت کے قیام سے متعلق بھی حسب ذیل ایک قرارداد منظور کی گئی تھی:۔

"یہ کانفرنس ارباب جامعہ عثمانیہ کی توجہ جامعۂ عثمانیہ میں شعبۂ صحافت
کے قیام اور اس کی تعلیم کی جانب مبذول کراتی ہے اور امید کرتی ہے
کہ ارباب جامعہ صحافت کی روز افزوں اہمیت کے پیش نظر شعبۂ صحافت
کے قیام کی جانب بہت جلد عملی اقدام فرمائیں گے۔"

صحافت' تمدنی زندگی کا ایک اہم ترین شعبہ ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہونے والے اور تعمیری یا تخریبی فضا تیار کرنے والے عوامل میں صحافت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

جامعہ کو زیادہ وسیع اور مثالی بنانے کے لئے حال ہی میں تجارت اور جغرافیہ کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ نیز بصرف کثیر اطلاقی کیمیا کا شعبہ بھی قائم کیا جا چکا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ جامعہ میں اب تک صحافت کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ حیدرآباد کے طلباء کو صحافتی پیشہ ورانہ تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستانی جامعات مثلاً علیگڈھ' پنجاب وغیرہ کا رہین منت ہونا پڑتا ہے۔ جہاں ایک سالہ نصاب کی تکمیل کے بعد انہیں ڈپلوما عطا کیا جاتا ہے۔

جامعہ کو دنیا کی صف اول کی جامعات کی ہمسر بنانے کے لئے ضرورت اس امر کی متقاضی ہے کہ علمی و تمدنی زندگی کا کوئی شعبہ تشنۂ تکمیل نہ رہے۔

ارباب جامعہ کی توجہ مکرر صحافت کی پیشہ ورانہ تعلیم کے انتظام کی طرف منعطف کراتے ہوئے ہم متوقع ہیں کہ وہ اس خصوص میں عاجلانہ کارروائی عمل میں لائیں گے۔

مجلہ کا ذاتی پریس

"افسوس پرچہ وقت پہ شائع نہ ہو سکا" ——— مدیرین مجلہ عثمانیہ کا یہ وہ قومی ترانہ ہے جسے ہر مدیر نے بلا تفریق مذہب و

ملت الاپا ہے۔ مجلہ کی سولہ سالہ جلدیں دیکھ ڈالئے، ہر شمارہ میں آپ کو پریس کی بدعنوانیوں کا ایک دفتر ملے گا۔ انتظامی مشکلات کو احاطۂ تحریر میں لانا اور طباعت کی دقتوں کے حدود کو متعین کرنا آسان نہیں۔

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

"مردہ بدست زندہ" والی مثل تو آپ نے سنی ہوگی۔ "مجلہ بدست مطبع" والی مثل بھی سن لیجئے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مجلہ کی بروقت اشاعت ناممکن ہے۔ ہماری رائے میں پریس کی تکالیف اور گوناگوں طباعتی مصائب کا واحد حل یہی ہوسکتا ہے کہ مجلہ کے لئے ذاتی پریس فراہم کیا جائے۔ پریس کی خریدی کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے حسبِ ذیل امور کی پابندی ناگزیر ہے۔

(۱) مجلہ عثمانیہ پریس فنڈ قائم کیا جائے۔

(۲) جملہ اساتذہ صاحبان جامعہ عثمانیہ کے لئے مجلہ کی سالانہ خریداری لازمی قرار دی جائے۔

(۳) ہر سال مجلہ کے موازنہ میں بچت برآمد کی جائے۔

اگر عالیجناب نائب معین امیر جامعہ آئندہ سال سے اساتذہ صاحبان جامعہ کے لئے مجلہ کی سالانہ خریداری لازمی قرار دیکر اس آمدنی کو پریس کے مقصد کے لئے بالکلیہ وقف فرمادیں نیز موازنہ کی بچت بھی سال بہ سال مذکورۂ بالا پریس فنڈ میں جمع ہوتی رہے تو قلیل مدت میں مجلہ کے لئے ذاتی پریس کے حصول کا موقع بہ آسانی پیدا ہوسکتا ہے اور بعد کو مجلہ کی ماہواری اشاعت کے امکانات پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔

زائد امتحان

جامعہ عثمانیہ کی تاریخ میں اس سال پہلی مرتبہ عثمانیہ کلیہ طبیہ کے ناکام متعلمین کے لئے زائد امتحان کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ گو یہ طلباء کا ایک دیرینہ مطالبہ تھا لیکن اس سال انجمن اتحاد کلیہ طبیہ کے سرگرم

معتمد مسٹر سید عبدالجلیل اور ان کے رفقاءِ کار نے اس کو تسلیم کروانے کے لئے بڑی جد وجہد کی۔ آخر کار انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ ہم اس خصوص میں برادرانِ کلیۂ طبیہ کو پُر خلوص مبارکباد دیتے ہوئے اربابِ جامعہ کی خدمت میں اپنا ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں، ساتھ ہی طلباء کلیات فنون وسائنس وانجنیرنگ اور طالبات کلیۂ اناث کے لئے بھی زائد امتحان کے انعقاد کا مطالبہ کرتے ہیں۔ سال میں دوبار امتحان کا تجربہ مختلف جامعات میں اپنی دوررس افادیت کی بدولت نہایت کامیاب ثابت ہوچکا ہے۔ اس مطالبہ کی معقولیت اور واجبیت کو ثابت کرنے کے لئے دلائل وبراہین کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اپنے ہمدرد ارباب بست وکشاد سے قوی امید ہے کہ وہ کلیہ طبیہ کے متعلمین کی طرح کلیات جامعہ عثمانیہ کے طلبہ وطالبات کیلئے بھی ان جائز مراعات کا بہت جلد اعلان فرمائیں گے۔

محمد علی نیر ایم۔ اے (آخری)

مہتمم مدیر و مدیر حصہ اُردو

فیروز

محمد قلی قطب شاہ سے قبل کا ایک اُردو شاعر

محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) بانی حیدرآباد سے قبل کے اُردو شاعروں کے نام تو ملتے ہیں لیکن کلام دستیاب نہیں ہوا۔ ۹۸۸ھ سے قبل کے شعرائے اُردو میں ملا خیالی، فیروز، اور محمود کا ذکر اب تک قدیم اُردو شاعری کے کئی تذکروں میں چھپ گیا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کے کلام کا بھی نمونہ اب تک نہ مل سکا تھا اور اسی لئے کسی تذکرے میں شائع نہ ہو سکا۔

اتفاق سے فیروز کی ایک مثنوی ادارۂ ادبیات اُردو کے قلمی نسخوں میں دستیاب ہو گئی جو ۹۷۲ھ سے قبل کی تصنیف ہے۔ اور آج سے ٹھیک ۳۹۰ سال قبل کی اردو کتاب ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

فیروز عہد ابراہیم قطب شاہ (۹۵۵ھ تا ۹۸۸ھ) کا ایک مشہور شاعر ہے جس کی استادی اور کمال کی شہرت قطب شاہی دور کے خاتمے تک عروج پر تھی۔ عہد محمد قلی قطب شاہ کے ملک الشعرا ملا وجہی نے اپنی کتاب قطب مشتری (۱۰۱۸ھ) میں اس باکمال شاعر کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے! —

کہ فیروز آ خواب میں رات کوں — دعادے کے چومے مرے ہاتھ کوں
کھیا ہے توں یو شعر ایسا سرس — کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہوس
تو یوں کر کہ خصلت یو تج آئے نا — کہ توں خوش اچھے ہور کسے بھائے نا
توں ایسی طرز دل تے پنجا نوی — کہ دُسرے کریں سب تری پیروی
وجہی ترا ذہن جیوں برق ہے — تجے ہور بعضیاں میں لئی فرق ہے

(یعنے جب یہ کتاب لکھنی شروع کی تو فیروز خواب میں آئے اور دعادے کر ہاتھ چومے اور ہمت افزائی کی کہ تو نے ایسے دلچسپ شعر لکھے کہ تمام عالم ان کو پڑھنا چاہتا ہے۔ اور نصیحت کی کہ تو ایسی خوبی نہ پیدا کر کہ خود تو خوش ہو اور دوسرے پسند نہ کریں۔ بلکہ تو ایسی نئی طرز اپنے دل سے نکال کہ دوسرے بھی اس کو پسند کر کے تیری پیروی کریں۔ اے وجہی تیرا ذہن برق کی طرح ہے اور تجھ میں اور دوسروں میں بڑا فرق ہے۔)

ملک الشعرا وجہی کے ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز کو وہ اپنا بزرگ سمجھتا تھا۔ کیا تعجب کہ فیروز وجہی کا استاد ہو۔ جب ہی تو اس کے خواب میں آکر دعا دینے' نصیحت کرنے' اور تعریف و ہمت افزائی کرنے کا تذکرہ کرتا ہے۔

وجہی کے ایک عرصہ بعد ۱۰۶۶ھ میں گولکنڈہ کے ایک اور شاعر ابن نشاطی نے اپنی مثنوی پھول بن میں بھی استاد الشعرا فیروز کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس امر پر اظہار افسوس کرتا ہے کہ اس زمانہ میں استاد فیروز موجود نہیں ہیں جو میری شاعری کی سچی داد دیتے۔ اس کا شعر ہے۔

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد — جو دیتے شاعری کا کچ مرے داد

اس شعر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فیروز اپنے تلامذہ کی بڑی ہمت افزائی کیا کرتا تھا اور شعرا اس کی داد کو شاعرانہ کمال کا اصلی صلہ سمجھتے۔ یعنی جس شاعر کی وہ تعریف کر دیتا اس کا کمال مستند و مسلم ہو جاتا۔

گولکنڈہ کے اس عظیم الشان شاعر کو اُردو دنیا گذشتہ دو صدیوں میں بھول چکی تھی۔ سب سے پہلے اس کو اُردو شہ پارے میں روشناس کیا گیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد دکن میں اُردو اور اردوئے قدیم کے دوسرے ایڈیشنوں میں بھی اس کا ذکر شریک کیا گیا۔ اُردو شہ پارے میں اس کے متعلق لکھا گیا ہے کہ:۔

> وجہی نے بھی قطب مشتری کے دیباچہ میں اس کو اُردو شاعری کا استاد بتایا ہے وجہی اپنی شاعری کی خواہ مخواہ تعریف نہیں کرتا بلکہ اس کا بیان ہے کہ فیروز نے خواب میں آکر اس کی شاعری کو تسلیم کیا۔ اور اس کی شاعری سے خاصہ اثر لیا۔
> وجہی جیسے مغرور شاعر کا جب یہ خیال ہو تو ظاہر ہے کہ فیروز بہت بڑا شاعر تھا۔ لیکن یہ نہایت بدقسمتی ہے کہ ان دونوں شاعروں (فیروز اور محمود) کے حالات اور ان کے حالات اور ان کے کارناموں کے متعلق ہیں اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں"۔ صـ۴۳

ہماری یہ بدقسمتی ٹھیک چودہ سال بعد خوش قسمتی میں بدل گئی جب ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں خود فیروز کی کتاب "توصیف نامہ" داخل ہوئی۔ اور ہم اس قابل ہوئے کہ اس استاد شاعر کے کچھ حالات اور اس کے کلام کا نمونہ پیش کر سکیں۔ اُردو شہ پارے کی اشاعت کے بعد سے جن جن کتابوں میں فیروز کا ذکر کیا گیا وہ ان ہی ابتدائی معلومات پر مبنی تھا جو اُردو شہ پارے میں درج کی گئیں اور کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا کہ فیروز کی نسبت معلومات میں کچھ اضافہ کر سکے۔

فیروز کی زیر نظر کتاب تاریخ ادب اُردو کے ایک اہم خلا کو پُر کرتی ہے۔ جیسا کہ اس مضمون کے آغاز میں لکھا گیا ہے کہ اب تک سلطان محمد قلی قطب شاہ سے قبل کے بہت کم شاعروں کا پتہ چل سکا ہے اور گولکنڈہ کے تو کسی ایسے شاعر کا کلام نہیں ملا تھا۔ جس کا تعلق عہد ابراہیم قطب شاہ سے ہو یا جو محمد قلی قطب شاہ سے پہلے گزرا ہو۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ خود فیروز کی اس مثنوی سے اس کی نسبت کچھ معلومات حاصل ہو گئیں اور کیا تعجب کہ اس کتاب کی طرح اس کی اور دوسری کتابیں بھی موجود ہوں اور بعد کو ہمیں دستیاب ہو جائیں

فیروز ملا خیالی کا ہم عصر اور ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا بڑا شاعر تھا۔ یہ کتاب اس نے محمد قلی قطب شاہ کی پیدائش سے چند سال قبل لکھی تھی۔ وہ بیدر کے مشہور صوفی اور صاحب تصانیف عالم مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم کا معتقد اور مرید تھا۔

مخدوم جی شیخ محمد ملتانی کے بڑے صاحبزادے اور بیدر کے مشہور و معزز مشائخین میں سے تھے مشکوٰۃ النبوۃ اور دوسری کتابوں میں ان کے تفصیلی حالات درج ہیں۔ وہ صاحب کشف و کرامات او خارق عادات تھے۔ تصوف کے مسائل میں کئی کتابیں لکھی تھیں۔

تذکرۂ اولیائے دکن میں لکھا ہے کہ :-

"باوجود کبر سنی تمام شب عبادت کرتے تھے۔ آپ عالم فاضل وولی کامل تھے۔ جامع کمالات انسانی و فضائل روحانی تھے۔ دکن میں آپ کے خوارق مشہور ہیں۔" ص۸۴۲

اس کے بعد چند خوارق و عادات نقل کئے ہیں جن میں سے ایک کا خلاصہ یہ ہے کہ

"ایک شیعہ امیر شاہ جی المخاطب صدر جہاں کو سنی درویشوں سے کوئی اعتقاد نہ تھا۔ مخدوم جی کی شہرت سن کر ان کے امتحان کی خاطر دل میں یہ خیال کر کے آیا کہ اگر وہ حضرت علی کے فضائل بیان کریں گے تو میں ان کو درویش کامل سمجھونگا جب وہ مخدوم جی کی خدمت میں پہنچا تو وہ حضرت علی کے فضائل ہی بڑی خوبی سے بیان کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ بڑا معتقد ہو گیا۔ اور اکثر ان کی خدمت میں آتا رہا۔"

مخدوم جی اپنے والد کے سجادہ نشین تھے۔ امیروں سے بہت کم ملتے اور کسی دنیادار کے

یہاں نہ جاتے۔ ان کے ذکر و شغل کی شہرت بیدر سے تعہ گولکنڈہ تک پہنچ چکی تھی۔ یہاں کے اکثر لوگ ان کے یہاں جاتے اور فیض پاتے۔ ان کے کمالات کی شہرہ سُن کر ایک وقت ابراہیم قطب شاہ نے بھی ملاقات کی درخواست کی تھی لیکن انہوں نے گولکنڈہ آنے سے انکار کردیا۔ یہ بادشاہ ایسے بزرگوں کا بڑا معتقد تھا۔ چنانچہ اپنے خاندان کی اکثر لڑکیاں مشائخین اور صوفیا سے بیاہ دی تھیں۔ اور اپنے بڑے لڑکے شاہ عبدالقادر کی شادی بھی بیدر کے مشائخ خاندان میں کی تھی۔ اس اعتقاد کی بناء پر عرض کرایا کہ مخدوم جی بیدر سے تشریف۔ لاتے ہوں تو نعلین ہی بھیج دیں تاکہ میں نعلین بوسی سے مشرف ہوں۔ مخدوم جی نے کہلا بھیجا کہ سلاطین درویشوں سے مدد چاہتے ہیں۔ میں آپ کو تمام مسلمانوں کے ساتھ دعا میں شریک کرتا ہوں یہ کافی ہے۔

مخدوم جی نے ۲۲۔ شوال ۹۷۲ھ کو وفات پائی اور بیدر ہی میں مدفون ہوئے۔

فیروز نے اس مثنوی "توصیف نامہ" میں مخدوم جی کے ساتھ انتہائی عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ میں نے خواب میں حضرت محبوب سبحانیؒ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ مخدوم جی ہو بہو ویسے ہی ہیں۔ اسی لئے وہ ان کو جگہ جگہ محی الدین ثانی لکھتا ہے۔ وہ دعا کرتا ہے کہ وہ عرصہ تک زندہ رہیں تاکہ میں ہمیشہ مئے وحدت پیتا رہوں۔ وہ اپنے مرشد کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

مدح مخدوم جی

براہیم مخدوم جی جیو نا　　کہ مے صرف وحدت سدا پیونا
مرا پیر مخدوم جی جگ منے　　سنگوں نعمتاں (میں ۱) اس کنے
کریں منجہ اپر پیار لے پیو جگ　　کہ تجہ پیار تھے ہوے مند ہیر جگ
پیا جیو تھے تو ہمن باس ہے　　تو ہم جیو کے پھول کا باس ہے

وہی پھول جن پھول کی با تر توں ۔۔۔ وہر اجیو جس جیو کی آس توں
سوتوں روک ہے دین کا باروار ۔۔۔ جو تجہ چاہو تل جگ ہے پکڑیا قرار
اچھو منجہ اُپر چانو تیرا جرم ۔۔۔ کہ آدھار میرا سو تیرا کرم
کریماں کی مجلس کرامت تجے ۔۔۔ امیناں کی صف میں اما مت تجے
سدامست مدہوش دیدار کا ۔۔۔ سچا توں طلب گار کرتار کا
محی الدین مخدوم جی جاگنا ۔۔۔ ہمیں جیو اُس پیر سوں لاگنا
اہے پیر مخدوم جی جانیا ۔۔۔ محی الدین و دوجے یو جم آئیا
تجے راوتے جگ رانا جنم ۔۔۔ محی الدین سوتوں کمانا جنم
مجے دان دے دین و دل شاد کر ۔۔۔ دنیا کے گناہاں تے آزاد کر
نگہبان میرا توں انج رکھ ننگا ۔۔۔ مجے دوے دشمن تھے تیرا پناہ
جسے پیر مخدوم جی پاک ہے ۔۔۔ اُسے دین و دنیا میں کیا باک ہے

یہ ابیات مسلسل نہیں بلکہ مختلف مقامات سے منتخب کی گئی ہیں اور ان سے مخدوم جی سے متعلق تاریخوں کے اُن بیانات کی تصدیق ہوتی ہے جو اوپر درج کئے گئے ہیں۔ البتہ اس واقعہ کا بھی ہوتا ہے کہ مخدوم جی گولکنڈہ کے اس شاعر کو بہت چاہتے اور اس پر بڑے مہربان تھے۔

فیروز کی زبان محمد قلی قطب شاہ سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن محمد قلی نے پنڈتوں اور ہندو ماہر موسیقی کی صحبت میں ہندی کا عنصر اپنے کلام میں زیادہ کر دیا تھا۔ فیروز کے کلام کی روانی سے ظاہر ہے کہ وہ ایک مشاق شاعر تھا اور اس مثنوی سے قبل اس نے شاعری میں کمال حاصل کر لیا تھا۔

شاعر نے اپنا تخلص ان ابیات میں لکھا ہے۔

تو فیروز خستہ کو (ات) مان دے ۔۔۔ منگوں دان تجہ کن (توں) اپنا دے

سو فیروز سہنے میں پایا رتن ۔ رکھیا سو رتن ڈھانک جیو سوں رتن (۵ ب)

رتن خاص فیروز جب پائیا ۔ پدک دل منے لال پسلائیا (۵ ب)

افسوس ہے کہ فیروز کی اس مثنوی کا یہ نسخہ ناقص الآخر ہے اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اصل مثنوی کتنی ابیات پر مشتمل تھی۔ بحالتِ موجودہ اس میں سو سے زیادہ ابیات ہیں اور یہ مخدوم جی کی زندگی ہی میں ۹۷۲ھ سے قبل حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؓ اور مخدوم جی کی مدح میں قلمبند کی گئی ہے۔ اس کا آغاز و اختتام ان ابیات پر ہوتا ہے :-

آغاز

تُہیں قطب اقطاب جگ پیر ہے ۔ تُہیں غوث اعظم جہانگیر ہے

تہیں چاند باقی ولی تارے ہیں ۔ توں سلطان سردار سارے ہیں

اختتام

نگہبان میرا توں مجہ رکھ نگاہ ۔ مجے دوے دشمن تھے تیرا پناہ

جسے پیر مخدوم جی پاک ہے ۔ اُسے دین و ایمان میں کیا باک ہے

جسے پیر مخدوم جی سائیاں ۔ دھرے ....

یہ نسخہ خطِ ثلث میں ۱۱۰۰ھ سے قبل نقل کیا گیا ہے افسوس ہے کہ کاتب نے لکھتے لکھتے کتابت ترک کر دی ہے۔ ورنہ استاد فیروز کا اس سے زیادہ کلام آج محفوظ ہو جاتا۔

سیّد محیُ الدین قادری زور

روس کا شیکسپیر

روس کا سب سے بڑا اور دنیا کا بہت بڑا شاعر "پشکن" ۲۶ مئی ۱۷۹۹ء کو ماسکو میں پیدا ہوا۔ ادبی دنیا میں یہ روس کا پہلا نمائندہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب "رومانیت" کی انقلابی تحریک ابتدائی مراحل سے کچھ ہی آگے گزر چکی تھی یہ لڑائیوں، بغاوتوں، اور عہد آشوب کا روس تھا جبکہ آزاد خیال "پیٹر اعظم" ہر ایسی چیز جس میں روسی، قومی یا ایشیائی رنگ و بو تھا نکال کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی موقع پر گزشتہ صدی کے ایک مشہور روسی مصنف نے کہا تھا "پیٹر نے روس کو اعلان جنگ دیا۔ روس نے اس کے جواب میں پشکن کو پیدا کیا"۔

نو برس کی عمر تک اس میں غیر معمولی اور قبل از وقت نشو و نما کی کوئی علامتیں ظاہر نہیں ہوئیں لیکن بعد ازاں پڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا اور یہ روز افزوں ذوق و شوق اس کی آخری عمر تک جاری رہا۔ اس نے "پلوٹارک" کی "سوانح حیات" ایلیڈ اور اوڈیسی کے ترجمے پڑھے اور پھر گھر کے کتب خانے میں جتنی فرانسیسی زبان کی کتابیں تھیں سب چاٹ گیا۔ اس کے بھائی "لیو" کا بیان ہے کہ پشکن نے ۱۱ سال کی عمر میں تمام فرانسیسی ادب زبانی یاد کرلیا تھا۔ ۱۸۱۲ء سے اس کی طالب علمی کا زمانہ شروع ہوتا ہے اسے "لائی سی" اسکول میں شریک کر دیا گیا۔ اگرچہ اس کا اسکول کیریر کوئی نمایاں خصوصیت نہیں رکھتا۔ تاہم "لائی سی" کی تعلیمی فضا نے شاعر کے جوہر شاعری کو چمکانے اور ترقی دینے میں بڑا حصہ لیا اور وہ طالب علمی ہی کے زمانے سے معیاری اشعار لکھنے لگا۔ وہ فرانسیسی زبان کو اپنی زبان سے زیادہ اچھی طرح جانتا تھا چنانچہ اس نے پہلے فرانسیسی زبان میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ "لائی سی" کے لڑکے

اُسے فرانسیسی شاعر پکارتے تھے۔ لیکن یہ دور طویل نہ رہا اور وہ بہت جلد فرانسیسی زبان چھوڑکر روسی زبان میں لکھنے لگا۔ ۱۸۱۳ء میں بزمانہ تعلیم اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ "سارخوف سیلو کی یاد" شائع ہوا جس کا انتساب اُس نے اپنی بہن کے نام کیا تھا۔ یہ نوجوان اور پرجوش نظمیں فرانسیسی ادب کے اثرات کا پرتو تھیں۔ ان میں بالخصوص والیٹر پار۔نے اور شِنی نیر کی تقلید کی گئی تھی۔ اگرچہ انہیں انیچ اور جدت پسندی کم تھی تاہم یہ نظمیں اس کی قوتِ فکر اور جوہر شاعری کا اس درجہ آئینہ دار تھیں کہ انہوں نے اُس وقت "کارم زین" اور "ہوخووسک" جیسے بڑے شعرا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یہ دونوں ادبی معاصر "پشکن" کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جبکہ وہ ہنوز اسکول بنچ پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ "پشکن" خود کو "ہوخووسک" کا شاگرد سمجھتا تھا۔ اگرچہ اُس نے بہ نسبت دوسرے شاعروں کے اس کی تقلید بہت کم کی۔

۱۸۱۷ء میں پشکن اپنی تعلیم "لائی سی" میں ختم کرنے کے بعد ۱۸۱۸ء سے "کارم زین" کی ادبی محفلوں اور "ہوخووسک" کی شام کی پارٹیوں میں مستقل طور سے حصہ لینے لگا۔ یہ روایت مشہور ہے کہ "ہوخووسک" کی ادبی محفلوں میں جب اُس نے "روسلان لودمیلا" کا پہلا باب سنایا تو ہوخووسک نے اپنی ایک تصویر اس تحریر کے ساتھ "پشکن" کے نذر کی "شاگرد کو اُس کے شکست خوردہ استاد کی طرف سے" اس موقع پر ایک معاصر مشہور روسی شاعر "بانی یوش کود" جو اس قسم کی شاعری میں پہلے ہی سے درجۂ کمال حاصل کرچکا تھا اور جس نے روس میں شاعری کے ایک نئے اسکول کی بنیاد رکھی تھی۔ پشکن کی سنجیدہ اور منجھی ہوئی شاعری کو خود سے کہیں بہتر پاکر چلا اٹھا تھا:۔

"اُف ظالم نے کس استادی سے لکھنا شروع کیا ہے"۔

۱۸۲۰ء میں جب یہ نظم پہلی مرتبہ شایع ہوئی تو پبلک نے اس کا بہت پرجوش استقبال کیا اور "پشکن" کی شہرت پر قطعی طور سے مہر لگ گئی۔ "بائرن" کی طرح اس نے سویرے اٹھکر خود کو مشہور نہیں پایا بلکہ وہ شہرت کے محل میں فطری طور پر اُسی طرح داخل ہوا جیسے ایک نوجوان وارث اپنی جائز قانونی ملک میں قدم رکھتا ہے۔ یہ

رزمیہ نظم "روسلان لودمیلا" چھ بابوں پر مشتمل ہے۔ اس کا موضوع دیہاتی روس کے متداول روایات و عقائد ہیں لیکن اس کا پس منظر اٹھارہویں صدی کا فرانس ہے جس میں کہیں کہیں ارسٹو کا تخیل کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ نظم ہر قسم کے تصنع۔ رسمی اصطلاحوں اور استعاروں سے پاک ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی اشاعت کے ساتھ ہی روسی شاعری کے لئے ایک نئی راہ کھل گئی۔ فرانسیسی ادب کے یہ تاثرات جواب تک اس کی شاعری کا گہوارہ بنے رہے اس نظم میں آتشبازی کی طرح پھوٹ کر شعلہ فشاں ہوئے اور اُن کی تیز چنگاریاں رفتہ رفتہ فضاؤں میں ہمیشہ کے لئے بکھر گئیں۔

فرانس کی اٹھارویں صدی کی شاعری کی خصوصیت "عاشقانہ رنگ" اور "عیش پسندی" تھی۔ اس قسم کی شاعری سے پشکن کی فطرت کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ وہ لاأبالی اور عیاشانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۰ سال کی تھی۔ اسی زمانے میں اُس نے سیاسی تحریک کے بعض باغیوں کے ساتھ شناسائی پیدا کی جن کو ڈسمبریوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سازش کی اصل غایت الگزنڈر اول سے بجبر آئینی حکومت حاصل کرنا تھی لیکن اس سازش کی خبر ہوگئی۔ سرغنوں کو سائبریا جلا وطن کر دیا گیا۔ اور "پشکن" جنوبی روس کے ایک قصبے "اکاتری نوسلات" بھیجا گیا۔ اس جلا وطنی سے پہلے جو باغیانہ نظمیں شاعر نے لکھی تھیں ان میں سے میں ایک نظم کا ذکر کروں گا۔ یہ نظم انقلابیوں کے لئے کہی گئی تھی۔ اس گیت میں ہم پشکن کی انقلابی آواز سنتے ہیں۔ ایک دلیرانہ پیام تھا اور اس میں سائبریا کے جلا وطنوں کو ان کے مستقبل کے متعلق ایک زبردست امید دلائی گئی تھی۔ نظم سنیئے۔

سائبریا کے معدنی کانوں میں ——— اپنے صبر کو مغرور رکھ' اور آہستہ آہستہ کام کیے جا ——— نہ تو تیرا یہ غمناک عمل رائیگاں جائے گا ——— نہ ہی تیرے تخئیل کی بلندی پست ہوگی ——— تیرے تاریک' زمین دوز محبسوں کی سلاخوں کے پیچھے ——— ایک دن دوستی اور محبت تجھے خوش آمدید کہے گی ——— اور اُس وقت تیرے مجرم قرار دیے ہوئے ضمیر کے

اندر ــــــ میری آزادی سے محبت کرنے والی آواز گونجے گی ــــــ تیری بھاری زنجیریں ٹوٹ کر گر جائیں گی ــــــ تیرے قید خانے پاش پاش ہو جائیں گے اور آزادی ــــــ وفور مسرت کے ساتھ دروازے پر تیرا استقبال کرے گی ــــــ تیرے بھائی تیرے ہاتھ میں تلوار تھما دیں گے

۱۸۲۰ء سے ۱۸۲۴ء تک "پشکن" جنوبی روس میں رہا۔ یہ اس کی شاعری کا دوسرا دور تھا۔ اب بائرن اُس کا پسندیدہ شاعر تھا اور اس دور کی تمام تر شاعری پر بائرن کا گہرا پرتو ہے۔ بائرن یورپ کا مقبول ترین شاعر اپنی تمام رومانیت کے ساتھ اُس پر مسلط تھا اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بائرن سے یہ عقیدت متعدد حسین نظموں کی تخلیق کا باعث ہوئی باایں ہمہ دونوں شاعروں کی سیرت اور ذہنی رجحان میں اس قدر انقلاب تھا کہ پشکن پر بائرن کا رنگ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس بائرنیت نے "پشکن" کے لئے اس کی اپنی غیر معمولی فطری ذہانت کی چوٹی پر پہنچنے کے لئے صرف ایک سیڑھی کا کام کیا۔ جو لطیف معنوں میں تخیلی نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ تھا۔

جنوبی روس سے واپس ہوتے وقت شاعر نے 'کریمیا' قاف اور متعدد مقامات کی سیر و سیاحت کی۔ کریمیا کے ماحول نے اُس کی رومانی مزاج میں ایک نئی جولانی پیدا کی۔ اس وقت کریمیا ایک تباہ حال اسلامی شہر تھا، جو اسلامی، عیسائی، یہودی اور مختلف تمدنوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ یہاں کے قہوہ خانے 'سرو اور مسجدوں کی قطاروں میں گھری ہوئی سفید شاہراہیں اور نازک نازک نقاب پوش عورتیں ــــــ یہ وہ مناظر تھے جن سے ہمارا شاعر بہت متاثر ہوا۔ یہیں اس نے اپنی طویل بہترین نظم "باغچی سرائے کا چشمہ" لکھی۔ پھر جب وہ قاف گیا تو وہاں کی طویل مسلسل پہاڑیاں، دلفریب قدرتی مناظر اور وہاں کے باشندوں کی فطری آزادی اُسے ایسی بھائی کہ اُس نے اُس پر ایک نظم "قاف کا قیدی" ۱۸۲۰ء میں تصنیف کی۔ بعد ازاں وہ بسریبیا کے دارالخلافہ میں کش نف میں مقیم ہوا۔ کبھی زمانے میں اہل روما کے قبضہ میں تھا اور اس وقت خانہ بدوش جپسیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ "پشکن" نے اپنی بلند پایہ تصنیف جپسی ۱۸۲۷ء میں اسی

مقام پر لکھی۔ بسر بیا میں "پشکن" کا قیام اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں اُس کا تخلیقی جوہر اپنے شباب پر پہنچ جاتا ہے اور وہ اچھے ایام جوانی کے مصنوعی کلاسکل اثرات سے آزاد ہوکر جدید اور خارجی تجربات کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ یہاں اُس نے بہت سی بلند پایہ نظمیں لکھیں۔ ان میں "شاعری کی دیوی" اور "اولیغ کا نغمہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں "پشکن" نے یہیں اپنی سب سے بڑی اور معرکۃ الآرا نظم" یوگینی انی گن" کی بنا ڈالی۔ یہ نام اس نظم کے ہیرو کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ زبان اور موسیقیت کے اعتبار سے روسی ادب کی لطیف ترین چیزوں میں سے ہے۔ "یوگینی" کی تصنیف میں ۹ سال صرف ہوئے۔ یہ نظم رومانی شعرا کے قدیم اور مسلمہ اصولوں پر لکھی گئی ہے۔ بائرن کی "ڈان جوان" اور "مادام دے اسٹیل" کی "دفنین" کی طرح یہ بھی واردات انسانی کا ایک زبردست مرقع ہے اور اتنی جدید ہے جیسے کہ آجکل کے ماحول میں لکھی گئی ہے۔ اس شہرۂ آفاق تصنیف کا ذکر میں ذرا تفصیل کے ساتھ کروں گا۔

ہیرو ——— " یوگینی انی گن" ایک امیر باپ کا بیٹا ہے۔ لاڈ پیار میں پرورش پاکر اوباشوں کی صحبت اختیار کی۔ آوارگی جزو زندگی بنی اور بنتی گئی۔ لیکن پھر ایک انقلاب آیا اور وہ ان حسین گناہوں سے بیزار ہوگیا شہر کو چھوڑ گاؤں کو آیا۔ یہاں بھی جی نہ لگا طبیعت نہ بہلنا تھی نہ بہلی۔ اضطراب۔ خلش۔ یاس اور افسردگی نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ناگاہ" لارن" نام کے ایک معزز خاندان کی دو نوجوان خوبصورت لڑکیوں سے اس کا تعارف ہوا۔ "تت یانا" اور "دولگا" بہنیں بہنیں تھیں۔ "تت یانا" بڑی تھی۔ یہ ایک خاموش اور سنجیدہ لڑکی تھی جس کی کل کائنات بس اس کے تخیلات کی مغموم فضا تھی جس میں ہر وقت وہ ڈوبی رہتی۔ ——— "انی گن" سے جس وقت اس کی پہلی ملاقات ہوئی اُسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کی زندگی کا سوز اس کی سانس کی گرمیوں سے پگھلنے لگا ہے اور وہ جیسے آج تک اُسی کا انتظار کررہی تھی لیکن افسوس کہ "انی گن" کی طرف سے محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا گیا۔ اور اس روح فرسا خاموشی سے تنگ آکر

نادان لڑکی نے اُسے ایک محبت نامہ لکھا جس میں "اعترافِ محبت" کیا۔ "انی گن" نے خلاف توقع جواب دیا۔۔۔۔"گھریلو زندگی میری قسمت میں نہیں۔ محبت سے میری روح ناآشنا ہے۔ تمہارا میرے ساتھ رہنا اپنے حسن و جمال کو برباد کرنا ہے کیونکہ میں تمہارے پاک جذبات اور معصوم حسن کی قیمت کو نہیں سمجھ سکتا۔"

اس واقعہ کے بعد "انی گن" نے گاؤں چھوڑ دیا اور یورپ کے سفر کو چلا گیا۔۔۔۔ زمانہ گزرتا گیا۔

"تت یانا" اپنی محبت کی دبی ہوئی آگ میں خاموشی کے ساتھ جلتی رہی۔ اِس جلن ہی میں اُس کے دل کی ٹھنڈک تھی۔ اُس نے عہد کرلیا کہ وہ کبھی شادی نہ کرے گی لیکن ماں باپ نے اس "ہٹ" کو نہ مانا اور انہوں نے ماسکو کے ایک امیر جنرل سے اُس کا بیاہ کردیا۔ "انی گن" یورپ کی سیر سے واپس آیا اور ایک محفل رقص میں اچانک ان کی ملاقات ہوئی۔ "تت یانا" کا دل اب تک اس کی لگائی ہوئی آگ میں دھیرے دھیرے سلگ رہا تھا۔ لیکن وہ ایک خود دار عورت تھی۔ دل کی بات کو دل ہی میں رکھا۔ مگر آنکھوں نے غمازی کی۔ "انی گن" سب کچھ سمجھ گیا۔ بہت متاثر ہوا۔ چاہا کہ پرانے تعلقات پھر قائم کرے۔ یہ پچھتاوا بعد از وقت تھا اور اس لئے وہ بیمار ہوگیا۔ اسی حالت میں ایک دن "تت یانا" کے مکان پر پہنچا۔ شوہر گھر پر نہ تھا۔ "تت یانا" نہ جانے کیوں کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی۔۔۔۔ اور وہ بولی۔ "کیا میں غلط کہتی ہوں کہ اسی بستی سے کچھ دور ۔۔۔۔ جہاں ہماری محبت کو رسوائی کا ڈر نہ تھا۔۔۔۔ تم نے مجھے ٹھکرا دیا تھا؟ اب کون سی بات ہوئی۔۔۔۔ کہ تم مجھے چھیڑنے آئے ہو۔۔۔۔ جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا۔۔۔۔ تم کو جاننا چاہیئے میں نے شادی کرلی ہے۔۔۔۔ میں تمھیں فریب نہیں دیتی۔ میں تمھیں چاہتی ہوں۔۔۔۔ لیکن اب میں کسی اور کی بیوی ہوں۔۔۔۔ اور وفاداری میرا فرض ہے۔۔۔۔

"تت یانا" کمرہ چھوڑ کر چلی گئی۔۔۔۔ یہ داستان یہاں ختم ہوجاتی ہے اور پڑھنے والا کچھ سوچنے لگتا ہے۔

ماسکو واپس آنے پر اُس کی بڑی آؤبھگت ہوئی لیکن کسی عدول حکمی کی پاداش میں اُسے پھر جلاوطن

کیا گیا لیکن جلد ہی معافی بھی دیدی گئی۔ اور جب "زار نکولائی اول" کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اپنے آپ کو "پشکن" کا محتسب قرار دیا اور اُسے دربار میں ایک بڑے عہدے پر مامور کیا۔ اس موقع پر ایک روایت یہ بہت مشہور ہے کہ شہنشاہ نے اسی شب کو محفل رقص میں اپنے ایک مصاحب خاص سے کہا تھا "آج میں نے روس کے سب سے زیادہ ذی ہوش شخص سے بات کی ہے"۔

۱۸۳۱ء میں پشکن نے ایک نوجوان حسین لڑکی "نتالیا گنجاروا" سے شادی کرلی۔ یہ ایک فضول خرچ، سرد مہر، آوارہ اور کمزور کردار کی سوسائٹی پرست عورت تھی۔ ازدواجی زندگی میں اس کو اپنے شوہر کے ساتھ جو کچھ بھی ہمدردی رہی اس کا سبب اُس کی پرجوش محبت نہ تھی اُس نے اُس سے بغیر محبت کے شادی کی تھی اور "پشکن" یہ بات جانتا تھا اُسے امید تھی کہ وہ محبت کا سچا جذبہ اُس میں بھی پیدا کر دے گا لیکن باوجود اپنی خالص محبت کے وہ کبھی کامیاب نہ ہوا۔ اس نے ایک قانونی بیوی کی حیثیت سے خود کو اس کے حوالے کیا نہ کہ ایک پرستار چاہنے والی شریک زندگی کی حیثیت سے "نتالیا" کی اس بے رخی کا اظہار اس نے اپنی متعدد نظموں میں کیا ہے۔ یہ نظم دیکھیے:۔

اُف تو کتنی زیادہ حسین اور کتنی مغرور ہے —— اور کتنی زیادہ تکلیف کے ساتھ میں تجھ سے خوشی حاصل کرتا ہوں —— میری طویل التجاؤں کو گھیرنے کے بعد —— تو اپنی نزاکتوں کے ساتھ خود کو میرے حوالہ کرتی ہے —— افسوس تو ہر چیز سے بے خبر ہو کر شرماتی اور جھجکتی ہوئی —— میرے جذبات کا جواب بیباک ہو کر نہیں دیتی —— لیکن یہ شعلہ زیادہ اور زیادہ تجھ میں پھیلتا جاتا ہے —— یہاں تک تو اپنی طبیعت کے خلاف میرے شعلوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ پشکن اپنی بیوی سے محبت کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کو اپنے رنگ میں رنگ لے لیکن ایسا نہ ہوا معاملہ حد سے گزرتا گیا۔ ۱۸۳۶ء میں تو عام طور پر شہر میں "نتالیا" کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور پھر اس مضمون کے گمنام خطوط "پشکن" کے پاس آنے لگے کہ ایک

فرانسیسی افسر "ڈی اینتھیس"، اُس کی بیوی سے اظہار تعشق کرتا ہے۔ خوددار "پشکن" اب زیادہ اپنی توہین گوارا نہ کرسکتا تھا۔ اُس نے "ڈی اینتھیس" کے پاس پیام مبارزت بھیجا۔ یہ ڈوئل ۲۷ جنوری کے دن ہوئی جس میں "پشکن" مہلک طور پر زخمی ہوا اور دو دن مسلسل تکالیف برداشت کرنے کے بعد یہ نوجوان شاعر عالم شباب میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ مرتے وقت اس شاعر اعظم کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے :۔

"زندگی ختم ہورہی ہے۔ سانس لینا مشکل ہے میرا دم گھٹ رہا ہے"۔

"الگزنڈر پشکن" اپنے ہموطنوں کی عظمت، اُن کے زوال، دکھوں اور خوشیوں کو اشعار میں ظاہر کرنے والا سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ خالص شاعر تھا۔ اُس کا تخیل ہمیشہ بلندی کی طرف مائل رہا۔ وہ اپنے خیالات کو بہتر سے بہتر الفاظ میں ادا کرنے پر قادر تھا۔ اس کی شاعری جدت۔ اسلوب بیان، سادگی اور صفائی کے اعتبار سے روسی ادب میں خاص انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔ اُس کے استعمال کئے ہوئے الفاظ سادہ، برجستہ اور نگینوں کی طرح جڑے نظر آتے ہیں۔ یہ شاعر اعظم بالخصوص اپنے عشقیہ رنگ کی وجہ سے ممتاز ہے اور اُس نے عشق، یاس اور امید کے پس منظر پر بہترین نظمیں لکھیں۔ اُس کے گیتوں کی آواز اب بھی روس کے میدانوں میں گونج رہی ہے۔ اب میں "پشکن" کی ایک نظم پیش کروں گا۔ ذیل کی نظم اُس کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ ہر اعتبار سے اتنی جامع اور مکمل ہے کہ کوئی ترجمہ اصل کی حقیقی ترجمانی نہیں کرسکتا۔ تاہم جذبات کی روانی کا ایک دھندلا نقشہ کھینچا جاسکتا ہے۔ وہ نظم یہ ہے :۔

اور مجھے اپنی زندگی کی وہ مختصر ملاقات یاد ہے —— جب تو اپنی نزاکت تمام کے ساتھ —— ایک حسین خواب کی مانند حسن مجسم بن کر —— میرے سامنے ظاہر ہوئی —— جب میں مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گھر جاتا ہوں —— اور پُرہول تفکرات کے بھیانک سایے مجھے ڈراتے ہیں —— تب تیری شیریں آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے —— اور تیرے چہرے کے حسین مبہم نقوش میری آنکھوں میں ناچنے لگتے ہیں ——

دور ــــ بہت دور۔ جلاوطنی کی بیکسی میں ــــ میری زندگی آہستہ آہستہ اپنی بوجھل گاڑی کھینچ رہی تھی ــــ بغیر خدا ــــ اور بغیر روحانی فیضان کے ــــ بغیر آنسو ــــ بغیر محبت اور بغیر زندگی کے ــــ تب میرے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ کوئی چیز آئی ــــ میں نے تجھے دیکھا ــــ ساری لطافتوں کے ساتھ ــــ جب تو ایک حسین خواب کی مانند حسنِ مجسم بن کر ــــ میرے سامنے ظاہر ہوئی ــــ میرا دل اب غایت انبساط سے دھڑکتا ہے ــــ اور آسمانوں کی بلندی سے اُس کے اندر ــــ خدا اپنے روحانی فیضان کے ساتھ چھپ کر آتا ہے ــــ اور زندگی آنسوؤں سے مل کر ایک مقدس محبت میں تحلیل ہو جاتی ہے

علی احمد بی۔ اے (عثمانیہ)

قطعہ

بساطِ عرش پہ اپنا مقام پیدا کر ہر ایک ذرہ سے ماہِ تمام پیدا کر

نہ بیچ لعل و گہر کیلئے زباں اپنی جو دل کا تیر بنے وہ کلام پیدا کر

سید محمد یوسف ناظم متعلم ایم اے (آخری)

جنوبی ہند کی اُردو خدمات

(مقالہ کل ہند اُردو کانفرنس منعقدہ بنگلور)

صدر عالی قدر۔ معزز خواتین و حضرات ــــ "جنوبی ہند کی اُردو خدمات" کا عنوان آج کی محفل کے لئے نہایت موزوں معلوم ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا عنوان ہے جس پر گھنٹوں بولا جاسکتا ہے اور ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ لیکن میں نہایت اختصار کے ساتھ اپنے ناچیز خیالات کو آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ اُردو کا پہلا ادبی دور دکن میں ۱۵۹۰ء تا ۱۷۰۳ء قرار دیا جاسکتا ہے۔ جو قطب شاہی بادشاہوں، بیجاپور کے عادل شاہی حکمرانوں، شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اور ان کے جانشینوں کے عہد پر ختم ہوتا ہے۔ گولکنڈے کے قطب شاہی شاعروں میں اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ فرماں روائے گولکنڈہ ہے۔ وجہی۔ غواصی اور ابن نشاطی اردو شاعری کے اولین معمار ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا دور حکومت ۱۵۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۶۱۱ء پر ختم ہوتا ہے یہ بادشاہ ایک قادر الکلام اور پُرگو شاعر تھا۔ اس کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی شاعری ساحری سے کم نہیں۔ وہ نہ صرف اُردو ہی کا شاعر تھا بلکہ فارسی اور تلنگی میں بھی اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس کا کلیات تقریباً پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس کو عالی جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے بڑی تحقیق محنت اور خوش اسلوبی سے شایع کیا ہے۔ کوئی صنف سخن ایسی نہیں جس میں اس نے اپنا کمال نہ دکھایا ہو۔ قصیدے۔ غزلیات۔ قطعات۔ مخمس۔ مسدس۔ غرض

ہر صنف پر اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ ملا وجہی گولکنڈے کے قدیم اور ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں سے ہے۔ اس کی نثر کی کتاب "سب رس" اُردو نثر کا پہلا شاندار کارنامہ ہے جو ۱۶۳۴ء میں لکھی گئی۔ اس کی دوسری کتاب ایک شاندار مثنوی "قطب مشتری" ہے یہ بھی شایع ہو چکی ہے۔ اس مثنوی میں کئی غزلیں بھی ہیں۔ اس دور کا تیسرا نامور شاعر غواصی بھی ایک بلند پایہ سخن گو تھا۔ اس کی دو کتابیں "سیف الملوک بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" مجلس اشاعت دکنی مخطوطات حیدر آباد کی طرف سے شایع ہو چکی ہیں۔ ابن نشاطی نے ۱۶۵۵ء میں ایک طویل مثنوی "پھولبن" لکھی جسے پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری صدر شعبۂ اُردو و فارسی ایم۔ بی "مہاراجہ کالج میسور" نے نہایت تحقیق اور محنت سے شایع کیا ہے۔

بیجاپور کی سلطنت بھی برسوں اُردو علم و ادب کا گہوارہ بنی رہی اور اپنی علم نوازیوں سے اُردو کی تہی دامنی کو علمی جواہر سے مالا مال کر دیا۔ بیجاپور میں اُردو ادب کا بانی سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی تھا جس کا دور حکومت ۱۵۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۶۲۶ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس بادشاہ کا علمی و ادبی ذوق بہت اعلیٰ پایہ کا تھا۔ اس کا دربار عالموں اور فاضلوں کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا۔ ادب کے ساتھ ساتھ بادشاہ کو فن موسیقی سے بھی خاص لگاؤ تھا چنانچہ اس نے فن موسیقی کے متعلق ہندی زبان میں ایک کتاب "نورس نامہ" لکھی تھی جس کا دیباچہ فارسی کے مشہور انشا پرداز ملا ظہوری نے لکھا ہے۔ جو ابراہیم عادل شاہ ثانی کی علم نوازیوں کی شہرت سن کر بیجاپور آیا تھا۔ اور یہاں کی علمی و ادبی فضاؤں اور شاہانہ سرپرستیوں نے اس طرح اس کا دل موہ لیا کہ وہ یہیں پیوند خاک ہوا۔

بیجاپور کے عادل شاہی فرمانرواؤں نے بھی دل کھول کر اُردو کی سرپرستی کی اور اس دور میں بھی کئی بلند پایہ شاعر پیدا ہوئے جس میں ملا نصرتی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جو سلطان علی عادل شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔ اس کی تین مثنویاں اُردو شاعری میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلی "گلشن عشق" جس میں آٹھ ہزار ابیات ہیں۔ اس کی دوسری مثنوی "علی نامہ" ہے جس میں علی عادل شاہ کی عظیم الشان

مہمات کا ذکر ہے۔اس کی تیسری مثنوی "معراج نامہ" ہے۔اس میں خاص دکنی الفاظ اور ترکیبیں بہت زیادہ ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح قوموں اور حکومتوں کو عروج و زوال ہوتا ہے اسی طرح زبان میں بھی عروج و زوال ہوتا ہے۔اور حکومت کے زوال کے ساتھ اس زبان کو بھی زوال آجاتا ہے جو اس کے سایے میں پروان چڑھتی ہے۔چنانچہ جب عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کا نیّرِ اقبال غروب ہوا تو اُردو زبان اور ادب پر بھی کالی گھٹائیں چھاگئیں۔بیجاپور اور گولکنڈہ جو کسی زمانہ میں اُردو علم و ادب کے مرکز تھے تباہ و برباد ہوگئے۔نہ وہ شاہانہ سرفرازیاں رہیں اور نہ پہلی سی ادب نوازیاں۔بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد اورنگ آباد علم و فضل کا مرکز بنا۔ اور اس شہر کو شہنشاہ اورنگ زیب کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔اس سرزمین میں ولیؔ اور سراجؔ جیسے دو نامی گرامی شاعر پیدا ہوئے۔جنھوں نے اُردو شاعری میں وہ کمال پیدا کیا کہ ان کی شہرت شمالی ہند تک پہنچ گئی۔ولیؔ اپنی تعلیم کی تکمیل کے سلسلہ میں گجرات بھی گئے تھے۔اور ایک عرصے تک وہاں قیام کیا تھا۔ان کے اس طویل قیام سے بعض محققین کو یہ شبہہ ہونے لگا کہ ولیؔ گجرات کے رہنے والے تھے۔ولیؔ کو گجرات سے خاص لگاؤ تھا۔بالخصوص شہر سورت ان کے من کو بہت بھایا اور اپنی ایک مثنوی "در تعریف سورت" میں انھوں نے اس سے اپنی دلبستگی کا اظہار کیا ہے۔غالباً ولیؔ نے ۱۷۰۰ء میں دلی کا سفر کیا۔یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دلی میں فارسی میں شعر کہنے کا رواج تھا۔اور اہل دلی اس بات سے بے خبر تھے کہ تقریباً چار سو برس سے اُردو میں شاعری کی جارہی ہے۔ولیؔ کی اُردو شاعری سے وہ بہت متاثر ہوئے اور یہ محسوس کیا کہ اُردو زبان میں بھی یہ صلاحیت ہے کہ جس کے ذریعہ جذبات اور خیالات کا عمدہ طریقے سے اظہار کیا جاسکتا ہے۔غرض ولیؔ کے اس سفر نے شمالی ہند کی اُردو شاعری میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔دلی میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد ولیؔ اپنے وطن واپس ہوئے۔ولیؔ کی شاعری میں مختلف اصناف سخن موجود ہیں۔لیکن غزل پر انھوں نے زیادہ توجہ کی۔"دیوان ولی" انجمن ترقی اُردو"

کی طرف سے شایع ہوچکا ہے۔ اس کے مطالعہ سے وؔلی کی شاعرانہ عظمت کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اُردو شاعر کی حیثیت سے وؔلی کی جتنی قدر و منزلت ان کی زندگی اور ان کی موت کے بعد ہوئی شاید ہی کسی اُردو شاعر کو نصیب ہوئی ہو ان کے شاعرانہ کمال کے اعتراف میں چند سال قبل حیدرآباد میں یوم ولی بڑے شاندار پیمانے پر منایا گیا۔ وؔلی کے بعد دوسری ہستی جو اس خاک پاک سے اٹھی وہ حضرت شاہ سراج اورنگ آبادی کی تھی۔ سراج ۱۱۲۸ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے شاعرانہ کمال کی وجہ سے وؔلی کے بعد سب سے بڑے استاد مانے گئے۔ شاہ سراج کا ایک ضخیم کلیات منظر عام پر آچکا ہے جس کو پروفیسر سروری صاحب نے اپنے ایک بصیرت افروز مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

اس دور کے ختم ہوجانے کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال تک دکن کی اُردو نوازیوں کے چرچے کم ہوئے۔ اور اب عہد عثمانی کی فیاضانہ سرپرستیوں کی وجہ سے گزشتہ ربع صدی سے حیدرآباد میں اُردو کی گراں بہا خدمات انجام دی جارہی ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ میں دکن نے اپنے لیے ایک نمایاں جگہ حاصل کرلی ہے۔ موجودہ عہد میں تو اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ کی شاہانہ اُردو نوازیوں کے باعث اُردو کی ترقی میں برق رفتاری پیدا ہوگئی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی شکل میں ظل ہمایونی نے وہ احسان فرمایا ہے جو نوجوان پود کے افکار و اعمال کی فطری ترقی کا صحت بخش ذریعہ ثابت ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ بقول پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب پرو وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ "علم نامانوس زبانوں میں مقید تھا اس سرزمین پر آزاد کیا گیا"۔

یوں تو اس دور میں کئی شاعر پیدا ہوئے لیکن کیفی۔ توفیق اور ذہین مقبول خاص و عام ہوئے۔ زندہ شاعروں میں حکیم الشعرا حضرت امجد کا کلام اور خاص کر ان کی رباعیاں سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ ان کی نظم و نثر کے کئی مجموعے اب تک شایع ہوچکے ہیں۔ اور بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امجد کی تصنیفات اُردو ادب میں ہمیشہ نمایاں حیثیت کی حامل رہیں گی۔ اس دور کے ایک اور شاعر حضرت صفی اورنگ آبادی ہیں۔ زیادہ تر غزل کہتے ہیں جس میں ان کی رندمشربی آزادروی اور بے ساختگی کی جھلک

نمایاں رہتی ہے۔ ان کا کلام ابھی تک کتابی صورت میں شایع نہیں ہوا اگر یہ شایع ہو جائے تو اُردو غزل کے سرمایہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔ اُردو کے انشاء پردازوں اور محققین میں مولوی سید خورشید علی صاحب۔ مولوی ظفر یاب خاں صاحب مولوی شمس اللہ صاحب قادری مولوی سرماطل صاحب مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حیدرآباد کی قدیم انجمنوں میں انجمن ترقی اُردو نے جس کا دفتر اب دہلی میں منتقل ہو چکا ہے اُردو زبان کی وہ خدمات انجام دی ہیں جس پر حیدرآباد بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ اس انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو زبان کا وہ کام کیا ہے جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ حکومت حیدرآباد کی طرف اس انجمن کو سالانہ تقریباً ایک لاکھ کی امداد مختلف شکلوں میں دی جاتی ہے۔ یہ انجمن اُردو کی لغت ترتیب دینے کے کام میں مصروف ہے۔ اگر یہ لغت چھپ جائے تو اُردو زبان کا ایک بہت بڑا یادگار کارنامہ ہوگا۔ حیدرآباد کی تعلیمی ترقی میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ اُردو کی ترقی اور وسعت کے لئے اس انجمن کی خدمات کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔

اس دور کا سب سے درخشاں کارنامہ جس نے اُردو کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا جامعۂ عثمانیہ کا قیام ہے۔ اس یونیورسٹی کو قائم کرنے والوں نے اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا ایک عملی تجربہ کیا تھا جو صد فی صد کامیاب ثابت ہوا۔ جامعۂ عثمانیہ کے اساتذہ میں مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب۔ مولوی ہارون خاں صاحب شروانی۔ مولوی الیاس برنی صاحب۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب اور مولوی جمیل الرحمن مرحوم نے اپنے اپنے فن پر اُردو زبان میں قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ اس جامعہ کے تعلیم یافتہ اصحاب میں جو اب اس جامعہ میں بحیثیت پروفیسر کام کر رہے ہیں قابل ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری (جو حال ہی میں جامعۂ میسور میں منتقل ہو گئے ہیں)۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب۔ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی۔ اور ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی

ہیں۔ ان اصحاب نے اپنے اپنے موضوعوں سے متعلق اُردو میں کئی کتابیں لکھی ہیں جو تمام ہندستان میں قدر کی نظروں سے دیکھی گئیں۔ ان میں سے بعض پروفیسروں مثلاً ڈاکٹر زور صاحب اور پروفیسر سروری صاحب کی ایک سے زیادہ کتابیں ہندستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ اول الذکر بحیثیت محقق زبان و تنقید نگار سارے ہندستان میں مشہور ہیں اور موخر الذکر نے جدید اُردو شاعری اور فن افسانہ نگاری پر قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے تحت ایک دار الترجمہ بھی ہے جس نے اب تک غیر زبانوں کے مختلف علوم و فنون کی بیسیوں کتابوں کو اُردو زبان میں منتقل کیا ہے۔

آج سے تقریباً بارہ سال قبل حیدرآباد کے چند بہی خواہان اُردو کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان و ادب کی خدمت ایک اجتماعیت کے ذریعہ عمل میں لائی جائے اور وقت کی اس اہم ضرورت کے پیش نظر ادارۂ ادبیات اُردو کا قیام عمل میں آیا۔ اس قلیل عرصہ میں ادارے نے اُردو زبان کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اس سے اہل اُردو نا واقف نہیں ہیں۔ ادارے کا کام مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور اب تک ایک سو کے قریب کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ ادارے نے گزشتہ تین سال سے اُردو امتحانات کی مہم کا آغاز کیا ہے جس میں اسے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ پہلے سال دو سو پچھتر دوسرے سال چھے سو اور تیسرے سال تقریباً چودہ سو امیدوار ان امتحانوں میں شریک تھے۔ امتحانات کے سنٹر مختلف مقامات پر قائم کیے جاتے ہیں اور کامیاب ہونے والوں کو سندیں اور انعامات عطا کیے جاتے ہیں۔ دوسرا اہم کام جو ادارے کے پیش نظر ہے وہ اُردو انسائکلوپیڈیا کی ترتیب ہے۔ اس کام میں ادارے نے تمام ہندستان کے علماء و فضلاء کا تعاون حاصل کر لیا ہے اور اس کام کے ابتدائی مراحل طے کر لئے گئے ہیں۔ اُردو انسائکلوپیڈیا کی پہلی جلد کا مسودہ مرتب ہو چکا ہے۔ جنگ کی وجہ سے کاغذ نہ ملنے اور طباعت کی دشواریوں کے باعث یہ جلد طبع نہ ہو سکی۔ لیکن اب کاغذ اور طباعت کا انتظام کر لیا گیا ہے اور توقع ہے کہ ۱۹۴۳ء میں پہلی جلد طبع ہو کر منظر عام پر

آجائے گی۔ صوبۂ مدراس میں اُردو زبان عرصۂ دراز سے بولی جاتی ہے اور خاک مدراس نے ایسے نامور شاعر و انشا پرداز پیدا کئے جن کے کارنامے آج بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ مدراس کی اُردو خدمات کا اندازہ موجودہ حالات سے نہیں بلکہ ایک صدی قبل کے حالات سے لگایا جاسکتا ہے۔

مدراس میں اُردو کی ابتدا سنہ ۱۱ ؁ھ سے قبل ہوچکی تھی۔ اس کے کچھ زمانہ کے بعد کے شاعروں میں سب سے پہلے لالہ جسونت رائے کا پتہ چلتا ہے۔ جن کا تخلص منشی تھا۔ وہ اُردو کے ایک اچھے شاعر تھے اور ایک مثنوی "گلدستۂ عشق" کے نام سے تصنیف کی تھی۔ ارکاٹ کے اُردو شاعروں میں واؔلہ اور باقر آگاہ کے نام بطور خاص لئے جاسکتے ہیں۔ واؔلہ کا مسلک صلح کل تھا۔ وہ نہ صرف ایک بڑے شاعر تھے بلکہ اپنے زمانے کے بلند پایۂ نقاد بھی تھے۔ ان کی ایک مشہور عشقیہ مثنوی "طالب و موہنی" ہے جو ایک ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ باقر آگاہ ۱۱۵۸ ؁ھ میں ویلور میں پیدا ہوئے ان کا شمار اپنے زمانے کے علماء میں ہوتا تھا۔ ان کا دیوان کافی ضخیم ہے اور اس کے کئی نسخے مختلف اصحاب کے پاس موجود ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف اور معرفت کی جھلک نظر آتی ہے ؎

بتوں کے عشق میں رکھیو مجھے معذور اے زاہد کہ میں آئینۂ دیدار میں ان کے خدا پایا

باقر آگاہ کی سب سے زیادہ مشہور کتاب ہشت بہشت ہے جس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم اور ایک نسخہ پیرس کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ کتاب مدراس اور بمبئی میں کئی بار چھپ کر بہت مقبول ہوئی۔ سنہ ۱۲۰۰ ؁ھ سے لیکر سنہ ۱۳۰۰ ؁ھ تک اُردو کو صوبۂ مدراس میں بڑا عروج رہا۔ اس دور کے بعض مشہور شاعروں میں غلام اعزالدین خاں بہادر مستقیم جنگ نامی اور غلام محی الدین معجز کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ آخری دور سنہ ۱۳۰۰ ؁ھ سے موجودہ زمانے تک کا قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس دور کے شاعروں میں شمس العلماء نواب عبدالرحمٰن خاں شاؔطر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جو اپنے کلام کی وجہ سے سارے ہندستان میں مشہور ہیں۔ رؤف احمد صاحب پرتو بڑے پرگو شاعر ہیں۔ اور اب تک ان کے تین دیوان شائع ہوچکے ہیں۔

ڈاکٹر عبداللہ ذوقی ۔ کمالی اور فانی کا کلام رسالہ صحف ۔ اور نظمی کا کلام جلوہ سخن میں شایع ہوا کرتا تھا۔ اس دور کے نثر نگاروں میں یعقوب حسن صاحب ۔ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق صاحب ۔ ڈاکٹر قطب الدین صاحب، عبدالجبار صاحب ۔ سید صبغۃ اللہ حسینی صاحب بطور خاص قابل ذکر ہیں مولانا محمد حسین صاحب محوی کا ذکر بھی بہت ضروری ہے ۔ اگرچہ کہ پیدائش کے لحاظ سے مولانا کا تعلق لکھنو سے ہے لیکن آپ گزشتہ کئی سال سے مدراس میں مقیم ہیں ۔ اور مدراس میں اُردو کی ترقی کے لیے بہت کچھ کام کیا ہے ۔ مدراس کے موجودہ شعراء میں زیادہ تعداد مولانا کے شاگردوں کی ہے اور شاعری میں آپ کی نمایاں حیثیت ہے۔ ہندستان کے بلند پایہ اُردو رسالوں میں آپ کا کلام اور مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں ۔ علاقہ مدراس صحافتی میدان میں بھی پیچھے نہیں رہا ۔ چنانچہ سب سے پہلا اخبار عمدۃ الاخبار کے نام سے شایع ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب پرنسپل محمڈن کالج مدراس نے اپنے ایک مضمون میں جو رسالہ اُردو بابتہ اپریل ۱۹۴۱ء میں شایع ہوا ہے اعظم الاخبار کو جنوبی ہند کا پہلا اخبار بتلایا ہے جو ۱۸۴۸ء میں مدراس سے جاری ہوا تھا ۔ مولوی محمد سعید عبدالخالق صاحب جنھوں نے "میسور میں اُردو" کے نام سے ایک کتاب مرتب کرکے شایع کی ہے اپنا ایک مضمون "جنوبی ہند کا پہلا اخبار" رسالہ سب رس میں اشاعت کے لیے روانہ کیا ہے۔ اس مضمون میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ میں نے مسلم لائبریری (معسکر بنگلور) میں جامع الاخبار کی قدیم جلد دیکھی۔ یہ مولوی عبدالرحمن صاحب فیضی مالک فیض عام الکٹرک پریس نے لائبریری کو تحفہ دیا ہے ۔ اس اخبار کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی اجرائی ۱۸۴۲ء میں عمل میں آئی ۔ اس طرح یہ جنوبی ہند کا پہلا اور دنیائے اُردو کا تیسرا اخبار ہے ۔ حسن اتفاق سے اس اخبار کی ایک جلد ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جس میں اکتوبر ۱۸۵۳ء سے لیکر ستمبر ۱۸۵۴ء تک کے اخبار موجود ہیں ۔ یہ اخبار بڑی تختی کے آٹھ صفحات پر دو کالم میں ہفتے میں ایک بار پیر کے روز مدراس کی مونٹ روڈ پر بہرام جنگ بہادر مرحوم کے باغ کی پہلی گلی کے چھاپے خانہ میں طبع ہوتا تھا ۔ اخبار کے آخری صفحہ پر المشتہر سید رحمت اللہ لکھا ہوا ہے ۔ غرض

مدراس سے تقریباً پندرہ ہفتہ وار۔ پانچ روزنامے۔ چار ماہوار۔ اور ایک سہ ماہی رسالہ شایع ہوتا تھا۔ ان میں سے سہیل مصحف۔ اور جلوۂ سخن۔ آخری دور کے ہیں۔

مدراس میں مختلف انجمنیں بھی اُردو کے کام میں لگی ہوئی ہیں لیکن اب تک ان کا کوئی عملی کام منظر عام پر نہ آیا۔ توقع ہے کہ یہ انجمنیں اجتماعی طور پر اُردو ادب کی ٹھوس خدمات انجام دیں گی۔ میسور میں اُردو کی ابتداء غالباً ۱۴۰۰ء سے شروع ہوئی۔ اور ۱۴۶۵ء میں یہاں اُردو بولنے والوں کی کافی تعداد تھی۔ ۹۹۷ء کی اُردو نثر کی ایک کتاب مولوی شاہ ابوالحسن صاحب ادیب کے یہاں محفوظ ہے۔ جو فارسی کتاب تنبیہ الغافلین کا اُردو ترجمہ ہے۔ صاحب موصوف کے پاس ۱۱۰۰ء کی ایک منظوم کتاب "ہزار مسائل" بھی ہے۔ جس کی زبان قدیم دکھنی ہے۔ ۱۷۶۱ء سے ۱۷۹۹ء تک اُردو کے کئی شاعر میسور میں پیدا ہوئے ٹیپو سلطان کے عہد میں اُردو کو خوب ترقی ہوئی۔ اور ان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اس زبان کو فروغ حاصل ہوا ٹیپو سلطان کی اُردو سرپرستی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے زین العابدین خاں سے ایسے اُردو گیت لکھوائے جو فوجی باجے کے ساتھ گائے جا سکیں۔ اور یہ اختراع ٹیپو سلطان کی بیدار مغزی کا بین ثبوت ہے۔

۱۷۹۹ء سے میسور میں عہد راجگان کا آغاز ہوتا ہے۔ ہز ہائنس مہاراجہ آنجہانی کو اُردو و فارسی سے خاص شغف تھا۔ اور ان دونوں زبانوں میں نوشت و خواند کی کافی قابلیت رکھتے تھے۔ موجودہ حکمران ہز ہائنس مہاراجہ میسور کو بھی اُردو زبان سے گہری دلچسپی ہے۔ بچپن میں آپ نے اُردو کی تعلیم پائی۔ اور اس پر کافی عبور حاصل کیا۔ حکومت میسور کی جانب سے تقریباً ایک ہزار تحتانوی اور وسطانوی مدارس قائم ہیں۔ جامعۂ میسور میں اُردو کا شعبہ قائم ہے۔ چند ماہ قبل حکومت نے اُردو و فارسی اور عربی کی صدارت کے لئے ایک اُردو پروفیسر کے تقرر کا فیصلہ کیا۔ اور اس پر جامعۂ عثمانیہ کے ایک لائق فرزند پروفیسر مولوی عبدالقادر صاحب سروری کا تقرر عمل میں آیا۔ اس واقعہ سے اس بات کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے کہ ریاست میسور کو اس مشترکہ زبان کی ترقی کا جو ہندو مسلم اتحاد کی واحد یادگار ہے کتنا بڑا خیال ہے۔

اس دور میں میسور میں کئی نامی گرامی شاعر اور ادیب پیدا ہوئے جنھوں نے خاموش طریقے پر اپنی زبان کی خدمات انجام دیں۔ ایک عرصہ تک اُردو دنیا ان کے کارناموں سے ناواقف رہی لیکن چند روز قبل "میسور میں اُردو" کے نام سے ایک کتاب میری نظر سے گزری جس میں لائق مرتب نے میسور کے تمام شاعروں کے حالات اور نمونۂ کلام یکجا کر دیا ہے! اس کتاب کے مطالعہ سے میسور میں اُردو کے نشو و نما کا نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے! اس تذکرہ میں بیسیوں شعرا اور ادبا کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں کے نمونے درج ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں ان کی تفصیل کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ میسور اور بنگلور اُردو کی خدمت گزاری سے غافل نہیں۔ بلکہ آئے دن نئے نئے رسالے یہاں سے جاری ہوتے رہتے ہیں۔ اور علم و ادب کی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔ رسالوں میں فانوس اور آزاد اُردو و ادب کی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ انجمنوں میں شاخ نسواں ادارۂ ادبیات اُردو بنگلور بطور خاص قابل ذکر ہے۔ جو محترمہ عقیلہ کلی بیگم صاحبہ کی صدارت اور محترمہ حبیب النسا بیگم صاحبہ ایم۔ اے کی معتمدی میں اُردو ادب کی ترقی کے لئے کوشاں ہے! ور بنگلور کی خواتین میں اُردو ادب کا ذوق عام کرنے کی ان تھک کوشش کر رہی ہے! اس کے علاوہ اس انجمن نے ان پڑھ خواتین کو اُردو لکھنا پڑھنا سکھانے کے کام کو بھی اپنے ذمے لے لیا ہے۔

آخر میں اس تمنا کے ساتھ میں آپ حضرات سے رخصت ہوتا ہوں کہ آپ کی یہ کانفرنس اُردو کی ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی! اور اہل میسور کے دلوں میں اُردو کی خدمت گزاری کے جذبات کو موجزن کر دے گی۔

خواجہ حمید الدین شاہد
متعلم ایم۔ اے (آخری)

عُرفی پر ایک اجمالی نظر

عرفی کا اصلی نام محمد اور اس کا لقب جمال الدین تھا۔ اس کے والد کا نام زین العابدین تھا۔ عرفی فطرتاً مغرور اور خود ستا واقع ہوا تھا۔ اپنے حسب و نسب پر اکثر فخر کیا کرتا تھا۔ عرفی کی تعلیم و تربیت شیراز میں ہوئی۔ شاہ نواز خاں (مصنف مآثر الامراء) نے تذکرہ بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ عرفی نے علاوہ معمولی علوم کے مصوری و نقاشی کی بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ فنون لطیفہ سے اس کو فطری لگاؤ تھا۔ سلطنت صفویہ میں شعر و شاعری کو خاص طور پر عروج حاصل ہوا۔ تمام ملک شعر و سخن کی زمزمہ سنجیوں کا مرکز تھا۔ اس زمانے میں محتشم کاشی، وحشی یزدی، غیرتی وغیرہ جیسے شعراء تھے جو فغانی کی طرز پر شعر کہتے تھے۔ ان تمام حالات اور ایسے ماحول سے کسی شاعر کا متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ عرفی نے بھی جس کو فطرت نے ذوق سخن عطا کیا تھا، فغانی کی طرحوں پر شعر کہنا شروع کیا جس کی وجہ سے اس کے شعری ذوق کو تقویت حاصل ہوئی۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ شاعر کی اگر حقیقی معنیٰ میں قدر کی جائے تو وہ خوش ہوتا ہے اور جہاں اس کی حوصلہ افزائی یا قدر دانی نہ ہوتو وہ احساس کمتری سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی فطری صلاحیتوں کا خون ہوتا ہے۔ خطۂ ایران میں عرفی کی قدر دانی جیسی کہ ہونی چاہئے تھی نہیں ہوئی اسی لئے وہ اپنے ہم عصر لوگوں سے شاکی تھا۔ جب وہاں قدر دانی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو اس نے ہندوستان آنے کا ارادہ کیا! اس زمانے میں ہندوستان میں شاعروں کی قدر دانی خاص طور پر کی جاتی تھی! اس سے بڑھ کر قدر دانی کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ شاعروں کو زر و جواہر میں تول دیا جاتا تھا۔ عرفی اس قدر دانی کا شہرہ سُن کر ہندوستان آیا لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے آنے کا اصل سبب شہزادہ سلیم

کے ساتھ اس کا غائبانہ عشق تھا۔

بہرکیف وہ ہندستان آیا، راستہ میں ڈاکہ پڑا اور اس کا سارا اثاثہ جاتا رہا اس پر اس نے ایک رباعی لکھی۔

دوشینہ کہ بردبرد و شم بود — زانو چو عروس نو در آغوشم بود
پوشیدنی نہ داشتم غیر از چشم — چیزے کہ بر سر ہم گوشم بود

ہندوستان آکر اپنے مذاق کے مطابق فیضی کو رفاقت کے لئے منتخب کیا۔ عرفی فتح پور سیکری میں فیضی سے ملا اور فیضی نے اس کی پوری قدر دانی کی۔ لیکن عرفی کی نخوت پرستی کی وجہ سے محبت نبھ نہ سکی جس کی وجہ سے دربار سے قطع تعلق کرنا پڑا۔

اس زمانے میں دربار اکبری کے نو رتن مشہور تھے جن میں حکیم ابو الفتح گیلانی بھی تھا۔ حکیم اگرچہ منصب و اقتدار کے باعث سب سے کم درجہ رکھتا تھا لیکن علم و فضل کے باعث اس کو سب پر ترجیح حاصل تھی۔ اس کے علاوہ حکیم بڑا نکتہ شناس اور نقاد فن تھا اسی سبب سے عرفی نے اس کے فیض صحبت سے بہت ترقی کی۔ عرفی نے حکیم کی مدح میں بہت سے بلند پایہ قصیدے لکھے ہیں جن میں اس کے علم و تبحر کا اعتراف کیا ہے۔ حکیم کی فرمایش پر عرفی نے خان خاناں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے۔

اے داشتہ در سایۂ ہم تیغ و قلم را — وی ساختہ آرایش ہم فضل و کرم را

وہ خانخاناں کے درباریوں میں داخل ہوگیا اور پھر کبھی کسی شاہی خاندان کے آستانہ پر سر نہیں جھکایا۔ خانخاناں نے عرفی کے ساتھ وقتاً فوقتاً جو فیاضیاں کی ہیں اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک قصیدہ پر ستر ہزار روپیے انعام دلوائے۔

وفات تذکرۂ داغستانی میں لکھا ہے کہ حاسدوں نے اس کو زہر دے کر مارا اور اس کی وجہ

یہ بیان کی گئی ہے کہ شہزادہ سلیم کے ساتھ عشق کا اظہار کرنا تھا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر چھتیس سال کی تھی۔ اس کی تاریخ وفات "عرفی بجواں مرگ شدی" سے نکلتی ہے۔ اسی تذکرہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ عرفی کو لاہور میں دفن کیا گیا اور چند دن کے بعد کوئی فقیر اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف لے گیا۔ لیکن یہ غلط ہے کیونکہ ملا عبدالباقی جو عرفی کا ہم عصر تھا، مآثر رحیمی میں لکھتا ہے کہ میر صابر اصفہانی نے جو اعتمادالدولہ غیاث بیگ کا درباری تھا اس نے ایک قلندر کو کثیر رقم دی کہ عرفی کی ہڈیاں لاہور سے نجف لے جائے۔ غرضکہ عرفی کی یہ پیشینگوئی صحیح نکلی کہ

اگر بہ ہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم

اخلاق وعادات

عرفی کے اخلاق وعادات میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ فخر، غرور اور خودستائی ہے۔ اس کی نخوت پرستی کی وجہ سے اس کے تمام ہم عصر اس سے نالاں رہتے تھے۔ یہاں تک کہ نظیری جیسے بلند پایہ شاعر سے بھی رہا نہ گیا چنانچہ وہ عرفی کے انتقال کے بعد ایک قصیدہ میں لکھتا ہے کہ

دریں قصیدہ بہ گستاخی ارچہ عرفی گفت بداغ اشک پس از مرگ سوخت خاقانی

کنوں بہ گور چناں او بہ رشک می سوزد کہ در تنور تواں گو سفند بریانی

عرفی نہایت حاضر جواب اور ظریف واقع ہوا تھا۔ ایک دفعہ ابوالفضل کے گھر پر ملنے گیا تو ابوالفضل کو قلم دانتوں میں پکڑے ہوئے پایا۔ اس وقت ابوالفضل کسی سوچ میں منہمک تھا۔ عرفی نے غور وفکر کا سبب پوچھا۔ ابوالفضل نے کہا "بھائی صاحب کی بے نقط تفسیر کا دیباچہ لکھ رہا ہوں۔ ایک موقع پر والد کا نام "مبارک" آگیا ہے چاہتا ہوں کہ نام ایسا آئے کہ وہ بھی بے نقط ہو"۔ عرفی نے فوراً کہا کہ کونسی بڑی بات ہے اپنے لہجہ میں "مارک" لکھ دیجئے (ابوالفضل کی زبان میں لکنت تھی اور وہ صاف طور پر گفتگو نہیں کرسکتا تھا)۔

ایک دفعہ فیضی بیمار تھا، عرفی اس کی عیادت کو گیا، فیضی کو کتوں کے پرورش کرنے کا بہت شوق تھا اس موقع پر کتے کا ایک بچہ گلے میں سونے کا پٹہ ڈالے پھر رہا تھا عرفی نے کہا "مخدوم زادہا چہ نام دارد" فیضی نے کہا "عرفی" اس کے جواب میں عرفی نے کہا "مبارک باشد"

تصانیف

عرفی نے حسب ذیل تصانیف لکھی ہیں :-

(۱) نفسیہ - اس میں تصوف کے مسائل بیان کئے گئے ہیں اور نفس کے متعلق اہم امور کی تفصیل پر توجہ کی گئی ہے - (۲) کلیات قصاید و غزلیات - جس کو محمد قاسم نے مرتب کیا تھا لیکن یہ نسخہ اب نایاب ہے - عبدالرحیم خانخاناں نے محمد قاسم کو دیوان کی ترتیب پر مامور کیا تھا اس کے علاوہ دو مثنویاں ہیں جو علی الترتیب مخزن اسرار اور شیریں خسرو کے جواب میں لکھی گئی ہیں -

خصوصیات کلام

اس بات پر سب متفق ہیں کہ اصناف سخن میں سے عرفی مثنویوں پر زیادہ قادر نہیں تھا جیسا کہ اس کے ایک خاص معتقد نے بھی تسلیم کیا ہے

مثنویش رنگ فصاحت نداشت کان نمک بود ملاحت نداشت

عرفی کی شاعری کی شہرت اس کے بلند پایہ قصیدوں کی وجہ سے ہے - عرفی کو اپنے قصیدوں پر بہت ناز تھا اس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "میرا قصیدہ کسی غلط خواں سے نہ پڑھوا جائے ورنہ میرا بھی وہی حال ہوگا جو کمال اسماعیل کا ہوا تھا" عرفی کا شہرہ سن کر جہانگیر نے اس کو دربار میں بلایا اور اس سے قصیدہ کی خواہش کی - عرفی نے ہمہ تن شوق و بیتابی کے عالم میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے - صباح عید کہ در تکیہ گاہِ نازو نعیم گدا کلاہِ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

اس کے کلام کی شہرت کو بیان کرتے ہوئے ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ عرفی کا کلام گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں کتب فروش بیچتے پھرتے تھے اور اہل عراق تبرکاً خریدتے تھے - عرفی کے کلام میں

زور بیان بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ کلام میں الفاظ کی شان و شوکت بندش کی چستی، فقروں کا دروبست، خیالات کی رفعت، اور مضامین کا زور اور تسلسل موجود ہے

اس نے متعدد جگہ نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے استعارے پیدا کئے ہیں جن سے جدت اور طرفگی کے علاوہ نفس مضمون پر خاصہ اثر پڑتا ہے مثلاً

خیز و شراب حیرتم زاں قدِ جلوہ ساز دہ　　روی بروی حسن کن دست بدست ناز دہ

مرحبا اے زعنایات ازل رمز فروش　　مرحبا اے بہ علامات ہنر خویش ستائے

بہ برقعہ مہ کنعاں کہ بود حسن آباد　　بہ حجلہ گاہ زلیخا کہ بود یوسف زار

اس کے استعارات کی جدت اور تنوع نے ایوان شاعری میں گوناگوں نقش و نگار کا کام کیا ہے۔ عرفیؔ کے تخیل کی بلندی اور فصاحت و بلاغت کا زور وہاں نظر آتا ہے جہاں وہ قصیدوں میں کوئی مسلسل مضمون ادا کرتا ہے اور یہ اس کا خاص انداز ہے۔ کلام میں تخیل کے ساتھ ساتھ ربط اور ترتیب کا خاص طور پر لحاظ رکھتا ہے۔ اس میں مطلق شبہہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی قوت تخیل حد درجہ بلند تھی۔ جہاں لوگوں نے عرفیؔ کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کی ستایش کی ہے وہاں اس کی قوت تخیل کا حقیقی معنیٰ میں اعتراف کیا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے اس کی قوت تخیل کو دیکھ کر کیا خوب کہا ہے کہ

محل ایسا کیا تعمیر عرفیؔ کے تخیل نے　　تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی

ذیل کے اشعار اس کی قوت تخیل اور جدت ادا کے شاہد ہیں

زہرۂ گیسو بکشاید و شود گرد فشاں　　از رکابش کہ پذیرفتہ از تنگ و تاز

ہر حدیثے کہ رضا بت بسماعش نبود　　از در گوش سراسیمہ بلب گرد د باز

مہتاب گل از ہم بشگافد قصب شاخ　　وز لمعۂ او سیب قمر لعل تر آید

عرفیؔ ایک طرف اگر نکتہ سنج، نکتہ شناس اور ذوق عرفان سے آشنا تھا تو دوسری طرف

شباب میں نہایت خوش اور حسین لوگوں کا منظور نظر تھا۔ وہ کہیں عشق حقیقی کے اسرار اور دقایق بیان کرتا ہے اور کہیں عشق مجازی میں جو واردات اور معاملات پیش آتے ہیں ان کو پیش کرتا ہے۔ دیدار میں عاشق ہر وقت نظارہ میں محو ہوتا ہے اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے

چگونہ مانع نظارہ ام شوی کہ مرا زشوق روی تو سرتا قدم نگہ خیزاست

جوش حسن میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معشوق آئینہ دیکھ کر خود اپنے آپ کو چاہنے لگتا ہے اس حالت کو اس شعر میں کتنے لطیف انداز میں بیان کرتا ہے کہ داد دئے بغیر رہا نہیں جاتا

دہن خویش ببوسند ولب خویش گزند چو در آئینہ ببینند بتاں صورت خویش

ابتدائے عشق میں عاشق کو بہت سی مصیبتوں، تکلیفوں اور درد و سوز میں مبتلا ہونا پڑتا ہے کہتا ہے

عشق می گویم و می گریم زار طفل نادانم و اول سبق است

عشق میں عقل و ہوش گم ہو جاتے ہیں۔ عاشق پر دیوانگی کی حالت طاری ہوئی ہے اس وقت واعظ کی نصیحتیں اور اس کی عالمانہ گفتگو اس پر کچھ اثر نہیں کرتی۔

گفتگو ہائے حکیمانہ نیالاید عشق بگذارید کہ این نکتہ مسلم باشد

حسن کی رونق عشق سے اور عشق کی حسن سے ہے۔

ایں صفا حسن و محبت بہم اندوختہ اند ایں دو شمع است کہ از یکدیگر افروختہ اند

بہر کیف اس نے عشق کے متعلق مختلف گہرے خیالات اور حقایق بیان کئے ہیں اور عشق کے رموز و نکات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے اپنے کلام میں اکثر جگہ اخلاقی اور نفسیاتی مسائل بھی بیان کئے ہیں جن کا یہاں پر ذکر کرنا باعث طوالت ہے۔

محمد مصلح الدین صدیقی متعلم بی۔ اے (ابتدائی)

سوویٹ جمہوریت میں انسانی حقوق

۱۹۳۶ء کا دستور سوویٹ روس کے سیاسی و معاشی ارتقاء میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس کی رو سے انسانی حقوق کی نئی تشریح اور نئی تعبیر کی گئی ہے۔ انسان کا حق حیات، حق آزادی، حق اجتماع، حق تقریر و تحریر ان تمام حقوق کو نئے رنگ اور نئے طریقہ سے پیش کیا گیا ہے Beatruce webb Sidney and نے انہیں "انسانی حقوق کی نئی ساخت" کہا ہے۔ قدیم جاگیرداری نظام میں انسانی حقوق کا کوئی خاص تخیل موجود نہ تھا مختلف معاشری طبقات کے مختلف حقوق تھے امراء اور مذہبی پیشواؤں کو سب سے زیادہ حقوق حاصل تھے اور عام شہریوں کو بہت ہی کم حقوق حاصل تھے عام شہریوں میں بھی حقوق کا کوئی ایک مقررہ معیار نہیں تھا۔ کاشتکاروں کو جو تیسری صف میں شمار کئے جاتے تھے صحیح معنی میں حقوق حاصل تھے ہی نہیں کیونکہ زمینداروں کو ان پر پورے اختیارات حاصل تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں پہلی بار حقوق کا تخیل پیدا ہوا امریکہ کے اعلان آزادی اور انقلاب فرانس کے "شہریوں اور انسانوں کے حقوق کے اعلان" میں افراد کے ناقابل انتقال حقوق حیات اور آزادی کا اعلان کیا گیا۔ مساوات کے معنی اس نظام میں "قانون کے آگے مساوات" کے تھے لیکن لاسکی کے الفاظ میں "قانون معاشرہ کے طبقاتی رشتوں سے غیر جانبدار نہیں ہوسکتا اور سرمایہ دارانہ نظام میں قانون کی افادیت یہی ہے کہ وہ معاشرہ کے طبقاتی رشتوں کے استحکام و تعامل کی ضمانت ہے۔ اس لحاظ سے سرمایہ دارانہ معاشرہ میں "مساوات" کوئی اصلی اور حقیقی مفہوم پیدا نہیں کرسکتی۔ قانون کے آگے مساوات "مساوی مواقع" موجودگی میں حقیقی معنی نہیں رکھتی۔"

سرمایہ دارانہ جمہوریت میں مساوی حقوق حقیقی مفہوم کے حامل نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ لاسکی کے الفاظ میں "وہ جبر جو افلاس اور بے روزگاری میں پوشیدہ ہے۔ وہ مساوی حقوق کی اصطلاح کو مضحکہ خیز بنا دیتا ہے"

بے روزگاری، افلاس اور جہالت کی موجودگی میں حقوق اصلی معنی نہیں حاصل کر سکتے " اخلاقی ترقی" جو ارسطو کے خیال میں انسان کے لئے "خیر برتر" ہے اور جس کا حصول گرین کے نقطۂ نظر سے لغیر "حقوق" کے نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی معنی نہیں رکھتی نہ صرف مادی ترقی بلکہ اخلاقی اور روحانی ترقی کے دروازے بھی پست طبقات کے لئے بند ہیں اور جمہوریت بھی جو مساوات آزادی کا دوسرا نام ہے اس نظام میں حقیقی معنی حاصل نہیں کر سکتی۔

سرمایہ دارانہ نظام میں ایک ایسا دور آتا ہے جب وہ اور انسانی آزادی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اس وقت یا تو انسانی آزادی کا انتخاب کرنا ہوتا ہے یا سرمایہ داری کا سوویٹ روس نے پہلا راستہ اختیار کیا۔ بجائے انسانی آزادی اور مساوات کے ختم کرنے کے اس نے سرمایہ داری اور عدم مساوات کے سارے ذرایع کو ختم کیا اس طرح جمہوریت کے لئے راستہ پیدا کیا کیونکہ جمہوریت کے لئے جیسا کہ لاسکی کا خیال ہے" نہ صرف سیاسی مساوات بلکہ معاشری مساوات بھی ضروری ہے۔ اسٹالن نے رائے ہوورڈ (امریکی جرنلسٹ) سے ملاقات کے دوران میں کہا تھا کہ "صرف اشتراکی معاشرہ میں ہی حقیقی آزادی پائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ آزادی کے لئے استحصال کا خاتمہ ضروری ہے۔ ہم اس معاشرہ کی تعمیر شخصی آزادی کی تحدید کے لئے نہیں بلکہ فرد کو صحیح معنی میں آزاد بنانے کے لئے کرتے ہیں"

اخلاقی زندگی اور اخلاقی ترقی کے لئے معاشرہ کا وجود ضروری ہے۔ معاشرہ ہی میں انسانی اخلاق ترقی کر سکتا ہے۔ اخلاقی ترقی صرف اندرونی یا باطنی شئے نہیں بلکہ خارجی حالات کا بھی اس پر اثر پڑتا ہے اس لئے گرین نے کہا تھا کہ " مملکت کا فرض ہے کہ وہ اخلاقی ترقی کے موانعات کو دور کرے" سوال یہ ہے کہ اخلاقی اور روحانی ترقی میں موانعات کیا ہو سکتے ہیں اور کن انسانی ضروریات کی فراہمی کے بعد ہی یہ ترقی ممکن ہے۔ انگلز نے کہا تھا کہ " اس سے پہلے کہ انسان اپنی توجہ سیاسیات۔ سائنس۔ آرٹ اور مذہب کی طرف منعطف کرے۔ یہ ضروری ہے کہ ان کی مادی ضروریات جیسے غذا، لباس اور مکان وغیرہ کی تکمیل ہو" انگلز کا یہ خیال غیر حقیقی نظر نہیں آتا کیونکہ افلاس غربت اور مادی پریشانیوں میں گھرا ہوا کوئی فرد بھی اخلاقی ترقی نہیں کر سکتا۔ اس لئے سب سے پہلا اور ضروری حق انسان کے لئے "کام کرنے کا ہے" Right to work جو سوویٹ روس کے مشہور راہبر

قانون "کرا ے لن کو" Krylenko کے الفاظ میں ایسا بنیادی حق ہے جو تمام دوسرے حقوق کی ضمانت کرتا ہے" سرمایہ دارانہ نظام اس حق کی کوئی ضمانت نہیں دیتا۔ بے روزگاری اس نظام کی بنیادی خصوصیت ہے۔ سوویٹ روس نے ۱۹۳۶ء کے دستور سے افراد کے اس حق کی ضمانت دی ہے کہ "سوویٹ روس کے شہری کام کرنے اور کام کی کمیت وکیفیت کی مناسبت سے معاوضہ پانے کا حق رکھتے ہیں ان کا یہ حق وسایل دولت کی قومی تنظیم اور سوویٹ معاشرہ کی دولت آفرینی کی قوتوں میں مسلسل ترقی اور معاشی بحران کے امکانات کے ختم کر دئے جانے اور بے روزگاری کے انسداد کی وجہ سے محفوظ کیا گیا ہے" بے روزگاری کا مسئلہ عرصہ ہوا روس میں خارج از بحث ہو گیا ہے۔ ۱۹۳۱ء ہی میں روس میں بے روزگاری کا کامل خاتمہ ہو چکا تھا - اس طرح روس میں ایک ضروری اور بنیادی حق کی ضمانت دی گئی ہے۔ جس کے بغیر افراد کی روحانی معاشری اور اخلاقی ترقی تقریباً ناممکن ہے۔

معاشری اخلاقی ترقی کے لئے افراد کے لئے فرصت اور آرام کی بھی ضرورت ہے ایسا آرام نہیں جو بے روزگاری کی وجہ سے حاصل ہوتا ہو اور نہ ایسا آرام اور ایسی فرصت جو صرف استحصال سے حاصل ہوتی ہے بلکہ کام کرنے کے بعد آرام کیونکہ بے روزگاری میں اخلاقی و روحانی ترقی ناممکن ہے اور دوسری صورت میں استحصال خود ایک غیر اخلاقی اصول ہے کیونکہ اس میں ایک اخلاقی اصول کہ "ہر شخص بجائے خود مقصد ہے نہ کہ ذریعہ" ختم ہو جاتا ہے۔

روس کے دستور میں اس حق کی بھی ضمانت دی گئی ہے۔ "حق آرام کی، اوقات کار بجائے ۸ گھنٹہ کے ، گھنٹہ مقرر کرتے سے ہر سال اجرت کے ساتھ تعطیلات دارالصحۃ (Sanitoria) آرام گھر اور کلب وغیرہ کے ذریعہ ضمانت کی جاتی ہے"

معاشرہ کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے اچھی صحت ناگزیر ہے۔ روس میں طبی امداد کا بڑے پیمانہ پر نہایت معقول انتظام کیا گیا ہے اور متعدد صحت گھر تعمیر کئے گئے ہیں۔

کبرسنی۔ بیماری یا عدم صلاحیت کی صورت میں مادی اور معاشی صیانت کے حق کو بھی قانوناً تسلیم کیا گیا۔ مزدوروں اور دوسرے ملازمین کے لئے

مفت طبی امداد اور صحت گھروں کے ذریعہ اس حق کو عملی صورت دی گئی۔ ایسے افراد جو قدرتاً کام کرنے اور معاشری ذمہ داریوں کی تکمیل سے قاصر ہوں معاشرہ کی ان پر ذمہ داری ہے سوویٹ روس میں اس ذمہ داری کی تکمیل پوری طرح کی جاتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء تک تقریباً ۱۵۰۰۰ اندھوں اور ۴۰۰۰ گونگوں کو اس قابل بنایا گیا تھا کہ وہ کارخانوں وغیرہ میں مختلف کام کرسکیں۔ حق تعلیم افراد کے اہم ترین حقوق میں سے ایک ہے۔ سوویٹ روس کے دستور اساسی میں ابتدائی تعلیم کو جبری قرار دینے اور جبری واعلیٰ تعلیم کو مفت قرار دینے سے اور وظائف وغیرہ کے طریقہ سے اور زمانہ تعلیم میں ہر قسم کی مادی امداد کے ذریعہ سے اس حق کی بھی ضمانت کی گئی ہے۔ ان تمام حقوق کی جو حق حیات کا لازمی نتیجہ ہیں یعنی کام کرنے کا حق حق آرام عدم صلاحیت اور کبرسنی میں حق امداد و حق تعلیم کی ضمانت صرف ایک ایسے معاشرہ میں ہی ہوسکتی ہے جس میں ذرایع پیدا وار اور معاشی قوتوں کے مالک افراد نہ ہوں اور جہاں استحصال کا خاتمہ کردیا گیا ہو یعنی جہاں "اشتراکی نظام معیشت" ہو اور روس کے تجربہ نے اس کو شک وشبہ کی منزلوں سے بالاتر کرکے ایک حقیقت بنا دیا ہے۔

مساوات ——

مساوات جمہوری اخلاق کا ایک ضروری جز ہے لیکن سرمایہ دارانہ جمہوریت میں یہ اخلاقی اصول صرف رائے دہی کی مساوات اور "قانون" کے آگے مساوات سے زیادہ عملی حقیقت حاصل نہ کرسکا۔ جیسا کہ لاسکی نے بتایا ہے کہ سیاسی مساوات بغیر معاشی اور معاشری مساوات کے پوری طرح حقیقی نہیں کہلائی جاسکتی۔

سوویٹ روس کے دستور میں اس سے کہیں زیادہ حقیقی مساوات کی ضمانت دی گئی ہے۔ دستور کے فقرہ ۱۲۳ میں اس حق کی اس طرح تشریح کی گئی ہے۔ "سوویٹ یونین کے تمام شہریوں کی بلالحاظ اختلاف قومیت اور نسل معاشی ملکی تہذیبی معاشری اور سیاسی زندگی میں مساوات ناقابل تنسیخ قانون ہے۔ ان حقوق کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تحدید یا شہریوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کی نسل یا قومیت کی بنا پر کسی خاص استثنائی حق عطا کرنے اور اس کے ساتھ ساتھ نسلی یا قومی امتیازات کا پرچار۔

(نفرت اور حقارت کی صورت میں) قانون کے ذریعہ سزا دی جائے گی

شہریوں کے مساوات کی اس حد تک تسلیم جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کسی سرمایہ دارانہ جمہوریت میں ممکن نہیں تھی۔ کیونکہ "مساوات" بغیر مواقع کے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اور سوویٹ روس نے تمام ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت قرار دے کر مساوی مواقع پوری طرح فراہم کر دئے ہیں اس فقرہ میں ایک اہم اخلاقی اصول کہ قومیت نسل اور اس قسم کے دیگر اختلافات کی بنا پر تفوق کو ختم کیا جائے پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ ان تحدیدات کی بھی نسل اور قومی امتیازات اور تفوق موجودگی میں "مساوات" کا حق بہت زیادہ حقیقی نہیں بن سکتا۔ سوویٹ روس میں نہ صرف معاشی امتیازات کی بلکہ اس کے ساتھ تہذیبی معاشری اور نسلی امتیازات کی بیخ کنی کر دی گئی ہے۔ کیونکہ بڑی حد تک نسلی تہذیبی اور قومی امتیازات معاشی محکومیت اور استحصال سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً جب ایک انگریز سامراج پرست جنوبی افریقہ کی نوآبادی میں اپنے آپ کو تہذیبی حیثیت سے برتر تصور کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی تہہ میں اس کی سامراج پرستی ہے معاشی محکومیت تہذیبی محکومیت بھی پیدا کرتی ہے لیکن اگر معاشی محکومیت کو ختم کر دیا جائے گا تو تہذیبی محکومیت بھی بڑی حد تک ختم ہو جاتی ہے۔ سوویٹ روس میں نہ صرف افراد کی سیاسی مساوات بلکہ قومیتوں کی بھی سیاسی اور تہذیبی مساوات کو تسلیم کیا گیا ہے اور قومیتوں کا حق خود ارادیت جو بین الاقوامی اخلاق کا ایک ضروری اصول ہے۔ یہاں بڑی حد تک حل کر دیا گیا ہے۔ مختلف قومیتوں کو حق خود ارادیت اور خاص حالات کی مناسبت سے سوویٹ یونین (U. S. S. R.) کے دستور کی مطابقت میں اپنا دستور آپ وضع کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یونین سے علحدگی کی آزادی بھی ہر ریاست کو دی گئی ہے۔ قومیتوں کا حق خود ارادیت اور علحدگی جمہوریت کا لازمی اصول ہونا چاہیئے کیونکہ جمہوریت حقیقی معنی میں اسی حق کا نام ہے صرف معاشی محکومیت اور استحصال کے خاتمہ نے یہ ممکن کیا کہ قومیتوں کے اس حق کو پوری طرح تسلیم کیا جائے کیونکہ اب ان مختلف ریاستوں کے باہم اتحاد کا محرک صرف جذبہ ہمسازی (Co-operaiion) ہے کوئی معاشی محکومیت نہیں۔ لیکن صنعت کی ترقی نے ساری دنیا کی اقوام کو ایک دوسرے سے متحد اور منسلک کر دیا ہے اور اب قوموں کے علحدگی پسند رجحانات زمانہ کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتے اور نہ یہ ممکن ہے۔ اس لئے قوموں کا باہمی

تعاون عمل اب ایک معاشی ضرورت بن گیا ہے لیکن یہ باہمی تعاون عمل آزاد اقوام میں ہی ہو سکتا ہے تعاون عمل کے لئے آزاد ارادہ کی ضرورت ہے اور سوویٹ روس کے دستور میں قومیتوں کے اس حق کی پوری ضمانت دی گئی ہے۔ ہر قوم کی ایک ایک فطری قابلیت (Genius) ہوتی ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ انہیں اپنی وضع پہ آپ ترقی کرنے کا اختیار اور حق حاصل ہو اِن کے کلچر اور تہذیب کی ترقی کے لئے آزادی ہو لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ معاشی اور سیاسی محکومیت کا وجود نہ ہو۔ اور اسی صورت میں اقوام کے درمیان باہمی تعاون عمل پیدا ہو سکتا ہے لینن نے بہت ہی پہلے اس کی اہمیت کو محسوس کیا تھا چنانچہ ۱۹۱۳ء ہی میں روس کی کمیونسٹ پارٹی نے لینن کی رہنمائی میں اقوام کے حق خود ارادیت کی حمایت کی اور اعلان کیا کہ ان کو حق خود ارادیت حاصل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انقلاب کے بعد اس فیصلہ کے مطابق لینن نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک اعلان نامہ شائع کیا جس میں اس نے کہا کہ "جن کی مسجدیں اور عبادت گاہیں زار کے زمانہ میں برباد کی جاتی تھیں جن کے رسم و رواج روس کے ظالم حاکموں کے پیر تلے کچلے جاتے تھے تمہارے عقیدے اور رسم و رواج تمہارے قومی ادارے اور تہذیب اب سے آزاد ہیں اور ان میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہوگی تمھیں انہیں برتنے کا پورا حق حاصل ہے۔ تمھیں معلوم ہو کہ تمہارے حقوق کو اور روس میں رہنے والی تمام قوموں کے حقوق کو انقلاب کی اور مزدوروں، سپاہیوں اور کسانوں کی سوتیوں (Soviets) کی زبردست محافظت حاصل ہے"

۱۹۳۶ء کے دستور میں انہیں اعلانات کی مطابقت اور سوویٹ روس کی قدیم پالیسی کے مطابق اقوام کے اس حق کو تسلیم کیا گیا۔ موجودہ سیاسی پیچیدگیوں کا قومیتوں کا مسئلہ بھی ایک سبب ہے چنانچہ ہندوستان کے سیاسی تعطل اور سیاسی پیچیدگی کا ایک سبب یہی مسئلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بغیر اس حق کو تسلیم کئے اس تعاون عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی جو معاشرہ کی اخلاقی روحانی اور معاشری ترقی کے لئے ضروری ہے۔ روس کی اس پالیسی کا ہی نتیجہ ہے کہ روس اس عظیم جنگ میں اتنی عظیم الشان مزاحمت کر رہا ہے۔ اور تمام قومیتیں کامل اتحاد کے ساتھ برسر جنگ ہیں۔ افراد کی مساوات

اور اقوام کی مساوات کے علاوہ صنفی مساوات بھی جمہوریت کا ایک ضروری اصول ہے۔ چنانچہ ایک عرصہ کی کشمکش کے بعد امریکہ میں عورتوں کو رائے دہی کے مساوی حقوق حاصل ہوئے۔ سوویٹ روس میں دستور کی رو سے "عورتوں کو معاشی ملکی تہذیبی معاشری اور سیاسی معاملات میں مردوں کے ساتھ کامل مساوات حاصل ہے"

عورتوں کے اس حق کو زیادہ تحقیقی بنانے کے لئے تمام مواقع اور خارجی اسباب بھی فراہم کئے گئے ہیں۔ چنانچہ دستور کے اسی فقرہ میں بیان کیا گیا ہے کہ "عورتوں کے ان حقوق کو حقیقی بنانے کے لئے عورتوں کے لئے مردوں کے لئے بھی کام کرنے معاوضے حاصل کرنے آرام تعلیم اور (Social Insurance) بیمہ ماں اور بچہ کی حفاظت، زمانہ حمل میں رخصت بادائی اجرت اور زچگی خانوں وغیرہ کے کثیر تعداد میں اہتمام کے ذریعہ ضمانت دی جاتی ہے" کسی سرمایہ دار جمہوریت میں عورتوں کی مساوات اتنے وسیع معنی حاصل نہیں کرسکی کیونکہ اس کے لئے عورتوں کی خاص ضروریات کی فراہمی اور ان کی معاشی آزادی ضروری ہے اور اس چیز کو سوویٹ روس کی عورتوں نے حاصل کرلیا ہے۔

انفرادی آزادی ـــ (Individual Liberty)

سوویٹ روس نے "حق حیات" (جس کی ضمانت کام کرنے کے حق آرام کے حق مادی آسائش اور حق تعلیم کے ذریعہ کی گئی تھی) اور حق مساوات کے ساتھ ساتھ حق آزادی کی ضمانت دی ہے۔ چنانچہ دستور میں فقرات ۱۲۴ تا ۱۲۹ میں اس حق کی تشریح کی گئی ہے۔

فقرہ ۱۲۴ میں آزادی ضمیر کی اس طرح تشریح کی گئی ہے "شہریوں کے لئے آزادی ضمیر کی ضمانت کے لئے سوویٹ یونین (U. S. S. R) میں کلیسا کو مملکت سے اور تعلیم کو کلیسا سے علحدہ کردیا جاتا ہے عبادت کی آزادی اور مخالف مذہب پرچار کی آزادی تمام شہریوں کے لئے تسلیم کی جاتی ہے" اس طرح ضمیر کی آزادی کی حفاظت کی گئی کیونکہ کسی مذہبی مملکت (Theocracy) میں ضمیر کی آزادی حاصل نہیں ہوسکتی اور اس کے لئے تعلیم کا بھی مذہبی اثرات سے آزاد ہونا ضروری ہے۔

فقرہ ۱۲۵ میں تقریر یں اجتماع جلوس اور مظاہروں کی آزادی طباعت، کاغذ کی رسد پبلک

مقامات، سڑکیں، خبر رسانی اور آمدورفت کے ذرائع (Means of Communications) اور دیگر مادی ضروریات کو مزدوروں اور ان کے اداروں کے اختیار میں دے کر قانوناً محفوظ کیا گیا ہے۔ سڈنی ویب (Sidney webb) کے الفاظ میں "عوامی آزادی کا یہ ایک بے نظیر اور انوکھا تحفظ ہے" سرمایہ دارانہ نظام میں انفرادی آزادی کے حق پر اشتمالیوں کی یہ تنقید تھی کہ اس نظام میں اظہار خیال کی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں صرف اخبارات کے مالک ہی آزاد ہو سکتے ہیں اور دوسروں کو صرف ان کی اجازت سے ہی اظہار خیال کا موقعہ مل سکتا ہے اس لئے ان کا خیال ہے کہ صرف سوویٹ روس میں ہی آزادی خیال اور اظہار خیال کے پورے مواقع حاصل ہو سکتے ہیں کیونکہ اظہار خیال کے تمام ذرائع معاشری اور اجتماعی ملک ہیں۔ اسی فقرہ میں یہ بھی صاف طور پر واضح کیا گیا ہے کہ یہ آزادی "مزدوروں کے مفاد اور اشتراکی نظام کے استحکام کے مطابق ہے۔ کرائی لنکو (Krylenko) نے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ "کوئی مزدور کوئی کسان اور کوئی بھی کارکن (Work person) اس پر اعتراض نہیں کرے گا کہ ان لوگوں کو جو سرمایہ داری کا احیاء چاہتے ہیں انہیں آزادی تقریر یا پریس کی آزادی نہیں دی گئی" اس حد تک تو یقیناً اظہار خیال پر پابندی ہے لیکن یہ پابندی اشتراکی معاشرہ کی بقاء کے لئے جو مزدوروں کسانوں اور عوام کا معاشرہ ہے ضروری ہے یعنی یہ پابندی عوام کے لئے اور معاشرہ کے مفاد کے لئے ضروری ہے جس طرح کہ اینگلز نے پہلے ہی کہا تھا کہ کامل آزادی اور مملکت دو متضاد اصطلاحات ہیں کیونکہ مملکت میں کامل آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ سرمایہ دارانہ مملکت میں فرق صرف یہی ہے کہ اول الذکر مملکت میں چند افراد کے مفادات کو معاشرہ کی اکثریت کے مفادات پر ترجیح حاصل ہوتی ہے اور آخر الذکر میں معاشرہ کی اکثریت کے مفادات زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس لحاظ سے اشتراکی معاشرہ میں پوری طرح آزادی اظہار خیال کا وجود نہیں یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے لیکن اگر جس طرح کہ لاسکی نے بتایا ہے کہ امریکہ میں بعض پروفیسروں کو محض اس لئے کہ وہ انتہا پسند خیالات کے حامل ہیں برطرف کر دیا جاتا ہے یا ان مزدوروں کو جو اشتراکیت کی حمایت کرتے ہیں کام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

تو اشتراکی مملکت میں ان لوگوں کے لئے اظہار خیال کی آزادی نہیں جو ایک ایسے معاشرہ کی تخریب کے در پے رہتے ہیں جس میں انفرادی نفع کے بجائے معاشرہ کے فایدہ کا محرک کام کرتا ہے۔ اس کو نقص تو کہا جا سکتا ہے لیکن اگر کوئی چیز پوری طرح مکمل ہو جائے تو پھر ارتقاء کہاں۔ ارتقاء غیر مکمل سے زیادہ مکمل کی طرف ہی تو ہوتا ہے اس لحاظ سے یہ ایک عظیم ارتقاء تو ہے کہ اشتراکی روس میں معاشرہ کے ایک کثیر طبقہ کو اظہار رائے کی آزادی ہے۔ شہریوں کے اس حق کو بھی کہ "وہ اپنی عام تنظیموں (Public Organizations) میں مجتمع ہوں"۔ فقرہ (۱۲۶) میں تسلیم کیا گیا ہے انا لوی اسٹرانگ (Anna Louis Strong) نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کسی بھی سرمایہ دارانہ مملکت کے دستور میں اس حق کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ سوویٹ روس میں ایسی تنظیمی اجتماع کے مقامات چھاپہ گھر اور اشاعت خانوں کی مالک ہوتی ہیں تاکہ افراد کو اظہار خیال کے پورے مواقع حاصل ہوں۔ اس کے علاوہ افراد کی من مانے طریقوں سے گرفتاری بھی ممنوع قرار دی گئی ہے۔ (فقرہ ۱۲۷) اور ایسے بیرونی اشخاص کو جنھیں کسی علمی مشغلہ یا اس مقام کے مزدوروں کی تحریک سے متعلق ہونے یا قومی آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کی بناء پر نقصان پہونچایا جاتا ہو یا پریشان کیا جاتا ہو تو انہیں سوویٹ روس میں پناہ لینے کا حق (Right of Asylum) دیا گیا ہے۔

حقوق ۔ ایک منظم معاشرہ میں حقوق کے ساتھ فرائض بھی ضروری ہیں کیونکہ حقوق فرائض کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ روس کی اشتراکی مملکت میں دستور کی رو سے "ہر شہری کا فرض ہے کہ سوویٹ یونین کے دستور کی پابندی کرے۔ قوانین کی تعمیل کرے اور مزدوروں کے نظم و ضبط کو باقی رکھے پبلک فرائض (Public Duties) کی دیانت داری سے تکمیل کرے اور اشتراکی معاشرہ کے معیارات کا احترام کرے۔ اسی طرح فقرہ (۱۳۱) کی رو سے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اشتراکی مملکت کی سوویٹ نظام کی بنیاد وطن کی دولت اور قوت اور تمام شہریوں کی خوشحالی اور مہذب زندگی کا منبع ہونے کی حیثیت سے حفاظت کرے اور اسے مستحکم کرے سرمایہ دارانہ مملکت میں "ملکیت" کا احترام اور اس کی

حفاظت کی قانوناً ضمانت کی جاتی ہے اور لاک کے الفاظ میں مملکت کا فرض ہے کہ وہ افراد کی جایداد کی حفاظت کرے لیکن اشتراکی مملکت میں شہریوں سے اس کا مطالبہ نہیں کیا جارہا ہے کہ چند افراد کی ذاتی جایدادوں کی حفاظت کریں اور ان کا احترام کریں اشتراکی معاشرہ میں عوامی دولت (Public Wealth) کی بربادی کے معنی عام مہذب اور خوشحال زندگی کے ذرایع کی بربادی کے ہیں۔ شروع شروع میں لوگوں نے اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی تک اس کی اہمیت سے ناآشنا تھے اور اس لئے بہت زیادہ اصراف بھی ہوتا تھا لیکن بعد میں ان میں جب معاشری تصور پیدا ہوا تو انھوں نے اس کی اہمیت کو جانا۔ اور اب توقع کی جاتی ہے کہ مستقبل کی نسل جس کی خوشحالی کا دار و مدار اسی اجتماعی دولت پر ہے، اس اجتماعی دولت کی جبلی طریقہ سے حفاظت کرے گی جس طرح کہ ماضی میں ذاتی جایداد کی کی جاتی تھی اور یہی وہ منزل ہوگی جب قانون اور مملکت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی اور وہ غائب ہو جائیں گے" وطن کی مدافعت روس کے ہر شہری کا مقدس فرض ہے قانون کی رو سے یہی شہریوں کا فرض ہے۔ اشتراکیت جنگ پسند نہیں کرتی اس کی ترقی کے لئے عالمی امن ضروری ہے۔ اس جنگ کے آغاز سے قبل روس کے سابق وزیر خارجہ ایم، لیوٹوف M. Litowov نے "اجتماعی حفاظت" (Collective Security) کے لئے انتہائی کوشش کی تاکہ عالمی امن برقرار رکھا جائے اس نے اس پروگرام کے تحت ہمیشہ یہ کوشش کی کہ دیگر جمہوری ممالک سے اتحاد پیدا کرے تاکہ فسطائی سامراجی خطرہ سے تمام آزادی پسند اقوام کو نجات مل سکے لیکن سرمایہ دارانہ جمہوری ممالک نے اس پالیسی کو قبول نہیں کیا۔ روس کی اشتراکی مملکت کو ہمیشہ اس کا خطرہ لگا ہوا تھا کہ کسی وقت بھی دیگر سامراجی ممالک اس پر حملہ نہ کر دیں۔ روس کا یہ خطرہ غلط نہیں تھا ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو اس خطرہ کی صداقت ظاہر ہو گئی جب کہ نازی جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ کس طرح نازی جرمنی کو اپنی عزایم میں ناکامی ہو رہی ہے اور روسی عوام پوری جانبازی کے ساتھ اپنے وطن اور اشتراکی مملکت کی مدافعت کر رہے ہیں۔ چنانچہ جوزف ڈیوس جو ۱۹۳۶ء-۳۸ء تک ماسکو میں امریکی سفیر کی حیثیت سے رہ چکے تھے اپنی ڈایری میں لکھتے ہیں کہ "دنیا کی کسی حکومت نے لڑائی سے پہلے نازیوں

بڑھتے ہوئے خطرہ کو روکنے کی اتنی کوشش نہیں کی جتنی کہ سوویٹ یونین کی۔ لیکن جب برطانیہ اور فرانس کے رویہ نے ظاہر کر دیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہٹلر سوویٹ یونین پر حملہ کر دے تو کسی حکومت نے اس آنے والے خطرہ کا مقابلہ کرنے کی اتنی مکمل اسکیم تیار نہ کی جتنی اسٹالین اور سوویٹ حکومت نے کی۔ چنانچہ تیسرے پنج سالہ پروگرام کا مقصد یہی تھا کہ سُرخ فوج کو ملک کی حفاظت کے لئے تیار کیا جائے۔

اس عظیم مدافعت کا راز یہی ہے کہ وہاں کے عوام باشعور طریقہ پر مدافعت کر رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے مفادات کی اپنی تہذیبی ادارات کی اور اس نظام کی مدافعت کر رہے ہیں جس نے انہیں خوشحالی تہذیب اور تمدن عطا کیا تھا۔ وہاں کے عوام کا جذبہ رفاقت اسی مدافعت کا اصلی راز ہے۔ جس کے متعلق کرائی لن کو (Krylenko) نے کہا کہ "سرمایہ دار معاشرہ کے اس اصول کے بالمقابل جس کا اظہار اس ضرب المثل میں کیا جاتا ہے کہ ہر فرد دوسرے کا دشمن ہے اور ہر آدمی دوسرے کے لئے بھیڑیا ہے ہم ایک اشتراکی معاشرہ کی تعمیر کر رہے ہیں جس میں ہر آدمی دوسرے کا بھائی ہے اور ہر آدمی دوسرے آدمی کا رفیق ہے" سب سے اہم اخلاقی فتح جو سوویٹ نظام نے حاصل کی وہ یہی "جذبہ رفاقت" ہے اور اس لحاظ سے اشتراکی معاشرہ ایک اخلاقی معاشرہ ہے جیسا کہ گرین نے کہا تھا کہ "معاشرہ کے لئے ایک مشترک اخلاق کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے اشتراکی معاشرہ نے ایک اہم اخلاقی اصول کی تکمیل کی ہے کیونکہ یہاں اس خیر مشترک کے شعور کی راہ میں جو مادی اور خارجی رکاوٹیں جن کا اظہار اغراض اور مفادات کے تصادم میں ہوتا تھا دور کر دی ہیں۔ اب یہاں ایک طبقہ دوسرے کے خلاف ایک فرد دوسرے فرد کے خلاف نبرد آزما نہیں بلکہ تمام افراد میں کامل تعاون عمل اور جذبہ رفاقت موجود ہے۔

سید عالم خوندمیری ایم اے متعلم ال ال بی (ابتدائی)

لطائف و ظرائف

ہمارے ملک میں ایسے بہت سے بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی اور بات چیت میں ہزاروں دلچسپ باتیں کہی اور لکھی ہیں بعض کا تو یہ حال ہے کہ آج ان کی شہرت ان کے اشعار یا کتابوں سے زیادہ ان کی بات چیت لطیفوں، چٹکلوں، ان کی زندہ دلی اور ہجو سے ہے۔ گزشتہ زمانہ میں اردو شاعری میں ہجو کا بہت رواج تھا اتنا رواج کہ ہر وہ شخص جو زمانہ کے ہاتھوں ستایا ہوا ہوتا اور جس میں مصرع سیدھا کرنے کی ذرا بھی قابلیت ہوتی دل کے جلے پھپھولے پھوڑنے ہجو کا رخ کرتا اور صفحے کے صفحے کالے کرتا۔ اگر طبیعت میں مناسبت، ظرافت اور شوخی ہوتی تو ہجو اتنی مزہ دار ہو جاتی کہ ہر شخص تفریح، مذاق اور دل لگی کے لیے ہی پڑھتا اور لطف اٹھاتا۔ یہی وجہ ہے کہ میر جعفر زٹلی (۱۶۵۹ - ۱۷۱۳ء) کا نام آج بہت سے لوگوں کی زبان پر ہے۔ اس نے کئی لوگوں کے متعلق ایسی ہجویں لکھی ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے۔ اور بہت سے مخالفوں پر ایسی پھبتیاں کسی ہیں کہ وہ ہنسی اور قہقہوں کا نشانہ بن گئے۔ آخر میں اُس کی ہزل اور ہجو رنگ لائی اور وہ بادشاہ فرخ سیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

اُن لوگوں میں جنہوں نے ہجو نگاری کو ایک مستقل فن کی حیثیت دی۔ مرزا محمد رفیع سودا (۱۷۱۳ تا ۱۷۸۰) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دلی میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ لیکن جب شہر نادر شاہ، احمد شاہ، اور مرہٹوں کے حملوں سے ویران ہو گیا تو پہلے فرخ آباد گئے پھر فیض آباد کا رخ کیا اور آخر میں نواب آصف الدولہ کے ساتھ لکھنو پہنچے۔ اور وہیں مر کر اٹھے۔ مرزا اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ہجو کو تمام لوازمات کے ساتھ استعمال کیا اور اسے شاعری کی ایک صنف بنا دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس فن سے فطری لگاؤ تھا۔ انہوں نے جس تیزی، طنز، اور ظرافت کے لباس میں خیالات ادا کئے ہیں وہ گدگدی اور سنسناہٹ پیدا کرتے ہیں۔

زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جسے وہ نشان ملامت نہ بنائے ہوں۔ جوانوں کی کمزوریاں، بوڑھوں کی گمراہیاں، اور اس وقت کے نوابوں کی عیاشیاں ان کا تختہ مشق بنیں۔ اپنے زمانہ کی مختلف برائیوں کی بھی انھوں نے ایسی خبر لی کہ ایک اصلاحی پہلو نکل آیا۔ دشمن تو دشمن دوستوں کو بھی نہ چھوڑا اور جب کسی کا پیچھا کیا تو آخر وقت تک ہاتھ نہ دھویا۔ جب کسی سے چل جاتی تو فوراً اپنے غلام "غنچہ" نامی کو آواز دیتے اور وہ قلم کاغذ اور دوات لے کر خدمت میں حاضر ہوتا اور یہ طنز ہزل اور ہجو کے ایسے پھول تراشتے کہ مخالفین تڑپ کر رہ جاتے۔ اس طرح وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے لیکن لوگوں کے دلوں پر سانپ لوٹ جاتے۔ عجب بات تو یہ ہے کہ ان کی ہجو سوز اور ساز، آنسوؤں اور قہقہوں کا سنگم ہوتی ہے۔ اپنے موضوع پر اتنا حاوی ہوتے ہیں کہ چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ان کی باریک نظر سے نہیں بچتی۔ اس سے ان کے وسیع معلومات، زبان پر قدرت اور نظر کی باریکی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

نواب آصف الدولہ والی اودھ ایک نیک طبیعت اور صاحب ذوق انسان تھے۔ نواب صاحب نے مرزا کو نہ صرف "ملک الشعرا" کا خطاب دیا تھا بلکہ سالانہ چھ ہزار کی منصب بھی مقرر کی تھی۔ مرزا نے ان کی تعریف میں بہت سے قصیدے کہے ہیں اور ان کے دشمنوں کی مذمت کی ہے۔ یہ اکثر نواب کے ساتھ ہوتے اور بانوں کے طوطے مینا سے دل بہلاتے، ایک وقت کا ذکر ہے کہ نواب محل میں آرام فرما رہے تھے۔ ان کی انا کی شریر لڑکی نے ایسا شور مچایا کہ نواب اٹھ بیٹھے۔ گڑبڑ کی وجہ معلوم ہوئی تو آپ نے سودا کو طلب کیا اور ایک ایسی ہجو لکھنے کی فرمائش کی کہ وہ شوخ لڑکی پھر سے دم نہ مارے۔ نواب کا کہنا مرزا کے لئے سر آنکھوں پر تھا۔ فوراً دوات، قلم لے کر بیٹھ گئے اور وہیں ایک ہجو لکھ ماری جس کا یہ شعر اب تک لوگوں کی زبان ہے۔

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے　　　نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڈ پیلے

مرزا میں خاص بات یہ تھی کہ وہ مذاقیہ پہلو میں بات سے بات نکال لیتے تھے۔ چنانچہ شیخ قائم علی جو کہ ایک اچھے شاعر تھے، شاگردی کے خیال سے خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی خواہش ظاہر کی۔ سودا نے تخلص دریافت کیا تو شیخ نے کہا "امیدوار" اس تخلص نے مرزا کی آنکھوں میں شرارت کی چمک اور

اور ہونٹوں پر ایک ہلکی سی ہنسی دوڑادی اور کہہ اٹھے۔

ہے فیض سے کسی کے شجر ان کا باردار اس واسطے کیا ہے تخلص امیدوار

شیخ جی بہت جھنائے اور اس عہد کے ساتھ لوٹے کہ اس قسم کے بھکڑ استادی کی شاگردی کا خیال تک دل میں نہ لائیں گے انھوں نے پرانے تخلص امیدوار کو سلام کیا اور نیا تخلص قائمؔ اختیار کیا۔)

مرزا کی زندہ دلی نے بڑھاپے میں بھی ساتھ نہ چھوڑا گو بڑھاپے کا زمانہ تھا مگر طبیعت جوان تھی۔ ایک مشاعرہ میں سید انشاء اللہ خاں انشاء اپنی غزل سنا رہے تھے جس کے ایک دو شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

جھڑکی سہی ادا ہی سہی چیں جبیں سہی سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

انشا کا جوانی کا زمانہ تھا اور بہار کے دن۔ خدا نے صورت شکل بھی دی تھی جب وہ اس شعر پر پہنچے

گر نازنین کہے سے برا مانتے ہو تم میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

تو مرزا سے رہا نہ گیا اور مسکرا کر پکار اٹھے " دریں چہ شک " مشاعرہ میں کھل بلی پڑ گئی۔

مرزا رفیع سوداؔ کے مرنے کے تیس سال بعد (۱۸۱۰) میں اردو کے ایک ظرافت پسند شاعر —— شیخ قلندر بخش جرأت اس زمانہ میں لکھنؤ پہنچے ہیں۔ جب انشاء اور مصحفی کی نوک جھونک کے چرچے نہ صرف دربار میں بلکہ سارے شہر میں مشہور تھے۔ جرأت پہلے نواب محبت خاں کے ہاں ملازم ہوئے اس واقعہ کو انھوں نے کس دلچسپ انداز سے باندھا ہے۔

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

ایک وقت جاڑے کے موسم میں نواب محبت خاں کے مختار نے انہیں مقررہ موسمی کپڑے نہیں دلئے جرأت نے مختار جی کے سامنے یہ رباعی کہی اور کھڑے کھڑے سرمائی حاصل کرلئے۔

مختار جی یہ آپ کیجئے گا نہ گھمنڈ کہتے جسے نوکری ہے بیخ ارنڈ

سرمائی دلائیے ہماری ورنہ تم کھاؤ گے گالیاں ہم کھائینگے ٹھنڈ

ادبی چٹخاروں کے لحاظ سے ماشاء اللہ خاں کے بیٹے انشاء اللہ خاں کا درجہ شیخ قلندر بخش جرأت میر اہل نارنوی، میر غلام حسین افسق، مرزا قتیل، سعادت یار خاں رنگین۔ اور مرزا رفیع سوداؔ سے بھی بڑھا ہوا ہے

انشاء بنگال کی راج دہانی مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ اور سچ مچ باتوں کے بنگالے نکلے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں ۱۷۸۶ء میں دلی آئے اور میٹھی میٹھی باتوں سے سب کا دل موہ لئے۔ دلچسپ حکایتوں لطیفوں اور ہنسانے والے اشعار سے بہت جلد دوسرے درباری شاعری کو نیچا دکھائے۔

اس زمانے میں دلی کے شاعروں میں حکیم ثناء اللہ خاں فراق، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، شاہ ہدایت، میاں شکیبا، میر قمرالدین منت، شیخ ولی اللہ محب، اور مرزا عظیم بیگ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے لیکن انشاء کے آگے ان کی شاعری پھیکی پڑ گئی۔ دلوں میں میل آیا اور یہ ایک دوسرے پر حملے کسنے لگے۔ سوداؔ کے شاگرد مرزا عظیم بیگ انشاء سے خاص طور سے بگڑے ہوئے تھے کیونکہ انھوں نے جب اپنی ایک غزل جو بحر رجز میں تھی انشاء کے سامنے پڑھی تو اس وقت انشاء نے بڑی تعریف کی اور مشاعرہ میں پڑھنے کی تاکید کی لیکن جب عظیم وہی غزل مشاعرہ میں سنائی تو انشاء نے انہیں ٹوک کر آڑے ہاتھ لیا اور کہا کہ اس کے بعض شعر تو بحر رمل کے ہیں۔ پھر ستم یہ کہ ان کی مذمت میں ایک مخمس بھی پڑھ ڈالا۔ جن کے شعر یہ ہیں۔

گر تو مشاعرہ میں صبا آج کل چلے   کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے   پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

مرزا عظیم بیگ نے بھی جواب میں ایک مخمس لکھا جس میں انہیں دہقان بنا ڈالا۔ کہتے ہیں۔

وہ فاضل زمانہ ہو تم جامع علوم   تحصیل صرف و نحو سے جن کی مچی ہے دھوم
رمل و ریاضی حکمت و ہیئت جفر نجوم   منطق بیان معانی کہیں سب زمین کو چوم
تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

اسی طرح انہوں نے مخمس میں انشاء کو جگہ جگہ طفل مکتب، جاہل، بدتمیز، بیوقوف اور آفت کا پرکالا بنایا ہے دلی سے جب دل اُکتا گیا تو انشاء لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ شاہزادہ شاہ عالم کے مصاحب اور پھر مصحفی کو ہٹا کر خود ان کی جگہ استاد بن بیٹھے۔ مزاج کے منچلے تھے اس لئے یہاں بھی دیر تک نہ رہے تفضل حسین خاں علامہ کے ذریعے نواب سعادت علی خاں وزیر اودھ کے دربار میں پہنچ گئے۔ یہاں ایسی

عزت، دولت اور شہرت حاصل کی کہ شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ انہیں خاص طور پر اردو زبان پر بڑی قدرت تھی۔ فی البدیہہ اشعار کہنے کی ان میں خاص خوبی تھی۔ وہ ہر بات آسانی سے مذاق میں ڈھال لیتے تھے وہ نہایت حاضر دماغ اور حاضر جواب بھی تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ وہ شیخ قلندر بخش جرأت سے ملنے گئے، جو ایک زمانہ سے آنکھوں کی قوت کھو چکے تھے۔ جرأت شعر کی فکر میں کھوئے ہوئے تھے اور ایک ہی مصرع کو دل میں بار بار پڑھ رہے تھے۔ انشا نے انہیں جب اس حالت میں دیکھا تو وجہ پوچھی۔ جرأت نے کہا بھئی ایک اچھا مصرع ہاتھ لگا ہے مگر جب تک دوسرا نہ ہو جائے تمھیں نہیں بتاؤں گا۔ نوجوان شاعر نے جب اصرار کیا تو جرأت نے یہ مصرع پڑھا۔ ع

"اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی"۔

اور اسے گھڑی گھڑی دہرانے لگے۔ انشا نے فوراً دوسرا مصرع سیدھا کیا اور اس طرح شعر پورا کیا۔

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی   اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

اس پر جرأت بے اختیار ہنس پڑے اور یہ کہتے ہوئے کیوں صاحبزادہ ہم ہی پر ہاتھ صاف کرتے ہو لکڑی لے کر مارنے اٹھے اور انشا یہ حال دیکھ بھاگ کھڑے ہوئے۔

زبان کی اسی بے لگامی اور طبیعت کی بے پناہ شوخی نے آخری زمانے میں ایسے مخالف حالات پیدا کر دیے کہ ان کی جان پر آبنی ؛

محمد بن عمر ایم۔ اے (عثمانیہ)
لکچرار انگریزی جامعہ عثمانیہ



مسٹر محمد عبد الحفیظ ایم-ایس-سی (آخری)
نائب صدر بزم طبیعیات
مسٹر حفیظ کی طالب علمانہ زندگی شاندار علمی
فتوحات سے مملو ہے انہوں نے امتحان
بی-ایس-سی میں بدرجہ اول کامیابی حاصل کی ہے



مسٹر غلام محبوب انصاری بی-اے (آخری)
نائب صدر بزم فلسفہ
مسٹر انصاری جامعی و غیر جامعی، معاشری و تمدنی
تحریکات میں نمایاں حصہ لیتے ہیں ان کا تعاون
ان تحریکات کے استحکام و تقویت کا ضامن ہوتا ہے



مسٹر اعظم خان ایم۔اے (عثمانیہ)

مسٹر اعظم کا شعبۂ اردو کی لکچراری پر انتخاب
عمل میں آیا ہے۔ یہ عثمانی روایات خلوص و ہمدردی کے
ایک بہترین نمائندہ ہیں



مسٹر امجد علی خاں یوسف زئی بی۔اے (عثمانیہ)

مسٹر امجد وسیع تر احساس کے ساتھ دامانِ اردو کو
ہندی، مرہٹی اور گجراتی جواہر پاروں سے مالا مال
کر رہے ہیں۔ ان کے تراجم مشہور رسائل میں
شائع ہوتے ہیں

پہلی کہانی

ہماری پہلی کہانی جب "کرن" میں چھپی تو ہم ایسے خوش ہوئے جیسے ڈربی کی لاٹری ہمارے نام کھل گئی ہو ـــــ مسرت و خوشی کے نشہ میں مست ہم اپنی بیگم کے پاس پہنچے۔ وہ بیٹھی چھالیا کتر رہی تھیں ـــــ "دیکھا! آج ہماری ایک کہانی چھپی ہے۔" ہم نے اپنے چھپے ہوئے نام پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ ادھر بیگم نے کہانی پڑھنی شروع کی، ادھر کسی صاحب کا آدمی ہمیں بلانے آگیا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد ان صاحب سے چھٹی ملی ـــــ گھر پہنچے۔ سمجھ رہے تھے کہ بیگم مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہیں گی اور ہمیں مبارک باد دیں گی۔

مگر یہ کیا! یہاں تو حال ہی دوسرا تھا۔ چولہے پر جو سبزی چڑھی تھی وہ دور پھینک دی گئی تھی اور بیگم مارے غصے کے سرخ ہو رہی تھیں۔ ہم نے ہمت کر کے آہستہ سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟" "شرم نہیں آتی چار کی لڑکی سے محبت کرتے ہوئے؟" جوالا مکھی ابل پڑی۔ "چھی...... چھی...... کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ کس نالائق نے کہا" ـــــ "کہے گا کون! یہ دیکھئے!!" ـــــ اور ہماری چھپی ہوئی کہانی سامنے رکھ دی۔ کہانی میں ہم نے ہیرو کے نام کی بجائے "میں" لکھا تھا جس کے معنے بیگم نے کہانی لکھنے والے کے لئے تھے۔ ہم نے کہا "یہ تو لکھنے کا ایک ڈھنگ ہے" ـــــ "ڈھنگ ونگ میں کچھ نہیں جانتی۔ اب میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ مجھے ماں کے پاس پہنچا آؤ" ـــــ اور میکے جانے کی تیاری ہونے لگی۔ ہم نے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن تریاہٹ کے آگے ہماری کچھ پیش نہ گئی۔ آخر کار ہم نے مجبور ہو کر بیگم سے کہا۔ "اس بار ہمیں معاف کر دو آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔" اب ہم کیا خاک کہانی نویس بنیں گے! (ماخوذ از ہندی)

سید محی الدین احمد
متعلم بی۔اے (آخری) شعبۂ اردو

کیلنڈر

اسکول کی گھنٹی کی کرخت آواز لڑکیوں کو بے حد رسیلی معلوم ہوئی۔ ان کے چہروں پر مُسکراہٹ کھیلنے لگی سب نے کتابیں اُٹھالیں۔ وہ باہر بھی نکل جاتیں لیکن استانی کو کرسی پر بیٹھی دیکھ کراپنی اپنی جگہ چُپ ہوگئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چمن میں اُڑنے والی سیکڑوں تتلیوں کی چہل پہل اک دم رُک گئی ہے۔ رفیعہ یہ محسوس کرکے فوراً اُٹھ گئی۔ وہ مُسکرا دی۔ مُسکراتے ہوئے باہر نکلنے والی لڑکیوں کو دیکھ کر اسے خیال آیا — کبوتروں کے ڈربے کا ڈھکن اُٹھا دیا جائے تو وہ ایسے ہی باہر نکلتے ہوں گے؟ — ہری ساڑھیاں، کالی چوٹیاں، گلابی فیتے، نیلے پیلے فراک! جیسے قوس قزح رقص کرتی ہوئی کلاس سے باہر جارہی تھی — آخر میں ایک لڑکی نے چلتے چلتے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور "آداب استانی ماں!" کہہ کر چل دی — استانی ماں! وہ برابر پانچ سال سے یہ لفظ سُن رہی تھی۔ لیکن آج سے پہلے کبھی اس قدر تکلیف دہ معلوم نہ ہوا خصوصاً لفظ "ماں"! اُس نے فوراً منی بیگ کھول کر آئینے میں اپنا مُنہ دیکھا۔ اس کا دل کہتا تھا — اُردو زبان بالکل بے ڈھنگی ہے۔ ۲۵ سالہ جوان عورت استانی بن جائے تو کیا اسے "ماں" کہنا ضروری ہے؟ ہشت! — رفیعہ اسکول کے صحن میں آئی تو سارا صحن لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک دوسرے سے چہلیں کرتی ہوئی باہر نکلنے والی لڑکیوں کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا — جب وہ چھوٹی تھی تو چھٹی کی کتنی مسرت ہوتی تھی! — لیکن آج صبح کیلنڈر کا صفحہ بدلنے کیلئے ہاتھ آگے بڑھایا گر مجبوراً پیچھے کھینچ لینا پڑا۔ ۲۵ کیا، ۲۶ کیا اور کیا ۳۰ — سب دن ایک سے!

جب وہ گھر پہنچی تو خادمہ کروندے لے آئی۔ اس نے یوں ہی ایک دو کروندے مُنہ میں ڈال لیے بیج پھینکنے کے لئے وہ کھڑکی تک گئی۔ کروندے کا وہ سیاہ رنگ، وہ کھٹ مٹھا ذائقہ — اور یہ بیج کروندے کے

پیٹ میں رہتے ہوئے بھی غیر متاثر رہے! اس کا دل کہتا تھا — اس کا جیون بھی ان بچوں کا سا ہے؟ اس کے اطراف......

میز پر رکھی ہوئی کتابوں پر نظر پڑی۔ پانچ سال پہلے وہ کتنی آرزو اور شوق سے اس کرسی پر بیٹھی تھی۔ کمسن لڑکیوں کی زندگی سنوارنے کی پاکیزہ ذمہ داری قبول کی تھی! کتابیں پڑھنے، خلاصے لکھنے، مشاہیر کی سیرت بیان کرنے، کتنے ہنگاموں میں ختم ہوا ایک سال! لیکن پہلے سال کا لطف دوسرے سال نہ آیا تیسرے سال وہ کس قدر بیزار ہوگئی۔ اور چوتھے سال تو مقویات استعمال کرنے لگی تھی اور اس سال تو —

بکم امرداد سے اسکول کا چھٹا سال شروع ہونے والا تھا۔ اور اُسے ایسے کتنے برس گزارنے ہیں! سال گزرنے ہیں تو جیل کے قیدیوں کی رہائی کی اُمید بڑھتی جاتی ہے لیکن سماج کے بے گناہ مجرموں کی حالت بالکل نرالی ہے۔ وہ سوچنے لگی — چھٹیوں کے بعد ہی سردی تھوڑی شروع ہوگی؟ ابھی خاصی گرمی رہتی ہے۔ سویرے ساڑھے پانچ بجتے ہی صبح نمودار ہو جاتی ہے اور شام کے ساڑھے سات ہونے پر بھی شام کی سیاہی زمین پر ہی جھولتی رہتی ہے — محبت کرنے والا بوسہ لے کر چلا جاتا ہے تو بھی محبوب کے دل میں اس کی میٹھی ترنگ...... رقیہ چونک پڑی! اس تصور سے اُسے حیرت ہوئی۔ اس کا دل کہتا تھا — حیرت کی بات ہی کیا ہے؟ ایسے تصورات عمر کا تقاضا ہیں۔ تو استانی ضرور ہے لیکن راہبہ نہیں!

اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ڈاکیہ سامنے کی عمارت میں داخل ہوا۔ دوسری منزل میں کھڑی ہوئی ایک جوان لڑکی اسے دیکھتے ہی عجلت سے نیچے اترنے لگی۔ رقیہ کو یاد آیا۔ گزشتہ مہینے اس کی شادی ہوئی ہے — رقیہ دیکھ رہی تھی — اس حسینہ نے ڈاکیہ کے ہاتھ سے خط تقریباً چھین لیا۔ ساتھ ہی اس کے گلاب کھِل اُٹھے۔ اس کے شوہر ہی کا خط ہوگا! — اُس نے ایک آہ کھینچی۔ دُکھے ہوئے دل کے ساتھ میز کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ وہ گھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔ ٹک ٹک کی آواز اس کے کانوں پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہی تھی! اس نے میز کی طرف دیکھا۔ بالکل درمیان میں اس کی تصویر رکھی تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ نوکر ہوئی تو یہ تصویر

کھنچوائی تھی۔ اُسے تصویر پر بے حد غصہ آیا۔ اس نے تصویر اُٹھا کر میز کی دراز میں ڈال دی ٹک ٹک ... ٹک ٹک ... پھر اس کے کانوں میں آواز گونجنے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا دماغ خیالات کے ہجوم سے بیکار ہوگیا ہے وہ بے چینی سے پیچھے پلٹ کر دیکھی۔ کیلنڈر پر پھر اُسے ۲۵ خورداد کی تاریخ نظر آئی۔ اُسے یکم امرداد کی یاد آئی۔ ۳۵ دن! ہر دن کے چوبیس گھنٹے — ہر گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور ہر منٹ کے ساٹھ سکنڈ.... کیسے کاٹے یہ وقت؟ — اسے اپنی اسکول کی سہیلیاں یاد آگئیں۔ ان میں کی اکثر اپنی گرہستی میں مگن تھیں —! اسے خیال آیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ طویل عرصہ کسی کی میٹھی باتوں، دلچسپ صحبت اور کسی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کٹ جاتا — پھر زور سے ٹک ٹک کی آواز آئی۔ اب کہیں اس کا خیال دروازہ پر پہنچا۔ اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ڈاکیہ کھڑا تھا — میرا خط؟ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے — خط ماں کا ہوگا کسی سے منت کرکے لکھوایا ہوگا سوچتی ہوگی بیٹی ماں کے پاس رہے — رقیعہ کے دل میں یہ خیالات چکر لگا رہے تھے اور نگاہیں خط پر گھوم رہی تھیں۔ یکایک نظر "تمہاری صبیحہ" پر پڑی لیکن — اس کی آنکھوں میں حیرت انگیز چمک پیدا ہوگئی۔ وہ جلدی سے سامان لپیٹ کر چل دی —

صبیحہ کے پاس جانے کے بعد وہ سکون اور آرام محسوس کرنے لگی تھی۔ قفس سے چھوٹنے پر پرندہ جیسا درخت کی ایک پھننگ سے دوسری پھننگ پر بیٹھتا اور ریتوں کو ٹھونگیں مارتا ہے نا۔ رقیعہ کی بھی بالکل یہی کیفیت تھی!

اسکول کے زمانے میں صبیحہ اس کی جگری دوست تھی۔ گزشتہ پانچ برسوں سے ان کی ملاقات نہ تھی اس لئے یہ ایک طرح سے مسرت ہی کی تو بات تھی لیکن اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ رقیعہ ایک سکھی زندگی گزار رہی تھی — رقیعہ کا کمرہ اس کے کمرے اتنا ہی تھا۔ لیکن اس کمرہ میں میز پر صبیحہ اور مزمل کی ایک خوبصورت تصویر حسین، لیکن کاغذی پھولوں کا گلدان، نظموں اور افسانوں کی کتابیں اور صبیحہ کے سنگار کے سامان کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ خلاصوں کی کتابیں، لڑکیوں کی مشقی بیاضیں، چاقو، ربر، دوات ایسی کوئی چیز نہ تھی وہاں! — یہ سب دیکھ کر رقیعہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ جنگل سے کسی باغ میں آگئی۔ دل ہی دل میں کہنے لگی "صبیحہ

بڑی قسمت والی ہے !" ـــــ ایک دن صبیحہ کا مزاج خراب ہوگیا۔ شام کی چائے کے وقت دیکھی کہ مزمل صبیحہ کے بستر پر بیٹھا اُسے چائے پینے پر مجبور کر رہا ہے۔ آخر وہ کہنے لگا۔ "چھوٹے بچے کو گود میں لے کر دودھ پلاتے ہیں نا۔ ایسا ہی میں بھی تجھے چائے پلاؤں گا"۔ اتنے میں رقیعہ کمرے میں داخل ہوئی تو مزمل وہاں سے اُٹھ گیا۔ ورنہ وہ اس نئی ترکیب پر عمل ضرور کرتا۔ مزمل مُسکراتا ہوا نکل گیا ـــــ

ایک دن رقیعہ کو کنگھی ملتی نہ تھی۔ اس نے خیال کیا صبیحہ نے جلدی میں کہیں رکھ دیا ہوگا اور پھر کچھ سوچ کر میز کی دراز کھولی۔ اس میں کنگھی نہ تھی لیکن دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ رقیعہ کا ذوقِ جستجو جاگ گیا۔ اس نے دستخط دیکھے ـــــ تیراہی۔ مزمل !۔ خط پڑھنے کے لیے وہ بیتاب ہوگئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر خط پڑھنا شروع کیا۔ خط پڑھ کر اسے محسوس ہوا جیسے وہ چاندنی کے سمندر میں تیر رہی ہے۔ اس کے دو تین جملے تو رہ رہ کر یاد آنے لگے۔ تین ماہ قبل صبیحہ میکے گئی ہوئی تھی۔ اس وقت مزمل نے یہ خط لکھا تھا۔ خط میں اس نے ایک دلچسپ تاویل کی تھی۔ لکھا تھا ـــ صبیحہ ! بچپن میں استاد نے سکھایا تھا کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ اب میرا یہ تجربہ ہے کہ ایک اور ایک مل کر سارا عالم ہوتا ہے ! اور اس میں سے کوئی ایک کم ہو جائے تو دوسرے ایک کی قیمت گھٹ جاتی ہے ! ـــــ رقیعہ سوچنے لگی۔ یہ محبت کا حساب کتنا اچھا ہے !! اور میں جو جماعت میں پڑھاتی ہوں وہ ـــ الف اور ب کام کرتے ہیں، ب درمیان میں کام چھوڑ دیتا ہے ! توبہ، توبہ ! ـــــ

مہینہ بھر وہ دل ہی دل میں صبیحہ پر رشک کرتی رہی۔ آخر کار صبیحہ پر اپنا خیال ظاہر کئے بغیر اُسے چین نہ آیا۔ ایک دن باتوں باتوں میں کہہ گئی ـــ بہن تو قسمت والی ہے !۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سُن کر صبیحہ ضرور مُسکرائے گی۔ لیکن صبیحہ نے اس کی طرف صرف تعجب خیز نظروں سے دیکھا۔

رقیعہ اپنے مستقر آگئی۔ اس کی نظر پھر کیلنڈر پر پڑی۔ وہی تاریخ ! اس نے اس تاریخ کو علحدہ نہ کیا۔ سوچا سب دن ایک سے ہیں !۔ پھر وہی تنہائی، خلا اور ٹھہراؤ ! صبیحہ کے گھر کے تازہ تاثرات کے سبب تو یہ زندگی

اسے بہت ہی تھکا دینے والی محسوس ہوئی۔ صبح اُٹھنا، ایک پیالی چائے بنانا اور تنہا ہی پینا۔ تنہا ہی کھانا اور تنہا ہی رہنا ــــ یہ تنہائی کی آگ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی ــــ وہ نئی نئی کتابیں لے آئی۔ لیکن ہر کتاب کے دس پانچ صفحے پڑھ کر اُکتا جاتی اور کتاب ہٹا کر میز پر رکھی ہوئی صبیحہ اور مزمل کی تصویر دیکھتی رہتی۔ دیکھتے دیکھتے اُسے صبیحہ کی جگہ اپنی ہستی نظر آتی۔ مگر مزمل کی ــــ اس کے لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ جگہ خالی ہی رہتی! ــــ

دوسرے دن اسکول کھلنے والا تھا کہ صبیحہ کا خط ملا۔ لکھا تھا ــــ میں گاؤں پہنچ گئی۔ تمہاری بہت یاد آتی ہے۔ کیا بتاؤں زہرہ بہن کے ساتھ وقت کتنا اچھا کٹ جاتا ہے۔ وہ بہت باتونی اور ہشیار ہے۔ وہ تجھ سے ملنے کی آرزومند ہے۔ پانچ منٹ کی ملاقات میں پانچ سال کی دوست بن جاتی ہے۔ اور پھر میں اور وہ کوئی دو نہیں ...... میں اور وہ دو نہیں۔ یہ تو لکھ چکی! لیکن رفیعہ میری ایسی قسمت کہاں؟ رفیعہ! اس کے دو بچے دیکھتے ہی میں کچھ کھو سی جاتی ہوں۔ میرے دو ماہ بعد اس کی شادی ہوئی اور اب اس کے تین بچے ہیں اور میں ــــ

مزمل مجھے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ لیکن رفیعہ سچ بتاؤں! صرف شوہر کی محبت سے بیوی کو سکون نہیں مل جاتا ــــ کسی بیل کو خوبصورت پتے ہیں لیکن پھول ایک بھی نہیں کھلتا۔ میرا جیون ایسا ہی ہے! ایک دن تم کہتی تھیں ــــ صبیحہ تم قسمت والی ہو! ــــ لیکن میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ زہرہ خوش قسمت ہے! ــــ

تم سمجھتی ہو گی میں سکھی ہوں۔ سکھ؟ گرہستی اور ڈونگر دور ہی سے سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن سچ کہوں؟ جوالا مکھی اندر ہی اندر اُبلتا رہتا ہے نا۔ بالکل یہی حال ہے میرا! روپیہ ہے، شوہر کی محبت ہے۔ آرام ہے لیکن .... تمہاری!

رفیعہ کیلنڈر کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ وہی مہینہ پھر پہلے کی تاریخ اور وہ قریب آئی۔

اور چیراچیر صفحات پھاڑنے شروع کئے۔ آخر کار آخری تاریخ پھاڑتے ہوئے وہ بولی ـــ کل کا کام آج !ـــ اور چیر ـــ

پہلی تاریخ دیکھ کر اسے خیال آیا۔ کل مدرسہ شروع ہوگا! پھر وہی قفس! وہی مخصوص دانہ پانی اور وہی رٹتے ہوئے بول! اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ کیلنڈر کو گھورتی رہی۔ اور ایک دم اس کے ذہن میں صبیحہ کے الفاظ گھوم گئے ـــ سکھ ؟ گرہستی اور ڈونگر دور سے سہانے نظر آتے ہیں ـــ جو الا مکھی اندر ہی اندر ابلتا رہتا ہے ـــ قید سے بھاگا ہوا قیدی کتنا خوش ہوتا ہوگا! آج میں بھی بے حد سکون سے سوؤنگی ـــ بڑی دیر تک وہ انھیں خیالات کی گرداب میں پھنسی رہی، کبھی اس کا دل دکھ، مایوسی اور کوفت کے برساتی نالے میں بیٹھ جاتا اور کبھی آرزوؤں اور امنگوں کی لہریں مسکرا مسکرا کر ناچنے لگتیں ـــ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قایم نہ رہ سکی۔ بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ خیال اور حقیقت میں اتنا ہی بعد ہے جتنا قطبین میں! ـــ

محمد عبد القادر فاروقی متعلم بی۔اے (ابتدائی)

رباعی

جو دہر میں ہاتھ آتا ہے کھو دیتا ہوں
ساحل پہ سفینے کو ڈبو دیتا ہوں
نادر میں غم آشنا ہوں ایسا کہ یہاں
سامان خوشی دیکھ کے رو دیتا ہوں

سکندر علیخاں نادر متعلم بی۔اے (ابتدائی)

اجنبی اقوام کو مراعات خصوصی

زمانہ حال میں مراعات خصوصی کے تحت یورپی اقوام کی رعایا کو مشرقی ممالک میں جو خصوصی قانونی حیثیت حاصل رہی ہے اس سے سب لوگ واقف ہیں۔ نیز اس سے بھی کہ ان مراعات سے بیجا فائدہ اٹھانے کے باعث کس طرح رفتہ رفتہ مشرقی مملکتوں نے ان مراعات کو ختم کر دیا لیکن اس سے کم لوگ واقف ہوں گے کہ یہ چیز کچھ اہل مغرب ہی سے شروع نہیں ہوئی بلکہ زمانہ قدیم میں یہ ایک عام رواج تھا کہ قانون کو مقامی کی جگہ شخصی سمجھا جائے اور جو شخص پیدائشی طور پر جس قانون کا تابع ہو وہی دنیا کے ہر حصے میں اس پر نافذ رہے، چاہے وہ اب اپنی ہی مملکت میں ہو یا غیر ممالک میں سفر کی حالت میں۔

اس مختصر مقالے میں ہم صرف ایک قوم یعنی زمانۂ اسلام کے عربوں کے متعلق کچھ نظائر یکجا طور پر پیش کریں گے جن سے معلوم ہو سکے گا کہ عربوں نے دنیا کے کس کس حصے میں اپنے تجارتی یا دیگر تعلقات قائم کر دئے تھے اور ان تعلقات سے مقامی حکومتوں کو کچھ اتنی منفعت تھی کہ وہ بڑی خوشی کے ساتھ ان عرب نو آبادکاروں کو عدالتی مراعات خصوصی عطا کرنے پر آمادہ تھیں۔

اسلامی قانون بے انتہا شخصی ہے اور ساتھ ہی ہمہ گیر بھی ہے جس کے باعث وہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق احکام دیتا ہے چاہے یہ مسائل عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے یا تعزیرات وزواجر سے۔ اسی طرح معاملات چاہے رعایا کے ہوں یا حکومت کے۔ نیز اسلامی مملکت میں پیش آنے والے امور ہوں یا اس کے باہر اجنبی ممالک میں۔ غرض ہر امر کے متعلق شریعت نے احکام دے رکھے ہیں۔ اگرچہ ان میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق بھی ضرور ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ایک حدیث شریف میں صراحت کے ساتھ اس کا ذکر ہے کہ جو مسلمان اسلامی مملکت کے باہر مقیم رہیں تو ان کو چاہیئے کہ عام مسلمانوں کی طرح احکام خداوندی کی تعمیل کرتے رہیں البتہ انہیں اسلامی رعایا کو

حاصل ہونے والے بعض حقوق یعنی اسلامی مملکت کی آمدنی کا حصہ اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک کہ وہ ترک وطن کرکے اسلامی سرزمین میں نہ آبسیں (دیکھئے صحیح مسلم جلد ۵ صفحہ ۱۳۹ تا ۱۴۰)۔ قرآن مجید میں بھی ایک آیت میں یہ ذکر ہے کہ اگر مسلمان کسی غیر اسلامی مملکت میں مقیم ہوں اور مقامی حکومت ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے تو ایسی صورت میں ان مسلمانوں کے کیا فرائض ہیں۔ نیز اسلامی مملکت کو کیا تدبیریں اختیار کرنے کا حق ہے۔ (دیکھئے قرآن مجید سورہ ۸ آیت ۷۲ ومابعد)۔ امام ابو یوسف نے بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے (جیسا کہ مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صفحہ ۹۵ میں ذکر ہے) کہ "المسلم ملتزم احکام الاسلام حیث ما کان" یعنی مسلمان احکام اسلامی کا پابند ہوگا چاہے جہاں کہیں بھی وہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک تو احکام کی پابندی اس آزادی پر منحصر ہوگی جو اسے غیر اسلامی مملکت عطا کرے ورنہ بہت سے ممالک میں تو اذان جیسی بے ضرر چیز کی تک ممانعت اب تک باقی ہے۔ دوسرے یہ پابندی اس تحدید و تدارک کی تابع ہوگی جو غیر ممالک میں ان اسلامی احکام کی تعمیل کے لئے پائی جائے۔ تیسرے اگر ایک فریق معاملہ غیر مسلم ہو تو پھر شریعت کی پابندی مسلمان کے لئے اور بھی مشکل ہو جائے گی۔ بہرحال یہ واضح کردینا چاہیے کہ مسلمان فقہا اگرچہ اس پر زور دیتے ہیں کہ مسلمان دنیا کے ہر حصہ میں اپنے شرعی احکام کی تعمیل کے پابند ہیں لیکن ساتھ ہی وہی فقہا یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جب کبھی احکام شرعی کی تعمیل نہ کرائی جاسکتی ہو یعنی اختیار سماعت غیر مسلم حکومت کو حاصل ہو تو پھر مسلمان پر شریعت کی پابندی محض اخلاقی رہتی ہے مادّی نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی مسلمان بیرونی ممالک میں خلاف شرع فعل کا ارتکاب کرے اور پھر اسلامی مملکت کے حدود میں آئے تو بھی اسلامی عدالتیں اس کے مقدمے کی سماعت نہیں کرسکتیں۔ اس اصول پر فقہا اتنا زور دیتے ہیں کہ اگر غیر ممالک میں کسی غیر مسلم نے کسی مسلمان کو مثلاً قتل بھی کردیا ہو تو قاتل کے اسلامی سرزمین میں آنے کے باوجود اس پر اسلامی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا۔ اس بارے میں سرخسی کا ایک اقتباس دلچسپی کا موجب ہوگا۔ "اگر کوئی مسلمان کسی غیر اسلامی سرزمین میں وہاں کی حکومت سے اجازت لے کر داخل ہوا اور وہاں کے لوگوں کو کچھ قرض دے یا ان سے کچھ قرضہ حاصل کرے اسی طرح چاہے اس نے وہاں والوں کی جائداد غصب کی ہو یا خود اس مسلمان کی جائداد غصب کرلی گئی ہو تو ایسے مسلمان کے

مقدمے کی سماعت اسلامی مملکت کی عدالت میں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان افعال کا ارتکاب ایسے مقام پر ہوا تھا جہاں اختیار سماعت اسلامی حکومت کو حاصل نہ تھا۔ جہاں تک اس مسلمان کا تعلق ہے جس نے ان لوگوں کی جائداد غصب کی تھی اور اس نے اجازت سفر حاصل کرتے وقت ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس طرح کے جرائم کا ارتکاب نہیں کرے گا تو ایسے شخص کے خلاف مقدمے کی سماعت سے اسلامی عدالت کا انکار کرنا اس امر پر مبنی ہے کہ اس نے اپنے ذاتی اقرار کی خلاف ورزی کی نہ یہ کہ وہ اقرار اسلامی مملکت نے کیا ہو۔ البتہ فقہا اسے ضرور رائے دیں گے کہ وہ ان کی مغصوبہ جائداد کو واپس کر دے۔ لیکن اسلامی قاضی اسے اس پر مجبور نہیں کر سکے گا اور جہاں تک اس اجنبی کا تعلق ہے جس نے وہاں مسلمان کی جائداد غصب کر لی تھی تو اس مسلمان کی دادرسی سے اسلامی عدالت کا انکار کرنا اس امر پر مبنی ہے کہ اس مسلمان کے خلاف جرم کا ارتکاب۔ ایسے مقام پر ہوا ہے جہاں اسلامی عدالت کو اختیار سماعت حاصل نہ تھا۔ چنانچہ اگر ان لوگوں نے اس مسلمان کو قتل بھی کر دیا ہوتا تو اسلامی عدالت کوئی مواخذہ نہیں کر سکتی۔ اگر وہ اس مسلمان کی جائداد تلف یا غصب کریں تو سماعت سے انکار بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوگا۔ یہ سب اس اصول پر مبنی ہے کہ جب مسلمان نے خود ہی اپنے آپ کو جوکھم میں ڈالا اور اسلامی سرزمین کی حفاظت سے باہر نکل کر اپنے لئے خود ہی خطرہ مول لیا تو اس نے اپنی ذمہ داری پر یہ کام کیا ہے۔ قرض دینے کے متعلق بھی یہی احکام ہیں جیسا کہ مدیون غیر مسلم اسلامی سرزمین میں آئے .... اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم سرزمین میں وہاں کی اجازت لے کر جائے اور وہاں کسی کی جان یا مال کو نقصان پہنچا ہے تو منفرد کے اسلامی علاقے میں آنے پر بھی اس مسلمان کے خلاف اسلامی عدالت میں مقدمے کی سماعت نہیں ہو سکے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہاں کے باشندے انھیں جرائم کا ارتکاب اس مسلمان کے خلاف کرتے تو بھی ان لوگوں کے اسلامی سرزمین میں آنے کے باوجود ان پر اسلامی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس وقت اسلامی اختیار سماعت کے حدود میں نہ تھے۔ یہی حال اس مسلمان کا ہے جب کہ اس نے اس فعل کا ارتکاب ان لوگوں کے خلاف کیا لیکن یہ امر اس مسلمان کے لئے دیانتاً مکروہ ہوگا کہ اپنے کئے ہوئے اقرار کی خلاف ورزی کرے اور یہ خلاف ورزی

حرام ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی اپنے عہد کی خلاف ورزی کرتا ہے تو قیامت کے دن ایسے شخص کے اوپر ایک جھنڈا لہرایا جائے گا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ ایک غدار شخص ہے۔ چنانچہ اس بنا پر اگر وہ مسلمان اپنے عہد کی خلاف ورزی کر کے جب کچھ جائداد حاصل کرے اور اسے اسلامی سرزمین میں لائے تو دوسرے مسلمانوں کے لئے اس جائداد کا خریدنا مناسب نہ ہوگا جب کہ انھیں وہ واقعات معلوم ہوں۔ کیونکہ اس جائداد کا حصول نامناسب وسائل سے ہوا تھا اور اس کے خریدنے سے ایسے شخص کو ترغیب ہوگی کہ آئندہ بھی اس طرح کے افعال کا ارتکاب جاری رکھے اور کسی مسلمان کے لئے ایسی چیز میں مدد دینی جائز نہیں۔ یہ چیز بھی ایک حدیث پر مبنی ہے کہ المغیرہ بن شعبہ نے اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیا تھا اور ان کا مال لوٹنے کے بعد مدینہ آکر اسلام قبول کیا تھا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ اس لوٹ کو جائز مال غنیمت قرار دے کر حسب قاعدہ اس کا پانچواں حصہ سرکاری خزانے کے لئے قبول کر لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرا اسلام تو قبول کیا جاتا ہے لیکن تیری جائداد چونکہ غداری کی کمائی ہے اس لئے ہمیں وہ درکار نہیں ——— ایسی جائداد کو خریدنے کی ممانعت قطعی نہیں ہے بلکہ اسے مکروہ قرار دیا گیا ہے" (مبسوط سرخسی جلد ۱ صفحہ ۹۵ تا ۹۷)۔

اگرچہ مسلمان فقہا شریعت کے شخصی ہونے پر زور دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ مسلمان جہاں بھی ہو اپنے قانون کی اتباع کا پابند ہے لیکن پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو مسلمان غیر ممالک میں مقیم ہوں ان پر دو طرح کی سختیاں ہوتی ہیں۔ ایک تو اسلامی قانون خود ان کی قانونی اہلیت گھٹا دیتا ہے۔ مثلاً کوئی مسلمان اسلامی سرزمین میں کسی کو امان دینے کا مجاز ہوتا ہے لیکن جو مسلمان غیر ممالک میں ہو وہ وہاں کسی شخص کو امان دینے کا مجاز نہیں ہوتا جیسا کہ مبسوط سرخسی جلد ۱ صفحہ ۔ ، میں بیان ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسے مسلمان کو اپنے مقام سکونت کے قوانین و احکام کی تعمیل کرنی پڑے گی جو بسا اوقات اسے شریعت کی تعمیل میں مانع ہو سکتے ہیں۔

اس بارے میں تاریخی نظائر سے بحث کرتے ہوئے سب سے پہلے ہم عہد نبوی میں ہجرت حبشہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ابھی کوئی اسلامی مملکت وجود میں نہیں آئی تھی

البتہ ان مہاجرین حبشہ کی جب پندرہ سال بعد واپسی ہوئی تو مدینۂ منورہ میں اسلامی مملکت وجود میں آچکی تھی۔ بہرحال ہجرت حبشہ کے آغاز پر جو صورت حال تھی اس کے متعلق مورخوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو وہاں ضمیر کی مکمل آزادی حاصل تھی اور وہ باوجود حبشیوں سے الگ مذہب رکھنے کے عقائد اور عبادات میں اسلامی قانون کی بے کھٹکے تعمیل کر سکتے تھے۔ جب ان لوگوں کو مکہ میں ستایا جا رہا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا کہ:-

"تم حبشہ جاؤ وہاں ایک ایسا حکمران ہے جو انصاف کرتا ہے ظلم نہیں کرتا" سیرت ابن ہشام وغیرہ میں مروی ہے۔ یہ مہاجر بیان کرتے ہیں کہ انھیں وہاں روزانہ اسلامی طریقے پر نماز پڑھنے اور خدا کو ایک ماننے وغیرہ میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی گئی بلکہ دو مرتبہ جب مکہ والوں کا وفد اس غرض سے حبشہ آیا کہ تحویل ملزمین کے اصول پر ان لوگوں کو مکہ والوں کے سپرد کر دیا جائے تو نجاشی یعنی حکمران حبشہ نے اس سے قطعی انکار کیا تھا (طبقات ابن سعد جلد ۱ حصۂ اول صفحہ ۱۳۶، سیرت ابن ہشام صفحہ ۲۱۷ وما بعد نیز ۷۱۲ وما بعد، تاریخ طبری سلسلہ اول صفحہ ۱۶۰۹، مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۹۸ Rivista degli Studi Orientali Voex (1923) PP 90-98

اس کے برخلاف اسی عہد نبوی میں شمالی عرب کے علاقہ معان کا گورنر جب مسلمان ہو گیا تو بیزنطینی یعنی رومی قیصر نے اسے حکم دیا کہ فوراً مرتد ہو جائے۔ جب اس نے انکار کیا تو اسے سزائے موت دے دی گئی (طبقات ابن سعد جلد ۱ حصہ دوم صفحہ ۳۱، سیرت ابن ہشام صفحہ ۹۵۸۔ اس نومسلم گورنر اور پیغمبر اسلام کی خط و کتابت کے متن کے لئے دیکھئے میری تالیف الوثائق السیاسیہ) مسلمان مورخ ایک اور واقعہ کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ عہد نبوی میں قیصر روم کے دربار کے ایک بہت بڑے پادری ضغاطر Auto Cratis نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تو عیسائی حاضرین نے اسے وہیں قدموں میں مسل کر مار ڈالا (تاریخ طبری سلسلہ اول صفحہ ۱۵۶۷)۔

غیر ممالک میں مسلمانوں سے اچھے یا برے برتاؤ کی مثالیں بے شمار ہیں جن میں سے چند

قدیم کا ہم ابھی نیچے ذکر کریں گے۔ لیکن یہ واضح کر دینا ہے کہ سلوک کا اچھا یا برا ہونا عموماً حکمران وقت کے رجحان کا نتیجہ ہوا کرتا تھا نہ کہ کوئی اصول اور مقررہ قاعدہ۔

مسلمانوں کے لئے ممالک غیر میں مراعات خصوصی

اس بارے میں اب تک کوئی تفصیلی مواد جمع نہیں ہو سکا ہے جس کے باعث قانون مراعات کا کوئی نظام مستنبط کرنا آسان نہیں۔ یہاں فی الحال ہم اس طرح کا مواد یکجا کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں :-

(۱) ۳۱ھ میں جب کہ حضرت عثمانؓ خلیفہ تھے مسلمانوں اور نوبیہ کے عیسائی بادشاہ میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس میں یہ قرار پایا تھا کہ اگر مسلمان نوبیہ جائیں تو کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ نیز اس کے پائے تخت دنقلہ کی مسجد میں اگر وہ نماز پڑھیں تو اس کی کوئی ممانعت نہیں کی جائے گی۔ تحویل ملزمین کے متعلق بھی اسی معاہدے میں بعض انتظام منظور کئے گئے تھے (خطط مقریزی مطبوعہ بولاق جلد ۱ صفحہ ۲۰۰)۔

(۲) حجاج بن یوسف گورنر عراق کے زمانے میں جب کہ خلافت بنی امیہ کا آغاز تھا تو بہت سے مسلمان عراق سے بھاگ کر ملیبار (جنوب مغربی ساحل ہندوستان) میں آ پناہ گزیں ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جو برتاؤ ہوا تھا اس کے متعلق ہمارے مورخ نے لکھا ہے کہ "یہ اعانت باد موافق و مخالف مختلف بنادر میں پہنچے۔ ہنود اس نئی قوم کو دیکھ کر اترنے میں مانع ہوئے۔ آخر میں نہایت عاجزی و التجا کرنے کے بعد عہد و پیمان لے کر اترنے کی اجازت ملی۔ اولاً انھیں بنادر میں قول و قرارنامہ دے کے فروکش ہوئے۔ اقرارنامہ اس بات کا تھا کہ ہنود کی طرز روش میں رہیں اور لباس بھی اس دیس کا اختیار کریں۔ غربائے اسلام نے یہ امر لاچاری بہ مصداق ضرب المثل سے جیسا دیس ویسا بھیس۔ ہنود کا لباس اختیار کیا اور اہل اصنام کے ساتھ مل جل کر شیر و شکر کی طرح رہنے لگے اور مقتضائے حال کے موافق ہر ایک نے پیشہ و حرفہ اختیار کیا اور بکمال ہشیاری سے زندگی بسر کرتے تھے اور اسلامی شعار نہایت احتیاط سے ادا کرتے تھے۔ اذان و قرارت و قرآن اس طرح پڑھتے تھے کہ کوئی فرد ہنود

نہ سنتے" (محبوب الوطن مولفہ عبد الجبار خاں ملکاپوری صفحہ ۴۰)۔

(۳) مسلمان حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں بمبئی اور سندھ کے ساحلوں پر پہنچ گئے تھے جیسا کہ بلاذری نے فتوح البلدان میں اور قدامہ بن جعفر نے کتاب الخراج میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ ان کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ جب ہندوؤں کا شہر مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن گیا تو ہندوؤں نے وہاں کی مسجد مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رہنے دی جہاں وہ جمعہ کی نماز کے خطبہ میں خلیفۃ المسلمین کے لئے دعا کرنے کی بھی آزادی رکھتے تھے (قدامہ بن جعفر کی کتاب الخراج مخطوطہ استنبول باب ۴ فصل ۱۹)۔

(۴) مسعودی نے چوتھی صدی ہجری کے پہلے عشرہ میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی وہ لکھتا ہے کہ ۳۰۴ھ ہجری میں میں نے تیمور (حالیہ چاول) کی سیاحت کی جو لار (گجرات) کا ایک جز ہے۔ یہاں کے حکمران کا لقب بلہرا (والبہ رائے) ہے جو راجہ اس وقت حکمران تھا اس کا نام چنچا تھا وہاں تقریباً دس ہزار مسلمان تھے جن میں بیاسرہ بھی شامل ہیں (اس کی تشریح ابھی نیچے آئے گی) چنانچہ وہاں سیراف، عمان، بصرہ، بغداد اور دیگر مقاموں کے لوگ رہتے تھے جنھوں نے وہاں شادیاں کرلی تھیں اور وہیں مستقل طور سے بس گئے تھے ان میں مال دار تاجر بھی تھے جیسا کہ موسیٰ بن اسحاق السندلونی جسے ہنرما کا عہدہ بھی حاصل تھا ..... ہنرما سے مراد مسلمانوں کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے جسے اس ملک کا راجہ معزز مسلمانوں میں سے چن کر مقرر کرتا ہے۔ یہ تمام مسلمانوں کا سردار ہوتا ہے اور راجہ اسے یہ اختیار تفویض کرتا ہے کہ ان کے جملہ معاملات کا انتظام کرے۔ بیاسرہ کی اصطلاح اصل میں لفظ بیسر کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو مسلمان والدین سے ہندوستان میں پیدا ہوتے ہیں (مسعودی کی مروج الذہب مطبوعہ یورپ جلد ۲ صفحہ ۸۵ تا ۸۶)۔

اسی مولف نے ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ پورے سندھ اور ہند میں بلہرا سے بڑھ کر کوئی اور راجہ نہیں ہے جو مسلمانوں کا احترام کرتا ہو۔ چنانچہ اس کے علاقے میں اسلام معزز و محترم ہے وہاں مسلمانوں کی چھوٹی مسجدیں بھی ہیں اور جامع مسجدیں بھی۔ یہاں کے راجہ چالیس چالیس اور پچاس پچاس

سال بلکہ اس سے زیادہ حکمرانی کرتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کا گمان ہے کہ ان کی اس درازی عمر کا باعث مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور مہربانی سے پیش آنا ہے (مسعودی کی مروج الذہب مطبوعہ یورپ جلد اصفحہ ۳۸۲)۔

(۵) بزرگ بن شہریار ایک پرانا مولف ہے جو چوتھی صدی ہجری کے وسط کا مانا جاتا ہے وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں چوری کی سزا عام طور پر موت سے دی جاتی ہے لیکن کوئی اگر مسلمان چوری کرتا ہے تو اس کا مقدمہ ہنرمن کے پاس پیش ہوتا ہے جو شریعی احکام کے مطابق مقدمے کی سماعت کرتا ہے جس طرح اسلامی ممالک میں قاضی ہوتا ہے اسی طرح یہاں ہنرمن ہوتا ہے اس کا انتخاب مسلمانوں ہی میں سے کیا جاتا ہے (عجائب الہند مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۱)۔

اسی مولف کا یہ بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک نو وارد مسلمان ملاح نے صیمور میں ایک مندر کی بے حرمتی کی تھی۔ پجاریوں نے اسے پکڑ لیا اور صیمور کے راجہ کے پاس لاکر پیش کیا اور واقعہ سنایا ملاح نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا راجہ نے اپنے لوگوں سے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے کسی نے کہا کہ اسے ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندا دیا جائے کسی نے کہا کہ کاٹ کر اس کے پرخچے اڑا دیے جائیں لیکن راجہ نے کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ ایک عرب ہے اور ہم میں اور عربوں میں معاہدہ ہے اس لئے اب تم میں سے ایک شخص العباس بن ماہان کے پاس جائے جو مسلمانوں کا ہنرمن ہے اور اس سے پوچھے کہ اگر وہ کسی مسلمان کو اسی طرح کا کام کرتے ہوئے مسجد میں پائے تو اسے کیا سزا دی جائے گی۔ وہ جو جواب دے وہ مجھ سے آکر بیان کرو (عجائب الہند صفحہ ۱۴۳)۔

(۶) ابن حوقل بھی بیان کرتا ہے کہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں اس طرح کا رواج ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ آج کل مسلم نوآبادی کا افسر ایک مسلمان ہی ہوتا ہے جو بلہرا کی طرف سے مامور ہوتا ہے اور راجہ اسے اپنے اختیارات تفویض کرتا ہے میں نے اسی طرح کا رواج متعدد ایسے ملکوں میں پایا ہے جو اب غیر مسلم قبضے میں ہیں۔ مثلاً خزر، سریر، لان، غانہ اور کوغا۔ ان تمام ملکوں میں مسلمانوں کی جماعت سوائے مسلمان کے کسی اور کو نہ تو اپنا سردار تسلیم کرتی ہے نہ اپنا حاکم عدالت اور نہ ہی اپنے مقدموں میں

گواہ ۔ چاہے مسلمانوں کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو یہی صورت حال پائی جاتی ہے۔ ان ملکوں میں سے بعض میں میں نے یہ دیکھا کہ کوئی مسلمان کسی معتبر غیر مسلم کو اپنے مقدمے میں بطور گواہ پیش کرتا ہے اگر فریق ثانی اس پر اعتراض نہ کرے تو اس کی گواہی لی جاتی ہے ورنہ پھر کسی مسلمان کو گواہی میں پیش کرنا ہوتا ہے (المسالک والممالک صفحہ ۲۲۷ تا ۲۲۸)۔

(۷) ملیبار کے تعلقات عربوں کے ساتھ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت ہی سے چلے آرہے ہیں۔ ملیبار میں مسلمانوں کی آمد عہد صحابہؓ ہی سے سمجھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ پارس کے رسالے (Revue des Etudes Islamiques بابتہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۰۴) میں کتبات کی مدد سے یہ بتایا گیا ہے کہ جنوبی ہند کے ساحلوں پر اسلام عہد صحابہؓ ہی میں پہنچ چکا ہے تب سے اب تک ملیبار میں بہت کم تبدیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ شہنشاہ اکبر کے ایک ہم عصر مولف زین الدین المعبری نے جو پرتگالی حملوں کے زمانہ کا ایک ممتاز مورخ ہے یہ لکھا ہے کہ اس پورے علاقے میں مسلمانوں پر کوئی مسلمان حاکم نہیں ہے بلکہ غیر مسلم راجہ ہی ان پر حکمرانی کرتے ہیں اور اگر وہ ناجائز افعال کا ارتکاب کریں تو ان پر جرمانے بھی عائد کئے جاتے ہیں لیکن بہر حال اس ملک میں مسلمانوں کو بڑی عزت واقتدار حاصل ہے کیونکہ اس علاقے کی مرفہ الحالی زیادہ تر انھیں کے دم سے ہے۔ مسلمان جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ مقامی راجہ ہی ان کے قاضیوں اور موذنوں کی تنخواہ ادا کرتے ہیں اور احکام شریعت کے مسلمانوں پر نفاذ میں مدد دیتے ہیں اور اس کی اجازت نہیں دیتے کہ جمعہ کی نماز ترک کردی جائے۔ چنانچہ نماز نہ پڑھنے والوں کو وہ اکثر شہروں میں جرمانے کی سزا دیتے ہیں (راقم الحروف نے ۱۹۳۹ء میں ایک مماثل چیز ریاست اوندہ میں دیکھی جو مغربی گھاٹ پر ایک مرہٹہ ہندو ریاست ہے۔ یہاں کا راجہ مسلمانوں کا صدر قاضی بھی ہوتا ہے اور جمعہ کی نماز نہ پڑھنے والوں پر وہ اب بھی جرمانہ کرتا ہے۔

کوچین وغیرہ میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق دیکھئے قادر حسین کا مضمون کرسچین کالج میگزین مدراس نومبر و ڈسمبر ۱۹۱۲ء نیز جنوری و فبروری ۱۹۱۳ء) میں اگر کوئی مسلمان کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس پر سزائے موت شرعاً دی جانی ضروری ہو تو مسلمان افسروں کی اجازت سے یہ لوگ اسے سزائے موت

دیتے ہیں۔ پھر اس کی لاش مسلمانوں کے سپرد کر دی جاتی ہے جو اسے نہلا کر تجہیز و تکفین کرتے اور نماز جنازہ پڑھاتے ہیں اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرتے ہیں۔ . . . مقررہ دس فی صد محصول کے علاوہ مسلمان تاجروں پر یہ کوئی اور محصول عائد نہیں کرتے۔ البتہ اگر یہ افعال ناجائز کا ارتکاب کریں تو ان پر ان کے قوانین کے مطابق جرمانہ کیا جاتا ہے۔ کسانوں اور باغبانوں پر بالکل کوئی محصول نہیں ہے چاہے ان کے قبضے میں کتنی ہی بڑی جائداد کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ مسلمانوں کے گھروں میں ان کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہوتے چاہے کسی قاتل کو گرفتار کرنے کے لئے ہی کیوں نہ ہو بلکہ وہ صرف مکان کا محاصرہ کر لیتے ہیں اور چوکسی اور بھوک پیاس کے ذریعہ سے اس کو مجبور کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو سپرد کر دے۔ اسلام قبول کرنے کے راستے میں بھی یہ لوگ کوئی روڑے نہیں اٹکاتے بلکہ اس کے برخلاف نومسلموں کے ساتھ ان کا وہی برتاؤ ہوتا ہے جو موروثی مسلمانوں کے ساتھ چاہے یہ نومسلم کتنی ہی نیچ ذات کے کیوں نہ رہے ہوں۔ پرانے زمانے میں مسلمان تاجر آپس میں چندہ کر کے ایسے نومسلموں کی مدد کر دیا کرتے تھے (تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتگالیین مطبوعہ لزبن صفحہ ۳۵ تا ۳۶)۔

(۸) چین کے متعلق مذکورہ بالا مولف مسعودی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خانفو کے ایک چینی افسر نے ایک مسلمان تاجر پر کچھ سختی کی وہ چین کے بادشاہ کے انصاف پر بھروسہ کرتے ہوئے فوراً پایہ تخت پہنچا اور مظلوموں کا معینہ لباس یعنی سرخ کپڑے پہن کر دربار میں حاضر ہوا جب اسے باریابی ہوئی تو اس نے اپنا واقعہ بیان کیا بادشاہ نے اپنے طور پر تحقیقات کرائی اور خفیہ پولیس کے مختلف افسروں سے جب اس کی توثیق ہو گئی تو خانفو کے افسر کو سزا دی۔ پھر اس مسلمان تاجر کو شاہانہ انعام و اکرام سے نواز کر یہ کہا کہ اگر تم چاہو تو ہم تمھارا پورا سامان اچھے بھاؤ پر لے لیں ورنہ تمھیں اپنے مال کے متعلق پوری آزادی ہے اب تم چاہو تو ٹھیرو جیسا چاہو بیچو اور امن و اطمینان کے ساتھ جہاں چاہو جاؤ (مروج الذہب مطبوعہ یورپ جلد اصفحہ ۳۰۷ تا ۳۱۲)۔

(۹) ایک اس سے بھی قدیم یعنی تیسری صدی ہجری کے مولف نے مزید وضاحت سے لکھا ہے کہ سلیمان تاجر نے بیان کیا ہے کہ خانفو کا شہر تاجروں کا ایک بڑا مرکز ہے وہاں ایک مسلمان کا تقرر مقامی حکومت کی طرف سے اس غرض کے لئے عمل میں آتا ہے کہ وہاں آنے والے مسلمانوں میں آپس میں اگر کچھ نزاعات پیدا ہوں تو ان کا وہ تصفیہ کیا کرے چین کے بادشاہ کی خواہش یہی ہے کہ عید کے موقع پر مسلمانوں کا یہ حاکم نماز کی امامت کرتا ہے اور خطبہ میں سلطان المسلمین یعنی خلیفہ کے لئے دعا بھی کرتا ہے۔ عراق کے تاجر اس کے حکم سے کوئی سرتابی نہیں کرتے۔ وہ قرآن اور شریعت کے مطابق ہی انصاف کے ساتھ فیصلے کرتا ہے (سلسلۃ التواریخ یعنی سفرنامہ سلیمان تاجر مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۳ تا ۱۴)۔

(۱۰) بحر خزر (بحر کیاسپین) کے آس پاس رہنے والی قوموں کے متعلق مسعودی نے لکھا ہے کہ علاقہ خزر میں مسلمان سب سے ممتاز لوگ ہیں کیونکہ انھیں پر وہاں کے بادشاہ کی فوج مشتمل ہے یہ لوگ وہاں لرشیہ کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ خوارزم سے ترک وطن کرکے یہاں آبسے ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ بہت عرصہ پہلے ان لوگوں کے قبول اسلام کرلینے کے بعد ان کے ملک میں ایک قحط پڑا تو یہ لوگ خزر چلے آئے۔ یہ بڑے اچھے سپاہی ہیں اور خزر کے بادشاہ کو ان کی بہادری پر بڑا اعتماد ہے۔ یہ لوگ اس شرط پر وہاں رہتے ہیں کہ ایک تو انھیں اپنی عبادت کھلم کھلا کرنے کی اجازت ہوگی۔ وہ مسجدیں بنا سکیں گے اور اذان دے سکیں گے۔ دوسرے یہ کہ وزیر انھیں میں سے چنا جائے گا .... تیسرے یہ کہ اگر خزر کے بادشاہ کو کسی اسلامی سلطنت سے لڑائی پیش آئے تو ان لوگوں کو جنگ پر نہ بھیجا جائے گا۔ وہ کسی بھی دوسری قوم سے لڑنے کے لئے تیار رہیں گے۔ بادشاہ کا محافظ دستہ بھی انھیں لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے .... یہاں مسلمان قاضی ہیں۔ علاقہ خزر کے پایہ تخت میں رواج یہ ہے کہ وہاں سات حکام عدالت پائے جاتے ہیں۔ دو مسلمان دو خزری دو عیسائی ایک صقالبہ روسیوں میں سے اور ایک دیگر غیر مسلم جاہل قوموں میں سے .... چنانچہ اگر کوئی مشکل مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو

یہ سب اسے مسلمان حکام عدالت سے رجوع کرتے ہیں اور اس بارے میں جو بھی شرعی حکم ہو وہ اسے مان لیتے ہیں ..... ان کی مسجدوں میں بچوں کے لئے تدریس قرآن کے مدرسے بھی ہیں (مروج الذہب طبع یورپ جلد ۲ صفحہ ۱۰ تا ۱۲)۔

چند عام احکام

بہرحال جو مسلمان عارضی طور سے بیرونی ممالک میں جا رہیں ان کے اسلامی فقہ اور اخلاق کی کتابوں میں پر زور تاکید ہے کہ وہ پابند قانون رہیں اور ایسی زندگی بسر کریں جو قابل نمونہ سمجھی جائے۔ نیز وہ اپنے اجازت نامہ سفر کی جملہ شرطوں کا پورا پورا لحاظ رکھیں حتیٰ کہ اگر اسلامی حکومت اور اس حکومت میں جس کے علاقے میں یہ لوگ ہوں جنگ چھڑ جائے تو ان مسلمانوں کو اپنے دوران قیام میں ہر طرح کے مخاصمانہ اعمال اور غداری سے بچے رہنا چاہئے (مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صفحہ ۹۸)۔ انھیں اپنے اجازت نامہ سفر کی جملہ شرطوں کی تعمیل کرنی چاہئے ہاں غداری اور بدعہدی نہ ہوتی ہو تو پھر وہ اگر ممکن ہو تو اپنے ہم وطنوں پر کئے جانے والے ظلم کو دور کر سکتے ہیں (مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صفحہ ۹۸)۔ ایک معاملہ میں اسلامی قانون بہت شدت سے حکم دیتا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی مسلمان بیرونی ممالک میں ہوں اور اسلامی مملکت کی رعایا میں سے عورتیں اور بچے (خواہ مسلمانوں کے ہوں یا ذمیوں یعنی غیر مسلم رعایا کے یا باغیوں کے) گرفتار کرکے وہاں لائے جائیں تو ان مسافر مسلمانوں کو اختیار ہے کہ وہ چاہیں تو اجازت نامہ سفر کے تحت حاصل شدہ حفاظت سے دست برداری دے لیں اور اس کی اطلاع مقامی حکومت کو دینے کے بعد لڑیں اور اپنی ہم وطن عورتوں اور بچوں کو رہائی دلائیں (مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صفحہ ۹۸)۔ عورتوں اور بچوں کے متعلق اس غیر معمولی اہمیت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں غلامی کا عام رواج تھا اور بڑی عمر والے مرد سپاہیوں کے مقابلے میں ان کا ہمیشہ کے لئے گم ہو جانا آسان تھا۔ لیکن یاد رہے کہ اس میں دو امور وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں، ایک تو اپنی حاصل شدہ حفاظت سے دست بردار ہونے کی پیشگی اطلاع

مقامی حکومت کو دینے اور دوسرے ان عورتوں اور بچوں میں یہ قید نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہی ہوں بلکہ اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے بھی یہی فریضہ عائد کیا گیا ہے ۔

جو مسلمان بیرون ملک میں ہوں انھیں اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہاں کی مقامی حکومت کی فوج میں بھرتی ہوں ، صرف یہ اجازت ہے کہ اگر کوئی ایسا دشمن اس مقام پر حملہ آور ہو جس کے متعلق خطرہ ہو کہ وہ ان کی ناطرفداری کی پروا نہیں کرے گا تو پھر اپنی مدافعت کی خاطر ان کو بھی اس جنگ میں ہاتھ بٹانا چاہیئے (مبسوط سرخسی جلد ۔ اصفحہ ۹۷تا ۹۸) اس مدافعت کے سلسلہ میں فقہانے یہ لکھا ہے کہ وہ حملہ آور دشمن چاہے غیر مسلم ہو یا ایسی مسلمان حکومت جو اسلامی مملکت کی باغی ہو ہر حال میں حکم ایک ہی ہوگا (محمد شیبانی کی کتاب الاصل بر موقع) ۔

عہد نبوی میں بھی اس طرح کی ایک نظیر ملتی ہے کہ مہاجرین حبشہ کو ایک مرتبہ یہ موقع پیش آیا تھا کہ حبشہ پر نجاشی کے ایک دشمن نے حملہ کردیا تھا مسلمان مہاجرین دعائیں کرتے رہے کہ نجاشی کو فتح ہو جو غیر مسلم تھا اور وہ اس کے لئے بھی تیار تھے کہ ضرورت پڑے تو اس کی فوج میں شریک رہ کر جنگ کریں لیکن نجاشی کی فتح کے باعث اس کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔

یہ مختصر تذکرہ ہے جو اس موضوع کے متعلق پیش کیا جارہا ہے ۔ توقع ہے کہ ارباب علم کے اشتراک عمل سے اس میں آئندہ مزید اضافہ ہو سکے گا ۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایم اے ایل ایل بی (عثمانیہ)
ڈی لٹ (پیرس) ڈی فل (بون)

مرہٹی ادب بیسویں صدی میں

شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور سے کسی نے پوچھا "اے شاعر زندگی کی شام قریب ہے تمہارے بال سفید ہو رہے ہیں۔ کیا تمھیں تنہائی میں اس کے بعد کے عالم کا کوئی پیغام سنائی دیتا ہے"؟ شاعر نے جواب دیا۔ شام کا وقت ہے اور میں کان لگائے بیٹھا ہوں کیونکہ دیر سے ہی سہی شائد کوئی گاؤں سے پکار بیٹھے بھٹکتے ہوئے نوجوانوں کے دلوں کے ملن کا میں منتظر ہوں۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ دو نگاہیں چاہتی ہیں کہ سنگیت سے ان کی خاموشی توڑ دی جائے اور ان کے لئے کچھ کہا جائے اگر میں زندگی کے کنارے بیٹھ کر موت اور عاقبت کی فکر میں لگ جاؤں تو ان کے جذبات کو گیتوں میں کون گوندھے گا"؟۔ آج ہندوستان کے ادب میں یہی آواز گونج رہی ہے۔ مرہٹی ادب میں ہم کو اس قسم کی آواز سب سے پہلے سترھویں صدی میں سنائی دیتی ہے۔ جب سوامی رآمداس نے عوام کو جھنجھوڑ کر خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ ان کو اپنی صلاحیتوں سے کام لینا سکھلایا اس نے اپنی پوری عمر اسی کام میں صرف کردی۔ ملک کی ابتر حالت کا داس بودھ میں اس طرح نقشہ کھینچتا ہے "چونکہ جوہرِ حیات بالکل مفقود ہوگیا ہے اور ملک اجڑ گیا ہے اس لئے بہت سے خاندانوں کو آنے والے مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ لوگوں کے پیٹ کو روٹی نہیں۔ تن کو کپڑا نہیں۔ اور مکان بنانے کے لئے مسالہ نہیں یہ اپنے آپ کو کیونکر سنبھالیں گے ہر چیز ہمت شکن اور نفرت انگیز بنی ہوئی ہے۔ امید کی کہیں سے کوئی جھلک ہی نظر نہیں آتی۔ مصائب کا ایک سیلاب ہے سب کو بہائے لے جارہا ہے۔ کوئی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی سبب سے تکلیف نہ اٹھا رہا ہو۔ میں ایک متنفس کو بھی بشاش نہیں پاتا۔ اور بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ کوئی ایک دوسرے کی پروا بھی نہیں کرتا"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں قومی احساس پیدا ہوگیا اور

تھوڑے سے ہی دنوں میں مرہٹے سارے ہندوستان پر چھا گئے لیکن ان کی شومئ قسمت کہ تھوڑے عرصہ میں ان کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس مدوجزر میں ادب کی کشتی بھی ہچکولے کھاتی رہی۔ حتیٰ کہ جب انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو وہ کنارے آ لگی تھی۔ لیکن زندگی کا وہ دھارا جو رک سا گیا تھا پھر سے بہنے لگا اور یہ کشتی پھر چلنے لگی لیکن اب اس نے اپنے ساتھ بہت سی چیزیں انگریزی دنیا سے لائی تھی اور وہ پھر ان ساز و سامان کو لے کر زور سے بہنے لگی۔ انگریزی اثر جب بڑھتا گیا تو ادیبوں نے بھی اس جانب توجہ کی اس کے تراجم ہونے لگے۔ ہری کیشو جی نے ۱۸۴۱ء میں Pilgrims Progress اور سرو لیمے نے Gulliver's Travel Robinson Crusoe کا ترجمہ کیا۔ جب اس کی مقبولیت بڑھنے لگی تو بنگالی ناولوں کے ترجمے بھی شروع ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اپنی ناولوں کی داغ بیل ڈالی گئی۔ بابا پدم جی پہلا شخص تھا جس نے اپنی ناول لکھا۔ اس کے بعد ہی ۱۸۶۱ء میں چپ لون کرنے افسانوں کا ایک مجموعہ چتکارک گوشٹی شائع کیا۔ لکشمن شاستری نے مکتا مالے' ایک اخلاقی ناول لکھا۔

ادیبوں کی توجہ اب ان کی اپنی زندگی پر پڑی' سماج کو انہوں نے دیکھا جہاں ایک اضطراب دکھائی دیا۔ بیواؤں کی چیخ پکار انہیں سنائی دی۔ اچھوتوں پر جو مظالم ڈھائے گئے وہ انھیں نظر آئے۔ ہر طرف حکمراں دکھائی دیئے۔ ان سب کی جھلکیاں ہم کو ہری نارائن آپٹے آنجہانی کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنے اخبار کرمنک سے مرہٹی ادب میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اس میں ان کے افسانے اور ناول شائع ہوتے تھے۔ ان کا مشہور سماجی ناول "می" اسی میں شائع ہوا تھا۔ ہری نارائن آپٹے ایک درجہ کے ناول نگار تھے۔ ان کا درجہ مرہٹی میں وہی ہے جو بنگالی میں چندر چٹرجی کا۔ انھوں نے آنے والی نسلوں کے لئے افسانہ کی راہ بھی سجھا دی۔ ان کے بعد ہی وٹھل سیتا رام گرجرا اور کاشی ناتھ رگھو متر اس میدان میں آ گئے۔ مرہٹی شاعری بھی اس زمانہ کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی چنانچہ ایک شاعر دت نے جو ۱۸۹۹ء کے قبل ہی اس دنیا سے چل بسا تھا ایک لوری لکھی تھی جس میں شاعر ایک غریب گھر کا

بیان کرتا ہے۔ ماں بچہ سے کہتی ہے۔"سو جا بیٹے، سورج آسمان سے وداع ہو گیا ہے جیسے کہ بدنصیبوں سے دولت رخصت ہو جاتی ہے۔ اندھیرا آنگن میں چھا گیا ہے، یہ دنیا ایسی سوئی ہے جیسی کہ میری آرزو ہی ہو، گھر بھر میں چوہے ادھر سے اُدھر اناج کے دانے تلاش کرنے کے لئے گھومتے ہیں۔ مگر وہ بھی جلد ہی اس گھر کو چھوڑ دیں گے جس طرح کہ اپنے ناتے رشتہ والوں نے ہمیں چھوڑ دیا ہے۔ پرانی بانس کی گوبر سے لیپی ہوئی دیواریں ہیں اور وہ گھر کی مفلسی سب کو دکھا رہا ہے۔ دروازہ کھلتے اور بند ہوتے وقت 'کرر' بولتا ہے گویا وہ بھی اپنی غریبی کا شکوہ کر رہا ہو۔ دروازوں کی درازوں میں سے تیز ہوا آرہی ہے جو میری لوری سے سُر ملا رہی ہے، سو جا میرے بیٹے سو جا۔"

کیشو سوت مرہٹی شاعری میں آزادی کا پہلا علم بردار تھا۔ اُس نے مرہٹی میں Sonnets کو رواج دیا۔ اس نے نہایت خوبی سے روزمرہ زندگی کے واقعات اور اس کی خرابیوں کو اجاگر کیا ہے رسم و رواج کے متعلق کہتا ہے۔"رسم و رواج جہالت سے اپنی غذا حاصل کرکے اور زیادہ نفرت انگیز بن جاتا ہے۔ شاہ راہِ فطرت سے منحرف ہو جاتا ہے اور جھوٹ کے تخت پر متمکن ہوتا ہے لیکن تعجب ہے کہ اس کے بعد بھی لوگ اس کے غلام بن جاتے ہیں۔ گو یہ شیطانی چیزیں ہیں مگر ان کی دیویوں سے زیادہ تعظیم کیجاتی ہے۔"
بیسویں صدی کے قبل ہی سے مرہٹی ادب کو بھنڈارکر اور راناڈے جیسی شخصیتیں اس کی خدمت کیلئے ملی تھیں اس کے آغاز سے تلک اور گوکھلے نے اپنا قلم سنبھالا۔ تلک نے 'مراٹھا' نامی اخبار جاری کرکے عوام میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی، پروفیسر پرانجپے نے کہانیوں کے ذریعہ سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی آگرکر سماج کی الجھنوں میں لگ گئے۔ کیتکر نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

انگریزی ادب کا ریلا تیزی سے مرہٹی ادب میں آرہا تھا۔ ورڈسورتھ۔ شیلی۔ بائرن۔ شکسپیر وغیرہ کی مختلف نظموں کے ترجمے دھڑا دھڑ ہو رہے تھے۔ اسٹیج پر بھی ایک پردہ اٹھا۔ جب نرسہوں چنتامن کیتکر نے Othelo اور پرنسپل آگرکر نے Hamlet کا ترجمہ کیا۔ اب اسٹیج پر کرلوسکر، کولھٹکر

کھاڈیلکر اور گڈکری جیسے حضرات دکھائی دینے لگے۔ جنہوں نے پُرانی کتھاؤں کو ڈرامائی صورت دی تھی اور ساتھ ساتھ اچھے اچھے ڈرامے بھی لکھے تھے۔

پچھلی جنگِ عظیم سے دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ سلطنتوں کے نظام بدل گئے۔ دنیا کے خیالات بدل گئے۔ ہندوستان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ زندگی کا بہاؤ کچھ رُک سا گیا ہے۔ لیکن دنیا پھر تیزی سے دوڑنے لگی۔ اس دوڑتی دنیا کے پاس وقت کم تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مرہٹی ادب میں انگریزی ادب کا دھارا زور سے بہنے لگا۔ اس میں نیا جوش تھا۔ نئی امنگ تھی۔ اس سے ادیبوں کے دل کے کواڑ کھلے اور ان کی توجہ انسان کے دکھ سکھ کی جانب مبذول ہوئی۔ سیاسی تحریکات کا زور شور بڑھتا گیا جب اس سیلاب کی موجیں گاؤں تک پہنچیں تو کسانوں نے بھی کروٹ بدلی۔ مزدور خواب غفلت سے چونک اُٹھے تعلیم کی اشاعت روز بروز بڑھنے لگی۔ عورتوں میں علم کی اشاعت تیزی سے ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب متوسط طبقہ کے ہاتھوں میں کھیلنے لگا اس نے جب چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ ایک طرف محل کی غراتی آنکھیں ہیں تو دوسری طرف جھونپڑی کی سسکیاں۔ محل نے کہا۔ ادھر آؤ ہم یہاں سے آرٹ، حسن، نزاکت دکھاتے ہیں۔ جھونپڑی نے پکارا، میری زندگی کو دیکھو۔ یہاں تمہیں مفلسی، جہالت اور توہم پرستی کا راج دکھائی دے گا" کسی نے محل میں پناہ لی اور کوئی جھونپڑی کی آواز کے پیچھے بھاگ کھڑا۔ کوئی تعلیم کی اشاعت میں لگ گیا۔ چنانچہ پروفیسر ڈھونڈو پنت کرئے ہیں عورتوں کی تعلیم کے لئے جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں جو آج کروے یونیورسٹی کے روپ میں ہے۔ اور تلک اور گوکھلے سیاست کے میدان میں تیزی سے دوڑتے ہیں۔ آگرکر۔ کولھٹکر سماج سدھار میں لگ جاتے ہیں۔

جب یورپ میں اشتراکیت نے زور پکڑا تو ہندوستان کی نظریں بھی اس پر پڑیں۔ وہ زندگی کے ایسے ہی لائحہ عمل کا متلاشی تھا۔ آزادی کا نعرہ بلند ہوا۔ کسان اور مزدور میدان میں آگئے۔ عورتیں بھی مردوں کا جا

اتار پھینکنے کے لئے آگے بڑھیں، ہمارے ادیب نے جب ٹالسٹائی، گورکی، ٹراگیف کو دیکھا تو اس میں اپنا ہی دل دھڑکتا ہوا پایا وہ ادھر بھاگ کھڑے ہوئے، بہتوں نے تو فیشن کے طور پر بھی اس کی تقلید کی۔ موپساں اور ہارڈی بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہ سکے۔ ادب میں نئی نئی صنفوں کا رواج ہوا۔ Essays لکھے جانے لگے Sketches کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے جانے لگے۔ شاعری کی ٹیکنک بدل گئی۔ لیکن مرہٹی ادیب کو ان سب سے زیادہ کتھا سندری، پسند آئی نارائن سیتارام راؤ پھڑکے نے جوش شباب میں پریم کی مُرلی بجائی اور اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ اس کی چرنوں میں لولا اور دیگر افسانے وتسلا دیگر افسانے پروفیسر پھڑکے کے افسانے کی بھینٹ چڑھائی کھانڈیکر نے اسے خوب سجایا۔ لطیف تشبیہات و استعارات کے زیورات پہنائے۔ شاعرانہ خیالات کی اوڑھنی اوڑھائی۔ اپنے جذبات اس کے سامنے کھول کر رکھ دیئے۔ انسان کی چیر پھاڑ کر کے اس کی حقیقت اُسے دکھائی، اُسے جھونپڑیوں کی سیر کرائی جس سے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اس سے کہا۔ دیوی! لو میں تمھارے لئے۔ پوجن، گھر کے باہر، جیون کلا۔ پھول اور پتھر دھوپ اور بارش، دنک و دیگر کہانیاں وغیرہ تحفۃً لایا ہوں۔ ایشونت گوپال جوشی نے کہا ادھر بھی ایک نظر۔ ذرا سماج کو تو دیکھو، اسی میں کتنی خرابیاں ہوگئی ہیں یہ ہماری زندگی میں گھن کی طرح ہیں۔ سامنت نے اپنے دل کو کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ بوکل نے اسے گدگدی کی اور چٹکی بھی لی۔ چنتامن ونائک جوشی نے اسے ہنسانے کی کوشش کی۔ لکشمن سروتیسائی اس کے لئے "سمندر کی موجیں" "جیون دھارا" وغیرہ لائے کوشے کرنے سماج کا ڈکھڑ سُنایا۔ چورگھڑے نے گاؤں کی سیر کرائی۔ کانیکر نے اُسے کھری کھری سنائی اترے نے تو اسے بہت ہنسایا اور بالآخر اس کے سامنے "برانڈی کی بوتل" ہی رکھ دی۔

اس سندری کو سہیلیوں کی بھی تو ضرورت تھی، جن سے وہ اپنے دل کی بات کہتی۔ ان سے ہنستی چھیڑ چھاڑ کرتی۔ شریمتی شرواکر نے اس کے گھر جا کر کہلا ری دیکھ تو ہم کتنی مصیبت میں ہیں۔ ہماری

عمر کے ساتھ ساتھ ہماری تکلیفیں بھی بڑھتی جاتی ہیں اور ان مردوں کو اس کی کچھ بھی پروا نہیں"۔ آنندی بائی شرکے نے اپنا دکھڑا سنایا۔ کملا بائی تلک اور کسماوتی دیسپانڈے نے اپنے قلم کے بل پر کہا "عورتیں بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ انھیں مردوں کی رہنمائی کی ضرورت نہیں وہ اپنا راستہ آپ تلاش کر سکتی ہیں"۔ کشمابائی سے اس کی خوب نوک جھونک ہوئی۔ کرشنا بائی جیسی سنجیدہ عورت بھی اس کے ساتھ ہو لی۔

اس کے بعد ادیب زیادہ تر دنیائے ناول کی سیر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور پھڑکے اور کھانڈیکر ہی ہیں۔ پھڑکے ادب برائے ادب کے قائل ہیں اور کھانڈیکر ادب برائے زندگی کے حامل لیکن تعجب تو یہ ہے کہ کبھی پھڑکے ادب برائے زندگی کے حامل نظر آتے ہیں تو کبھی کھانڈیکر ادب برائے ادب کے قائل۔ چنانچہ پھڑکے کی "سمر بھومی" یا "دولت" کو لیجئے اول الذکر میں "وہ محبت اور فرض" کی جنگ اور دوسری میں دولت اور محبت کی کشمکش کو دل ہلا دینے والے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف کھانڈیکر کے "ہرا چنپا" "دو دل" "پہلی محبت" کو پڑھ ڈالئے اس میں جذبات کے فوارے چھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ دونوں متوسط طبقہ کے ادیب ہیں اور زندگی کے ترجمان ہیں لیکن دونوں کے زاویۂ نگاہ میں بہت بڑا فرق ہے۔ پھڑکے Hedonist ہے اور کھانڈیکر Humanitarian پھڑکے، جادوگر، آشا، مسافر، انماد وغیرہ جیسی اعلیٰ درجہ کے ناولوں کو لے کر محبت کی وادیوں میں بھٹکتے پھرتا ہے۔ اور کھانڈیکر "الکا" "سفید بادل" "تلاش مسرت" اور "کرونچ بدھ" وغیرہ کو لے کر انسانی زندگی کے مصائب کو حل کرنے کی فکر کرتا ہے۔ پھڑکے عموماً ہر چیز کو سطحی نظر سے دیکھنے کا عادی ہے۔ مگر کھانڈیکر ہر چیز خصوصاً انسان اور اس کی فطرت کا بہت گہرا اور غائر مطالعہ کرتا ہے۔ وہ مجاز کے پردے ہٹا کر حقیقت آپ کے سامنے جلوہ گر کرتا ہے۔ ایک جگہ وہ انسانی اصلاح اور سدھار کے متعلق لکھتا ہے "آپ کو اس کا علم نہیں کہ نیم کا درخت جب پرانا ہو جاتا ہے تو اس میں صندل کی سی خوشبو آنے لگتی ہے جسے ہم اصلاح کہتے ہیں وہ ایسی ہی خوشبو ہے"۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے "یہ اصلاح درحقیقت ابھی ہمارے خون میں سرایت نہیں کی ہے

یہ اُن پھولوں کی طرح ہے جو خود بیل کے نہیں ہیں بلکہ اُس پر چپکائے گئے ہیں جو ہوا کے ایک معمولی سے جھونکے سے گر پڑتے ہیں۔"

اس کے بعد ہم وامن ملہار جوشی کو دیکھتے ہیں۔ جو اپنی اندو بھولی اور سرلا کالی، راگنی۔ اور "سوشیلا کا دیو" لے کر سنجیدگی سے کھڑے ہیں انھیں ہماری اس حالت پر افسوس ہوتا ہے۔ غلامی کی زنجیروں کو پیروں میں پڑی دیکھ کر ان کا دل تلملا اٹھتا ہے۔ اخلاقی خرابیوں کو دیکھ کر وہ دل مسوس کر رہ جاتے ہیں، سوچتے ہیں کہ اس کا حل کیا ہو۔ وہ ایک مفکر ناول نگار ہیں۔ جنہیں ماڈکھولکر کے الفاظ میں Family Philosopher کہنا مناسب ہوگا۔ ڈاکٹر کیتکر رقت تخیل اور جذباتی دنیا میں غوطے لگاتے ہیں، سماج کو غور سے دیکھتے ہیں۔

گجانن ترمبک ماڈکھولکر کا نا، ملتا تما، مکھوٹے لے کر ترقی پسندی کی راہ پر گامزن دکھائی دیتے ہیں۔ عورتوں کی آزادی کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ بھارگو وٹھل ماما وریرکر۔ وہ دھواکمار لہریں مارتا ہوا ساگر اور " نہ پوجا ہوا دیوتا" لے کر ہماری زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی فکر کرتے ہیں۔ ان کی صف میں ہمیں سانے گروجی اور دیشپانڈے دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور میں البتہ شاعری کی طرف کم توجہ برتی گئی۔ اس میں گڈکری نے مُرلی بجائی اور بالکوی تو ورڈسورتھ کی طرح پودوں کے ساتھ لہرانے لگے اور پھول، تارے اور جھرنوں میں گانا ڈھونڈھنے لگے۔ تانبے نے کہا " زندگی صرف مایوسی کا نام نہیں اور نہ صرف امید کا نام ہے وہ تو آنسوؤں کا پھول ہے"۔ اُس نے کہا کہ دُکھ سکھ انسان کے پیدا کردہ ہیں۔ قوم کو جگانے کے لئے کہتا ہے" موت سے ہی حقیقی زندگی ملتی ہے۔ پہلے موت، پھر حیاتِ ابدی، پہلے موت سہہ لو، آزادی کی امید رکھو۔ پھر موت ہمیشہ کی نیند سو جائے گی اور اس سے امر جیون کی پیدائش ہوگی۔ سب لٹا دو تو سب گھر بیٹھے ہی چلا آئے گا۔ سب کچھ قربان کردو تو سب بندھن ڈھیلے پڑجائیں گے۔" چندر شیکر نے دیہاتی زندگی پر نہایت عمدہ اور جذبات سے بھری نظمیں لکھی ہیں۔ مادھو جیولین نے "سدھارک"

نقلی لیڈروں اور سماجی ٹھیکہ داروں کی بڑی عمدگی سے تصویر کھینچی ہے۔ اُس نے عمر خیام کی رباعیات کا بھی مرہٹی میں ترجمہ کیا۔ ایشونت اس دور کا مرہٹی کا سب سے زیادہ مشہور شاعر ہے وہ بڑودہ کا درباری شاعر ہے پہلے وہ رومانی دنیا کی سیر کرتا تھا لیکن آج کل کسانوں اور مزدوروں کے گیت گاتا ہے سوتوں کو بیدار کرنے کی اس طرح کوشش کرتا ہے " ہلانے ڈلانے سے کیا کوئی بیدار ہوگا؟ صرف دھکا دینے سے کیا ترقی ہوگی؟ اٹھنے کو کہنے سے کیا کوئی کھڑا رہے گا؟ کتھا اور پُرانوں سے کیا عوام میں بیداری پیدا ہوگی؟ اگر تم ملک اور قوم کی حقیقت میں بھلائی چاہتے ہو تو یہ بک بک چھوڑ دو۔ اُن کیچڑ سے بھرے ہاتھوں میں ہاتھ ملا کر بیٹھو۔ یہ بھی تو ہم ہی جیسے ہمارے ہی طرح خون اور گوشت کے بنے ہیں"۔ ان کی 'کاویہ کیریٹ' مرہٹی ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ آر آر دیشپانڈے چراغ لے کر پیتم کی تلاش کرتے ہیں۔

اننت کانیکر اور بہیرے نے بھی قومی نظمیں لکھیں۔ پواڑے نے Ballads کثرت سے لکھے گئے۔ لیکن ان میں قومی سے زیادہ مہاراشٹری رنگ پایا جاتا ہے۔ اترے نے لوگوں کو خوب ہنسایا۔ لیکن کمال تو یہ کیا کہ کہیں بھی سوقیانہ پن آنے نہیں دیا۔ سانے گروجی اور بیرسٹر ساورکر نے بیداری پیدا کرنے کے لئے انتھک کوششیں کیں سانے گروجی نے کہا "ہم خدا کے مزدور ہیں، ہم وطن کے مزدور ہیں ہم محنت شاقہ کریں گے۔ اپنے کھیت میں کثرت سے پھل، پھول پیدا کریں گے اور افلاس کو دور کریں گے، ہمدردی کی کھیتی میں ہمدردی اور محبت کی کیاریاں بنا کر مساوات اور آزادی کے تخم بوئیں گے"

اس کے علاوہ گرریس۔ کاویہ دہاروی اور دوسرے حضرات بھی اپنے ساتھ اپنی اپنی چیزیں لائے۔ ڈراموں میں سنگیت ناٹکوں کا رواج کم ہو گیا۔ کھاڈیلکر۔ گڈکری۔ کرلوسکر۔ دیوال کی جگہ دوسرے حضرات نے لی۔ پوران کی کتھاؤں کو تمثیلی شکل دینا چھوڑ دیا گیا۔ تاریخی ڈراموں کی جانب بھی کم توجہ برتی گئی۔ قومی اور سماجی ڈراموں کا رواج بڑھتا گیا۔ چنانچہ ورٹکر نے کھادی کی ٹوپی، ہندو مسلم اتفاق اور چھوت چھات پر

ڈرامے لکھے۔ دوسرے تمثیل نگاروں میں دو نام ہی بہت مشہور ہیں۔ایک اترے دوسرے وربرکر۔ اترے اتنا ہنساتے ہیں کہ ہنستے ہنستے دم نکل جاتا ہے۔لیکن اس ہنسی اور مذاق میں بھی کچھ نہ کچھ نصیحت یا پیغام دے جاتے ہیں۔ اترے ہر چیز کو Universal Experience کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ جو بعض لوگوں کی نگاہ میں کھٹکتی ہے۔ شادی کی بیڑی، بھرم کا کدو، ساشٹنگ نسکار۔ ان کے اچھے ڈرامے سمجھے جاتے ہیں۔

وربرکر نے تقریباً اٹھارہ ناٹک لکھے ہیں۔ جن میں کنج بہاری اور ایک تاریخی ڈرامہ دل چاہے سو کرے گا، بہت مشہور ہیں۔ سماجی ناٹکوں میں، سونے کا کلس اور حکومت کے غلام بہت مشہور ہیں۔ ان کے ڈراموں میں رنگینی بہت کم ہوتی ہے۔ برنارڈشاہ پر تنقید کرتے ہوئے کلیٹن ہیا لمٹن نے کہا ہے کہ Eine writing does not make dramatic literature لیکن اسی کے باعث وہ مہاراشٹرا میں اتنے مقبول نہیں ہیں جتنا کہ انہیں ہونا چاہیئے تھا۔ ایک ایکٹ کے ڈراموں کا رواج اب بڑھتا جا رہا ہے۔ کانیکر۔ بھاگوت وغیرہ نے چند اچھے ڈرامے لکھے ہیں۔اس کے بعد ہم Essays کی جانب آتے ہیں۔ان میں تین نام قابل ذکر ہیں۔ پھڑکے، کھانڈیکر، کانیکر، پھڑکے کی سرگوشیاں" دیکھ ڈالئے ان کی نظر زیادہ تر سطحی ہی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے کھانڈیکر کی شام چاندنی میں، ہوا کے جھونکے پر ایک نگاہ دوڑائیے وہ یہاں بھی انسان کے دل کی گہرائیوں میں جاتے ہیں اور من کے چور کو پکڑ لاتے ہیں۔ کانیکر کے ٹوٹے ہوئے تارے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھری کھری ہی سنانے کے عادی ہیں۔

مرہٹی ادب ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ کیتکر نے اسی صدی میں مرہٹی انسائیکلو پیڈیا ترتیب دیا۔ سردیسائی جیسا مورخ اسی زبان کی خدمت کر رہا ہے۔ اور جاوڈے کر جیسا ادیب بھی اسی زبان میں موجود ہے۔ افسانہ نگاری و ناول نگاری میں وہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان سے پیچھے نہیں۔ افسانہ نگاری کے میدان میں صرف کھانڈیکر کا نام لینا ہی کافی ہوگا جس نے اب تک ڈھائی سو (۲۵۰) سے

زیادہ افسانے اور بارہ ناول لکھے۔ مرہٹی میں اس کا وہی درجہ ہے جو بنگالی میں سرت چندر چیٹرجی۔ یا ہندی میں منشی پریم چند مرحوم کا' ناول نگاری میں پھڑکے کا نام ہی کافی ہوگا۔ جس کے اب تک ۱۶' ۱۷۔ ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ مزاحیہ نگاری میں اترے جیسا بلند پایہ ادیب موجود ہے جس نے افسانوں ڈراموں اور شاعری میں ہنسی کے فوارے چھوڑ دیے۔

ایک چیز ہماری نظر میں بہت کھٹکتی ہے' اور وہ شاعری ہے' مرہٹی شاعری اس سرعت کے ساتھ ترقی نہیں کر رہی ہے جس طرح کہ اردو' ہندی' گجراتی' بنگالی کا حال ہے۔ غالباً اسکی وجہ اس کی ٹکنیک ہے۔ شاعری میں زیادہ تر مقامی رنگ پایا جاتا ہے۔ اس میں ہم کو قاضی نذرالاسلام اور جھویر چند میگھانی (گجراتی کے مشہور انقلابی شاعر) کی سی گرج سنائی نہیں دیتی۔ دوسری چیز قابل ذکر یہ ہے کہ اس میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے تراجم نہیں۔ یورپین زبانوں کے تو کافی تراجم ہیں۔ لیکن اپنے ہی گھر سے زیادہ غفلت' بے خبری پائی جاتی ہے۔ ہندی میں منشی پریم چند کے چند افسانوں اور ایک دو ناول کے ترجمے ہوئے ہیں۔ جلیند کمار جو ہندی کا مفکر افسانہ نگار ہے اس کے صرف ایک ناول تیاگ پتر کو مرہٹی میں منتقل کیا گیا ہے۔ ٹیگور کے چند افسانوں کا بنگالی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

سرت چندر چیٹرجی کے ناول' سری کانت' کاشی ناتھ وغیرہ کا ترجمہ ورید کرنے کیا ہے گجراتی کے مشہور ناول نگار رمن لال دیسائی کے صرف دو ناول مرہٹی میں منتقل ہو چکے ہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اردو کے چند افسانوں کے سوا اردو کی کوئی چیز مرہٹی میں منتقل نہیں ہوئی۔ اردو سے یہ غفلت حیرت انگیز ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں بھی ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اعلیٰ تنقیدی ادب کا فقدان ہے۔

مرہٹی ادب کا سیلاب اب شہر سے گاؤں کی طرف لے جا رہا ہے۔ جہاں کھانڈیکر اور ایشونت تعلیم یافتہ حضرات کو گاؤں جانے کا پیغام دیتے رہے ہیں۔ اس میں اب بھی بوی بھانات

عام طور پر پائے جاتے ہیں جو ٹیگور نے اپنی کتاب City and Villige میں ظاہر کئے ہیں۔ "ہمارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ دیہاتی زندگی کی ندی کی تہ میں جو جھاڑ جھکاڑوں اور کوڑا کرکٹ سے بھر گئی ہے اور جس میں بہاؤ نہیں رہا۔ خوشی اور مسرت کا سیلاب لائیں اور اس کام کے لئے ہمیں عالموں، شاعروں، مصنفوں اور آرٹسٹوں کی متحدہ کوشش کی ضرورت ہے۔ یہ سب مل کر اپنی بھینٹ لائیں گے۔ اگر یہ لوگ ایسا نہیں کرتے تو سمجھنا چاہیئے کہ یہ جونک کی طرح ہیں جو دیہات کے باشندوں کا جیون رس چوس رہے ہیں۔ اور اس کے بدلہ میں انھیں کچھ بھی نہیں دے رہے ہیں"۔

امجد علیخاں یوسف زئی

بی۔اے متعلم ال۔ال۔بی (عثمانیہ)

قطعہ

محبت میں ہستی مٹاتا چلا جا　　محبت کی لذت اٹھاتا چلا جا
محبت سے بڑھکر نہیں کوئی مذہب　　حدیث محبت سناتا چلا جا

محمد علی نیر

رُوسو کا ایک رُومانی خط

جین جیکس روسو (۱۷۱۲ء۔۱۷۷۸ء) فرانس کا مفکر ادیب تھا اس نے بہت سی انقلابی چیزیں لکھیں میڈم ڈی وارنس سے اس کی ملاقات تھی اور اُسی کی وساطت سے اس نے تھریسا واشیو سے ملاقات کی جو بڑی حسین دوشیزہ تھی۔ اس کے لبطن سے اُسے پانچ بچے ہوئے۔ چند دنوں بعد اس کی ملاقات کاؤنٹس صوفیہ سے ہوگئی۔ اور روسو اس کی محبت کا غیر معمولی دم بھرنے لگا۔ ذیل کا مکتوب کاؤنٹس صوفیہ ہی کے نام ہے جو جون ۱۷۵۷ء میں لکھا گیا۔

"صوفیہ۔ جلد آؤ تاکہ میں تمھارے بے رحم قلب کو چکنا چور کردوں۔ میں اب کس لئے ٹھہر جاؤں۔ جب کہ تم نے حقیقی زندگی کو مجھ سے چرالیا ہے۔ کس طرح میں تمھیں عیش و آرام سے زندگی گزارنے دوں کہ عیش خود مجھ پر حرام ہوگیا ہے کاش تم اتنی ظالم ہوتیں کہ میرے قلب حزیں کو خنجر سے بھونک کر مجھے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دیتیں۔ لیکن تمھاری یہ سرد مہری اب میرے لئے ناقابل برداشت ہوگئی ہے تم ہی سوچو کہ پہلے میں کیا تھا اور اب کیا ہوں تم میرے کرب و اضطراب کو اس وقت ہی معلوم کروگی جب تم مجھ سے ملوگی۔ جب سے تم نے مجھے یہاں بھیج دیا ہے میں جاں بلب ہوچکا ہوں۔ میری تمام قوتیں معطل و بیکار ہوگئی ہیں نہ دماغ ہی کچھ کام کرتا ہے اور نہ کسی چیز کی اچھی اور بُری ہونے کی تمیز کرسکتا ہوں اور نہ جسم ہی میں کچھ قوت باقی ہے حقیقت میں یہ تمام چیزیں تم نے مجھ سے چھین لی ہیں۔ آخر تم نے یہ کھیل کب تک کھیلنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ تم مجھ ہی سے شکایت کرتی ہو کہ میں تم سے ناراض ہوں یہ کیسے ممکن ہے صوفیہ۔ تم میری کتنی قدر کرتی تھیں۔ آہ صوفیہ۔ تم اس دوست کو شرمندہ نہ کرو۔ جو تمھاری نظرِ التفات سے

گھائل ہو چکا ہو تم اپنی خاطر میری اُمیدوں کا خون نہ کرو میں کسی کی ملکیت نہیں ہوں لیکن کیا تم نے مجھ پر قبضہ نہیں کرلیا ہے؟ اس سے تو تم خود بھی انکار نہیں کرسکتیں اور جبکہ میں خود کو تمھارے حوالے کرچکا ہوں تو مجھے اجازت دو کہ میں ہمیشہ تمھارا ہی ہو رہوں۔ ان دنوں کا خیال کرو جب کہ ہم اپنی زندگی مسرتوں میں گزار رہے تھے۔ کتنے سہانے دن تھے وہ۔ آج اُن کا خیال کرتے ہوئے دل بیٹھا جاتا ہے۔

پہلے پہل ایک معمولی محبت کا شعلہ دکھائی دیا تھا جو زندگی میں آہستہ سے سرایت کر رہا تھا اور جس نے بعد میں عقل، ہوش و حواس پر قبضہ کرلیا حتیٰ کہ میری زندگی خود سراپا محبت بن گئی۔ تمھارے جذبات بھی میری قربت سے کتنے برانگیختہ ہو جاتے تھے اور جب کبھی میں تمھارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا تو تمھارے دل کی حرکت تیز ہو جاتی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اپنی حدت تم میں منتقل کر رہا ہوں۔ ایک دفعہ جب کہ ہم آبشار کا دلفریب منظر دیکھ رہے تھے اس وقت تم نے ہی کہا تھا کہ "میں ہی ایک ایسا آدمی ہوں جو بڑی دلچسپ بحث کرتا ہوں۔ تمھاری طرزِ گفتگو، تمھاری حرکات و سکنات ایسی ہیں کہ میں انھیں ظاہر نہیں کرسکتی۔ تمھاری طرح شاذ ہی کوئی انسان اس طرح محبت کرسکے۔ یہ میری کتنی بڑی کامیابی تھی۔ اس کا اقرار اور خود تمھارے لبوں سے۔ ہاں یہ حقیقت تھی میرے ہی وہ جذبات تھے جن سے میں تمھیں اپنا سکا۔ اور صوفیہ! ان مسرت انگیز لمحات کا خیال ہمیشہ دل کو ستاتا ہے۔ گھبراہٹ کے بعد اب پریشانی سی ہونے لگتی ہے۔ کیا تم بھول گئیں کہ تمھاری بڑی بڑی آنکھیں جب مجھ سے چار ہوتی تھیں تو خود بخود تمھاری نظریں نیچے جھک جاتی تھیں۔ کیا وہ مفتوحانہ نظریں نہ تھیں؟ کیا تم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں محبت کا پیغام نہیں دیا تھا؟ اب مجھ میں برداشت کی قوت نہیں رہی۔ خدا جانے کشمکش اور آزمائش کی یہ گھڑیاں کب ختم ہوں ———— تمھارا روسو

مجید یوسف زئی

متعلم بی اے (آخری)

"احمد نے دیئے ہیں یہ روپیے، آؤ کھانا کھالو نا"

"احمد نے!"

"ہاں ہاں تم احمد کو نہیں جانتے ارے وہ تو یہیں کہیں رہتے ہیں!"

"احمد ــــ یہیں کہیں رہتے ہیں!!"

"اجی وہ داڑھی والے ــــ تم نے نہیں دیکھا اُن کو پرسوں یہاں؟"

"اوہ! لاؤ کھانا"

پرندوں کی آواز گھر کے دبیز پردوں سے ٹکرا کر تھرّا رہی تھی ــــ "پھٹ"

چڑھاؤ ختم ہوا ــــ مگر یہ پنجرہ!

دُور سے مؤذّن کی آواز سنائی دی جس میں عبودیت کے عجز سے زیادہ تقدس کا زعم

ملا ہوا تھا ــــ "اللہ اکبر"

"ــــ اللہ اکبر ــــ"

"اللہ اکبر ــــ صبیحہ خدا حافظ"

"خدا ــــ آ ــــ حا ــــ فظ"

صبح ہو گئی۔ آسمان میں کہیں سوراخ پڑ گیا تھا۔ ہوا کے لشکر باغی درختوں کا سر جھنجھوڑ کر انہیں سجدہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ جو اللہ والے تھے وہ تو پہلے ہی سے جھک گئے تھے۔ بعض تو جڑ پیڑ سے اکھڑ کر فنا فی اللہ بھی ہو گئے تھے۔

سانپ زہر پھیلایا ــــ اور رینگتا ہوا چلا گیا ــــ اُف! صبیحہ، بھو کی عصمت ــــ اب آستین خالی تھی۔

"ٹھکری ری، رن، کری ری رن، کری رن"

کالج کے نوجوان ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکلے تھے۔ مگر میری بائیسکل!

پھر وہی دو سیکلیں جو کل شام اِدھر سے گذر گئی تھیں —— آپس میں بات چیت کرتی گذر رہی تھیں۔ اب میں ان کی باتوں کا مطلب تو نہ سمجھ سکا — رہ گیا گیا تھا سمجھنے کے لئے! ہاں سواروں کے اُترے ہوئے چہروں پر جلی حروف میں لکھا تھا کہ وہ اپنی ایک شب کی دلہن کے گھر کرایہ کے مکان تھے۔ دھنسی ہوئی آنکھیں پکار رہی تھیں کہ "میں نے یہ دیکھا اور وہ دیکھا" بے زبان ہاتھ پیر گڑگڑا کر خدا سے معافی مانگ رہے تھے کہ "پھر ایسا نہیں ہوگا" اور پچکے ہوئے گال کہہ رہے تھے کہ "وہ غبارات اُڑ چکے ہیں" ....

....

دونوں سیکلیں گذر گئیں۔ اپنی کرخت آواز سے فضاء کو مسموم کرتی ہوئیں۔ کتنی بری چیز ہے یہ مشین بھی!

افضل عابدی

آہنگِ نو

رنگین خیالات

مولوی فضل الرحمن صاحب بی۔ اے (آنرز) ناظم محکمۂ نشریات لاسلکی کی یہ جدّت آفریں نظم لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد کے غیر معمولی مشاعرے منعقدہ ۱۳ بہمن ۱۳۵۰ف میں جس کا افتتاح ڈاکٹر والاشان شہزادہ شجیع (عثمانیہ) کے کلام بلاغت نظام سے کیا گیا تھا، داد و تحسین کے ہجوم میں پڑھی گئی تھی۔ خیال کا متاثر کن پس منظر، حقائق کی شاعرانہ تعبیریں، اسلوب بیان کی جدّت، زبان کی شیرینی اور ترکیبوں کی دلکشی اس نظم کی چونکا دینے والی خصوصیات ہیں۔ (نیّر)

جب ظلم کے بادل چھاتے ہیں — اور غم کا سماں دکھلاتے ہیں
جس وقت اندھیری دنیا پر — لعنت کے پرے منڈلاتے ہیں

(۲)

چلتے ہیں ستم کے تیز آرے — بہتے ہیں لہو کے فوّارے
بیداد فلک کے خنجر جب — سنسار کا دل تڑپاتے ہیں

(۳)

جب آگ کی بارش ہوتی ہے — جب موت سے سازش ہوتی ہے
دھرتی کے اکھاڑے میں انساں — شیطان صفت بن جاتے ہیں

(۴)

نومیدی کی آخر سرحد سے ملتے ہیں امیدوں کے ڈانڈے
اس وقت اندھیری دنیا میں رنگین خیالات آتے ہیں

(۵)

رنگین خیالات آتے ہیں اور خلق کا دل بہلاتے ہیں
چاہت کا سندیسہ پہنچا کر راحت کے ترانے گاتے ہیں

(۶)

پھر امن کے سپنے دکھلا کر سکھ چین کی سندر بنسی پہ
تقدیر کی ماری دنیا سے من موہنی گت بجواتے ہیں

(۷)

آزادی کا ہونٹوں پر نغمہ خوش حالی کا کانوں میں مژدہ
جو راگ بھی دل کو گرمائیں وہ راگ الاپے جاتے ہیں

(۸)

جب ظلم کے بادل چھاتے ہیں اور غم کا سماں دکھلاتے ہیں
اس وقت اندھیری دنیا میں رنگین خیالات آتے ہیں

محمد فضل الرحمٰن بی۔ اے

جوانی

(لاسلکی نشرگاہِ حیدرآباد کے غیر معمولی مشاعرے منعقدہ ۱۲ آبان ۱۳۵۲ف میں
یہ نظم نشر کی گئی تھی)

خودی کی تیغ جوہر دار چمکانے کے دن آئے
یقیں کا پرچمِ انوار لہرانے کے دن آئے
نئی صبحیں، نئی راتیں، نئے جلوے، نئی دنیا
حیاتِ نو کے نغمے جھوم کر گانے کے دن آئے
فروغِ آرزو، یہ ولولے، یہ عزمِ بے پایاں
تمناؤں کے رنگیں جام چھلکانے کے دن آئے
مذاقِ زندگی بدلا، نظر ہے اوجِ گردوں پر
ستاروں کی حسیں محفل میں کھو جانے کے دن آئے

نشاط و کیف کی امواج ہیں رقصاں رگِ جاں میں
شعاعِ مہر کی مانند اٹھلانے کے دن آئے

کہاں ساقی، کدھر کا مے کدہ، جام و سبو کیسا
بلا صہبا و ساغر مست ہو جانے کے دن آئے

حدودِ بزمِ گیتی سے نگاہوں کی ہے زد آگے
فضائے دو جہاں پر یعنی چھا جانے کے دن آئے

نہ فکرِ بیش و کم ہے اور نہ جبر و قدر کی پروا
شرابِ شوق پی کر ناز فرمانے کے دن آئے

ستاروں کو، فضاؤں کو، ہواؤں کو، زمانے کو
تڑپ کر موج کی مانند تڑپانے کے دن آئے

فضائے دل پہ ہے چھایا ہوا احساس آزادی
ہر اک آئینِ پابندی کو ٹھکرانے کے دن آئے

محمد علی نیر ایم اے (آخری)

دست برداری

(Mynel کی سانٹ Renouncement پڑھنے کے بعد)

یوں تو دن بھر میری تخئیلوں میں لہراتے ہو تم
میری ہر مصروفیت کے ساتھ یاد آتے ہو تم
تم مہکتے ہو مری ہر لرزشِ انفاس میں
خون بن کر دوڑتے ہو تم رگِ احساس میں
لیکن اک اک سے چھپاتی ہوں میں اپنے دل کا راز
یعنی گھبراتی ہوں کوئی کر نہ بیٹھے کچھ سوال
بے خیالی میں یہ چہرہ زرد ہو جائے کہیں
آنکھ سے ظاہر دل کا درد ہو جائے کہیں
زیرِ لب غزلیں تمھاری گنگنا سکتی نہیں
چھپ کے تنہائی میں دو آنسو بہا سکتی نہیں

سارا سارا دن اسی الجھن میں ہوتا ہے تمام
ایک اک لمحہ اسی دھڑکن میں ہوتا ہے تمام

ختم ہو جاتا ہی لیکن جب دن آ جاتی ہے رات
رفتہ رفتہ جب خموشی بن کے چھا جاتی ہے رات

لیٹی ہوں اپنے بستر پر میں ہو کر خستہ حال
دور ہو جاتا ہی میرے ذہن سے ہر اک خیال

ہولے ہولے تم چلے آتے ہو میرے دل کے پاس
دھیرے دھیرے ناؤ لگ جاتی ہی ساحل کے پاس

دوڑتی ہوں بے تحاشا تم سے ملنے کے لئے
مضطرب گلشن کی کلیاں جیسے کھلنے کیلئے

دور ہو جاتا ہی ڈر دل کھول کر روتی ہوں میں
بوجھ ہو جاتا ہی ہلکا اسقدر روتی ہوں میں

تم ہی تم ہوتے ہو پھر اور رات کی تنہائیاں
پر لگا لیتی ہیں اُف تخیل کی آزادیاں

علی احمد
بی اے - (عثمانیہ)

نوائے شاعر

کیا ہے عشق کو ہستی کا پاسباں میں نے
نگاہِ برق کو سونپا ہے آشیاں میں نے

حقیقتوں کی درخشانیوں پہ رکھا ہے
لطیف پردۂ رنگینیٔ بیاں میں نے

کسے خبر کہ محبت کی لہر دوڑا کر
رگِ حیات میں بھر دی ہیں بجلیاں میں نے

ملی نہ مفت متاعِ غمِ نہاں مجھ کو
دیا ہے اس کے عوض عیشِ جاوداں میں نے

سنا ہے برق مجھے آزمانے والی ہے
بنا کے پھونک دیئے کتنے آشیاں میں نے

وفورِ غم میں بھی لب نالہ ناشناس رہے
جلا کیا پہ نہ اٹھنے دیا دھواں میں نے

ثبوت اس کا ہم آہنگیٔ جہاں دے گی
اڑائے پرچمِ الفت کہاں کہاں میں نے

بنائے دیر و حرم بے دریغ پڑنے لگی
وفورِ شوق میں سر رکھ دیا جہاں میں نے

مری نگاہ سے تصویرِ کائنات میں رنگ
بقائے حسنِ دو عالم کا راز میری امنگ

سید نور محمد نور اکیلوی متعلم سالِ سوم

"رات"

بہت دور تھی مجھ سے دنیائے خواب
تصور میں ہو جس طرح ماہتاب

ہوائیں تھیں خنکی میں لپٹی ہوئی
فضائیں تھیں مستی میں ڈوبی ہوئی

ستاروں کی افشاں تھی بکھری ہوئی
حسیں چاندنی کچھ تھی نکھری ہوئی

خموشی کی چھائی ہوئی تھی گھٹا
نگاہوں پہ تھا نیند کا آسرا

پریشاں خیالات کا تھا ہجوم
ہوں جیسے بساطِ فلک پر نجوم

بہت دور سے آ رہی تھی صدا
دکھی جیسے ہو کوئی گاتا ہوا

دیا چھیڑ اس نے ربابِ خیال
اٹھا جس سے طوفانِ ماضی و حال

تصور کی دنیا مچلنے لگی
مری شمعِ دل غم میں جلنے لگی

یہ سب کچھ تھا رفعت سکوں ہی نہ تھا
محبت کو ذوقِ جنوں ہی نہ تھا

سلطانہ عزیز رفعت بی اے (آخری)
کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ

"دکن میں عیدین اور تہوار"

کہیں محفل سجائی جارہی ہے — تمنا مسکرائی جارہی ہے
کہیں رنگین قشقے ہیں جبیں پر — کہیں اک بانکپن روئے حسیں پر
کہیں بہکے ہوئے دلکش نظارے — کہیں جذبات کے رنگیں اشارے
نشیلے بام و در کھوئے ہوئے سے — خوشی کی گود میں سوئے ہوئے سے
گلے ملتے ہیں وہ شیخ و برہمن — دکن ہے علم و آسائش کا مسکن
ابلتے ہیں رواداری کے چشمے — مچلتے ہیں وفاداری کے نغمے
تخیل کی نئی آبادیاں ہیں — یہاں مذہب کی وہ آزادیاں ہیں

دسہرہ ہو کہ ہو شامِ دیوالی
دکھاتے ہیں سبھی رنگیں جمالی

خوشی آتی ہے صبحِ عید بن کر
نشاط و عیش کی تمہید بن کر

یہی جوہر ہیں بس انسانیت کے
شریکِ حال ہوں اک دوسرے کے

سبھی مل کر خوشی کے گیت گائیں
محبّت کی نئی دُنیا بسائیں

یہ عیدیں اور یہ تہوار کے دن
خلوص و چاہ کے اور پیار کے دن

بہاریں مسکراتی ہیں چمن کی
بڑی رنگین ہیں عیدیں دکن کی

امیر احمد خسرو
(عثمانیہ)

سوز و ساز

غزل

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ دبستانِ داغؔ کے ممتاز ترین علمبردار ہیں۔ ان کے یہاں بھی وہی سادگی و پرکاری، وہی زبان و محاورہ کی چاشنی، وہی طرزِ ادا کی شوخی بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہے جو داغؔ کا مخصوص رنگ ہے۔ نواب صاحب کی یہ غزل سالِ نو کے مشاعرے میں جو بزمِ اُردو جامعۂ عثمانیہ کے زیرِ اہتمام موصوف ہی کی صدارت میں ۱۵ آذر ۱۳۵۳ف کو منعقد کیا گیا تھا، پڑھی گئی تھی۔ (مدیر)

ان کی نگہ سے جب نگہِ بے اثر ملی — دل کی خبر ملی نہ جگر کی خبر ملی
پیمانِ ترکِ ہوش یہ ساقی کے ہاتھ سے — پیمانہ کیا ملا سندِ معتبر ملی
وارفتگانِ عشق کا دشوار تھا سراغ — یہہ راہ پیچ دار نہ ملتی مگر ملی
وابستۂ سبب ہے کرم ہو کہ ہو ستم — طرزِ عمل سے اپنی یہ مجھ کو خبر ملی
جاتا ہوں کوئے غیر میں صحرا کو چھوڑ کر — کیسی خبر الٰہی یہ وحشت اثر ملی

کیونکر ادا ہو شکر و سپاس عطاءِ عشق | داغِ غمِ فراق مِلا چشمِ تر ملی
دُنیا کے گرم و سرد کا خوگر ہوں اسقدر | آرام جانتا ہوں اذیت اگر ملی
چشمانِ تر نے فیض کا دریا بہا دیا | اشکوں کا تار کیا بندھا سلکِ گہر ملی
مجھ ناتواں پہ نالۂ شب کا تھا اتّہام | مشکل سے آج رخصتِ آہِ سحر ملی
اک برقِ تیز رَو مری آنکھوں میں پھر گئی | دل سے نہ دل مِلا نہ نظر سے نظر ملی

دُنیا کی حرص و آز سے اکتا گیا تھا دل
آخر عزیزؔ فرصتِ زادِ سفر ملی

نوّاب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

غزل

جناب میر حسن صاحب نے اپنے افکار کی بنیاد عصری میلانات پر رکھی ہے اور روایتی موضوع و آہنگ سے گریز کر کے غزل کی امکانی وسعت کی طرف بلیغ اشارہ کیا ہے۔ اگر اس رنگ کو فروغ دیا جائے تو غزل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو سکتا ہے اور اس کی فضا پھر چمک سکتی ہے۔ (مدیر)

یہ انداز نو اک جہاں بن رہا ہے — زمیں پر نیا آسماں بن رہا ہے

فلک کے ستاروں کے دن پھر رہے ہیں — قفس کی جگہ آشیاں بن رہا ہے

ہر اک نوع کی بندشیں اٹھ رہی ہیں — ہر اک بے زباں با زباں بن رہا ہے

نئی راہ پائی ہے انسانیت نے
نئی طرز کا کارواں بن رہا ہے

میر حسن
ایم اے (عثمانیہ)

غزل

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ عید الضحیٰ کے مشاعرے مورخہ ۴ بہمن ۱۳۵۳ف کا افتتاح اس غزل سے کیا گیا تھا)

جستجوئے سکوں نہ کر انجمنِ حیات میں
زمزمۂ سکوں کہاں بربطِ کائنات میں

عشرتِ بے پناہ سے جھوم کے ہم کنار ہو
بادۂ حسنِ یار ہے جلوۂ کائنات میں

عشق ہی وجہِ زندگی عشق ہی لطفِ زندگی
نغمۂ عشق چھیڑ کر دیکھ ربابِ ذات میں

ہے مری فطرتِ بلند تشنۂ کیفِ آگہی
منزلِ زیست ہے کہاں جادۂ کائنات میں

کتنا لطیف گام ہے قافلۂ حیاتِ دوست
ملتے نہیں ہیں نقشِ پا عرصۂ کائنات میں

عشق کے گیت گائے جا نیّرِ درد آشنا
عشق کی مے لنڈھائے جا میکدۂ حیات میں

محمد علی نیّر ایم اے (آخری)

غزل

تری بہکی جوانی ہنس رہی ہے — سبو میں ارغوانی ہنس رہی ہے

پھر اُن کی چشم مصروفِ کرم ہے — پھر اپنی بدگمانی ہنس رہی ہے

لب و چشم و جبین و زلفِ خنداں — جوانی کی جوانی ہنس رہی ہے

شراب اس رنگ سے چھلکی میں سمجھا — کسی کی نوجوانی ہنس رہی ہے

یہ ہم نے رکھی بنیادِ نشیمن — وہ برقِ آسمانی ہنس رہی ہے

فریبِ جاوداں میں رہنے والے — نگاہِ عمرِ فانی ہنس رہی ہے

وصیؔ یہ کس سے مل کر آرہے ہو

جبیں پر کامرانی ہنس رہی ہے

وصیؔ احمد ایم اے (عثمانیہ)

غزل

دل ہی کو شکیبا کر لیتے گر جرأت بیجا کر نہ سکے
اخفائے تمنا ہو نہ سکا اظہار تمنا کر نہ سکے

ہے ننگِ محبت ایسی وفا اتنا بھی نہ ہو جس میں کس بل
جو زیست کی بازی کھیل کے بھی اک شخص کو اپنا کر نہ سکے

کیا تم سے کہیں دنیا والو چھوڑو بھی ہیں جس حال میں
یہ راز ہے جس کا ان سے بھی اس راز کو افشا کر نہ سکے

وہ اور انھیں غم دنیا کا اللہ رے اُن کا عذرِ کرم
ہم خونِ جگر پینے والے یہ زہر گوارا کر نہ سکے

اے وائے مآلِ عجز وفا سر ہے کہ کہیں جھکتا ہی نہیں
اک بندے کے ٹھکرائے ہوئے اللہ کو سجدہ کر نہ سکے

اب اپنے لینگے اک اک ایذائے محبت کا بدلہ
چاہیں گے ہر ایسے انساں کو جو چاہ کا بدلہ کر نہ سکے

برہم ہے قتیلِ دیوانہ سمجھا دے کوئی دیوانے کو
ہاں حسن اسی کو کہتے ہیں جو عشق کی پروا کر نہ سکے

حفیظ قتیل
ایم اے (عثمانیہ) متعلم پی - ایچ - ڈی

غزل

قلبِ جہانِ زیست میں ذوقِ خودی ہی جب نہ ہو
کاہشِ سعی و فکر کیا؟ جذبۂ دلگداز کیا؟

کشمکشِ حیات ہی وجہِ فروغِ کائنات
محفلِ دار و گیر میں سازِ سکوں نواز کیا؟

شوقِ فزوں طلب ہی خود پردہ کشائے راز ہے
حوصلۂ نیاز کیا؟ ولولۂ نماز کیا؟

میرے ہی ذوقِ دید کی ہیں یہ کرشمہ سازیاں
جلوۂ بے حجاب کیا؟ تابشِ حسن راز کیا؟

میری جوان شورشیں مایۂ صد بہار ہیں
گلشنِ روزگار کا حسنِ بہار ساز کیا

زاہدِ حیلہ ساز اب چھوڑ دے اپنی حجتیں
بادہ کشِ عمل ہوں میں مسئلۂ جواز کیا؟

لطیف ساجد
متعلم سال سوم

غزل

ترے در سے جبیں میری نہ سرکی — تجلی بن گئی ہے رہ گزر کی

ستارے ٹوٹتے ہیں آسماں سے — کشش ہے یہ زمیں ہی کے قمر کی

لئے جاتا ہے جذب کوچۂ دوست — مجھے حاجت نہیں ہے راہبر کی

خدا جانے اثر کیا تھا فغاں میں — ہوئی حالت دگرگوں بحر و بر کی

کبھی تڑپا کبھی رویا شب غم — کہوں کیا کس طرح میں نے سحر کی

لگی ہیں سوئے در کب سے نگاہیں — جھلک پیدا ہوئی نور سحر کی

مزاج اچھا تو ہے اس مہ جبیں کا — کہ بدلی سی ہے کچھ صورت قمر کی

ہوئے جس طور پر بے خود کمال آپ — وہ تھی پہلی تجلی اس نظر کی

رحیم الدین کمال متعلم بی اے (آخری)

کلیہ کی خبریں

امتحان مقابلہ اس سال جامعہ کے ایک ہونہار فرزند حامد معین الدین ایم۔ ایس سی۔ ایچ۔ سی۔ ایس کے مقابلہ میں دوم آئے۔ یاد ہوگا کہ مسٹر حامد معین الدین نے ایم۔ ایس سی میں اول درجہ کا امتیاز حاصل کیا تھا۔ جامعہ کی نیک نامی اور شہرت ان ہی فرزندوں سے وابستہ ہے۔ ہم ان کو اپنی دلی مبارکباد دیتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ نظم و نسق کے ہر شعبے میں جامعہ عثمانیہ کے فرزند جامعی زندگی کے بلند مقاصد کی تکمیل میں سرگرم رہیں گے۔

معلوم ہوا کہ مسٹر شاہد علی خاں بی۔ اے عثمانیہ بحیثیت مجموعی دوم آئے لیکن اتفاق سے صرف سائنس میں کامیابی کے لئے چند نشانات کی کمی کے باعث منتخب نہ ہو سکے۔ ہم کو مسٹر شاہد کی اس اتفاقی ناکامی سے گہری ہمدردی ہے اور اس امر کا پورا یقین رکھتے ہیں کہ آئندہ مقابلہ میں ان کا نام سر فہرست رہے گا۔

تحصیلداری اس سال تحصیلداری کے انتخابات میں بھی جامعہ کے حسب ذیل فرزند منتخب کئے گئے۔ ہم ان سب کو اپنی اور جامعہ کی جانب سے دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

شاید اس موقع پر یہ توقع ظاہر کرنا نامناسب نہیں کہ جدید حیدرآباد کے تعمیری خاکہ کی کامیابی کا بہت کچھ دارومدار ان فرزندان جامعہ کے ہاتھوں میں ہے جو نظم و نسق کے کسی نہ کسی

شعبے میں بااختیار عہدہ پر فائز ہیں۔ ہر جامعی جدید فرزند کو جدید حیدرآباد کی تعمیر میں ہم آواز ہونا چاہئے یہ فرض خواہ نظم و نسق کے کسی شعبے میں اقتدار حاصل کرکے ادا کیا جائے یا عمومی زندگی کے کسی محاذ بے توسط سے۔ اس قسم کے ظاہری فرق و امتیاز کو اہمیت دینا ہم عثمانین کے شعار کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کا قومی زندگی کے کسی شعبے سے تعلق ہو۔ لیکن وہ جدید حیدرآباد کی تعمیر میں اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم اس دن کو دیکھنے کے آرزومند ہیں جب کہ عثمانین قومی زندگی کے ہر شعبے میں کامراں اور کامیاب نظر آئیں گے۔

تحصیلداری کے لئے منتخب ہونے والے برادران کے نام ذیل میں درج ہیں۔

مسٹر کے۔ آر۔ ریڈی بی۔ اے (عثمانیہ) مسٹر محمد عبدالوہاب ایم۔ ایس سی (عثمانیہ) مسٹر غلام غوث خاں ایم۔ ایس سی (عثمانیہ) مسٹر سید ضیا بی اے (عثمانیہ) مسٹر محمد بن علی باوہاب بی۔ اے (عثمانیہ) مسٹر قیاض الحق بی۔ اے (عثمانیہ) مسٹر اسد علی سید بی۔ یس سی، ال ال بی (عثمانیہ) مسٹر سید حبیب الدین احمد بی۔ اے (عثمانیہ)

جدید انتخابات

اس سال بھی انجمن اتحاد کی عدم موجودگی کے باعث طلبہ برادری کی اجتماعی سرگرمیاں بڑی حد تک بند رہیں۔ اجتماعی شعور کا مظاہرہ ذیلی بزموں کے انتخابات میں ہوا اور گزشتہ سالوں کی نسبت اس سال ذیلی بزموں کے انتخابات میں زیادہ سرگرمی سے حصہ لیا گیا۔ ان میں سے بعض بزموں کے انتظامی مجلسوں کے ارکین کے نام اور روئدادیں وصول ہوئی ہیں۔

بزمِ اردو

بزمِ اردو کے سالِ گزشتہ انتخابات عمل میں نہیں آئے۔ لیکن اس سال ڈاکٹر زور نے انتخابات میں خاص دلچسپی لی اور منتخب کابینہ اس گہری توجہ اور دلچسپی کی شکر گزار ہے۔

صدر۔ سید واجد علی صاحب واجد متعلم بی۔ اے (آخری) نائب صدر۔ محمد شمس الدین صاحب صدیقی اصغر متعلم بی۔ اے (آخری) معتمد محمد مصلح الدین صاحب متعلم بی۔ اے (آخری)

کتب خانہ دار مسٹر منظور احمد صاحب مدنی متعلم بی۔ اے (ابتدائی) خازن چودھری عبدالسلام خاں صاحب متعلم بی۔ اے (آخری) رکن اعزازی۔ محمد علی صاحب نیر۔ ایم۔ اے (آخری)

بزم فلسفہ منتخبہ کابینہ کا جلسۂ کرسی نشینی بتاریخ ۱۰ ار آبان ۱۳۵۲ ف جناب قاضی محمد حسین صاحب نائب معین امیر جامعہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ عہدہ داران بزم کے تعارف کے بعد محمد قدرت اللہ صاحب منتخب صدر بزم نے فلسفہ کے قدیم و جدید رجحانات پر روشنی ڈالتے ہوئے جامعہ میں تجرباتی نفسیات کے شعبہ کو قائم کرنے کی تحریک کی۔ صدر بزم نے خاص طور پر انجمن اتحاد کی تجدید پر زور دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید ولی الدین صدر شعبۂ فلسفہ نے (.... اقدار) پر ایک گراں قدر مقالہ پڑھا۔ جناب نائب معین امیر جامعہ نے اپنی تقریر میں تجرباتی نفسیات کے شعبہ کے قیام کا وعدہ فرمایا۔

اس بزم کے لئے حسب ذیل عہدہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر۔ محمد قدرت اللہ صاحب۔ نائب صدر غلام محبوب صاحب انصاری۔ معتمد مسٹر وینکٹ راؤ صاحب۔ کتب خانہ دار سردار علی صاحب الہام۔ خازن مدکر شاہ صاحب۔

بزم تلنگی صدر جناب سبا راؤ صاحب۔ نائب صدر جی رام چندر راؤ صاحب۔ معتمد سیش راؤ صاحب۔ خازن کے۔ ہاسوامی گپتا۔ مدیر ڈی۔ ایم شنکر راؤ۔

اس بزم کی سرپرستی میں تقریری اور تحریری مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ بیرون جامعہ مقررین کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ ایک تلنگی مجلہ کی اشاعت زیر غور ہے۔

بزم تاریخ اس بزم کے انتخابات کی مہم بھی پوری سرگرمی سے جاری رہی۔ اور منتخبہ کابینہ نے کرسی نشینی کے جلسہ میں اپنے آئندہ لائحہ عمل کو پیش کیا۔ اس بزم کی سرپرستی میں متعدد تقریری جلسے منعقد ہوئے۔ مباحثوں سے طلبہ کی تقریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اردو مباحثوں کے علاوہ انگریزی مباحثہ کا بھی انتظام

کیا گیا تھا۔ شعبۂ تاریخ کے علاوہ دیگر برادران جامعہ کو بھی شریک کرنے کی کوشش کیجاتی رہی ہے۔

اس بزم کے لئے حسب ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

فصیح الدین صاحب صدر۔ خورشید علی خاں صاحب نائب صدر۔ معتمد علی شریف صاحب معتمد۔ عبدالمجید خاں صاحب کتب خانہ دار۔

کھیل اور اسپورٹس

توجہ دہانی کے باوجود روئداد عدم وصول ہے۔ گزشتہ چند سالوں سے ورزشِ جسمانی کی حاضری لازمی کردی گئی ہے اس لئے طلبہ کا اسپورٹس اور ورزشِ جسمانی کے نگراں کار اصحاب سے ربط بہت زیادہ قریبی ہوگیا ہے۔ شائد نائب معین امیر جامعہ کے ان الفاظ کو دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے کہ برادران جامعہ کو حاضری کی پابندی کے ساتھ متعلقہ اصحاب کے شخصی تماس اور خوش خلقی سے ترغیب دی جائے گی۔ ہم یہاں یہ بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ قاعدہ اور قواعد کے علاوہ انسانی رجحانات کو اخلاق و کردار کی تربیت میں خاص دخل پہنچے۔ خصوصاً جامعہ میں شخصی ربط اور تعلق کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہم یقین کرتے ہیں کہ متعلقہ اصحاب اس ذاتی وابستگی کی پوری اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے برادران جامعہ کو پوری سہولتیں بہم پہنچائیں گے۔

یہ امر ہمارے لئے باعثِ طمانیت ہے کہ اس وقت شعبۂ کھیل و اسپورٹس کے متعلقہ نگار کار اصحاب دلچسپی اور انہماک سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مسٹر عبدالستار، مسٹر شریف حسین، اور مسٹر ثناء اللہ ہماری مبارک باد کے پورے مستحق ہیں کہ انھوں نے کھیل اور اسپورٹس میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر عبدالستار برادرانِ جامعہ میں ہردلعزیزی ان کی خوش خلقی کا آئینہ دار ہے یہ برادرانِ جامعہ کو ہر جائز سہولت بہم پہنچانے کے علاوہ اپنے فرائض بھی پوری مستعدی سے انجام دیتے ہیں۔ ہم کو توقع ہے کہ ان کا یہ طریقۂ عمل آئندہ بھی جاری رہے گا اور برادرانِ جامعہ میں ان کی ہردلعزیزی بڑھتی رہے گی۔ ہم شعبۂ کھیل کے متعلقہ کارکن سے ایسی ہی ہمدردی اور خوش خلقی کی توقع رکھتے ہیں۔

رحیم الدین کمال ظہیرآبادی



مسٹر محمد عبدالرؤف (عثمانیہ)

مسٹر رؤف جامعہ عثمانیہ کے آتش نوا موسیقار ہیں ۔ انہوں نے نغموں کی
دنیا میں نہایت قلیل مدت میں غیر معمولی شہرت حاصل کرلی ہے ان کی
شعلہ نوائی گرمئی بزم کو دوبالا کرتی ہے ۔



Mr. ABDUR RASHEED SUBHANI, B. A. B. E. (Osmania)

Mr. Subhani is a very popular Ex-Vice-President of the Engineering College Union, who has been appointed in the University and also selected the editor of the Engineering College Magazine, which has been started this year.

beseechingly stretched his hands towards it. And lo! Once more a victorious squeak issued from the long nail over which the sword was hung where a hungry mouse was intent on gnawing the string. When he lifted his head the eclipse was over and the triumphant moon's rays caught the point of the blade giving it an angry malevolent look of a man in a great rage. The eye was open but it had a triumphant leer in its expression.

* * * * *

The thin cotton string, already gnawed by a hungry rat could not bear the heavy weight of the weapon and it fell on the protruding neck of the penitent like the sudden flash of lightning or the swift descent of an eagle on its prey. His neck was almost severed from his body and he lay there in the last agonies of death in an ever-increasing pool of dark blood, and in that same instant the sword falling point downwards, stood quivering in the floor, an ugly thing that gleamed evilly. Over the house a silence and a shadow hung, inexplicable, unfathomable. And not another sound disturbed the quietude of the house, save the quick, dull, thud of a body falling down and the soft gush of oozing blood. After that came a heavy silence................and a sudden sense of cold in the air, as the swift passing of the shadow of Death.

F'RUZ MEHTA, B.Sc.,

over the precipice, and, the simple tribesmen who later found him dead in a deep ravine, thought this to be a mere accident. Life is cheap amongst the tribes.

But now he hated himself for the mean despicable robbery of the dead. The sword was the only decoration of his unfurnished house. The soft touch of the slanting beams of the moon made it shine, like the morning star. The whole picture rose before his mind's eye like the figure of some terrible Avenging Angel.

The sublime quietude of the night was broken by the sudden hoot of an owl. Mohammad lay rigid, the blood in his veins jumping with every throb of his heart till it seemed to shake him from head to foot. He involuntarily shivered and again his eyes shifted to the silvery blade of the sword. His eyes were glued to a spot where the rays of the rising moon illuminated it. The plaintive cry was swallowed up and lost in the darkness- but as he listened with every nerve strained and every sense on the alert he heard an answering echo issuing from the sword. Indeed the spirit of Khan was calling out for the blood of the murderer. The sound chilled him to the marrow and he already felt the cold hand of death at his throat. As he gazed at the feeble shaft of light, a shadow passed over it, and he was once more thrown into comparative darkness To his distorted imagination it seemed that the eye was closed, the vital spark of life in him was extinguished. It must be a passing cloud or was it that the old Naga had already begun its repast on the sweet moon. Had the Lunar eclipce already set in, had his moment of departure come?

With the plaintive cry of a tormented soul he rushed forth towards the baleful, vindictive weapon and

How strange that his thoughts did not for one single moment dwell on them but only revolved round a particular rock where he and a stalwart young Afghan, Kalu, his bosom friend, sat, discussing a grave problem, talking of the sterner duties of life.

Anon he heard their voices rise in anger as the true, honest Kalu, urged the impetuous young Mohammad to to leave his crooked ways of life, not to play the despicable part of a spy against the Sirkar who paid him handsome pension. But it was of no avail. Mohammad was adamant in his determination to continue receiving the pension and at the same time to continue playing the part of an 'agent provocateur' distributing arms and ammunition amongst the tribes, instigating them to dacoity and rebellion. He could plainly see Kalu's frank open face seriously perturbed at seeing his resolution. This was too much for the honest, brave soul who remained true to his salt. He had no wish to play the part of a 'Namak Haram' and with his innate decency, he candidly told his former friend that however great a regard he might have for him it was his painful duty to inform the Sirkar about his nefarious activities. Mohammad knew enough of him to know that he meant what he said and would carry out his threat, thus eternally ruining his present propects. Finally he saw himself doing the last terrible act, when, with a short, quick, fierce movement of a desparate savage he hurled a big stone at his friend with diabolical strength. It caught Kalu unaware between the eyes resulting in an instantaneous death. Ah! how his blood gushed forth like the vein of a well gurgling deep in the earth. His sword was too good a prize to be lost, so after relieving him of this burden, a souvenir of the dead, he kicked him

Soon the curve took the shape of a lower lid, and as he looked on it slowly resolved itself into a big terrifying eye, the eye of the fakir,—glistening, gleaming, glittering like a beam of light, a red tongue of fire or a flash of lightning—a veritable Black Angel of Death. It rooted him to the spot, hypnotised him and bound him by invisible chains far stronger than the strongest pair of handcuffs. By the smouldering fires of the eye under the soft light of the moon dark memories were aroused from their sleep like souls on the wide field of resurrection and the past once more turned to life and he fell a—dreaming.

Truly it was a night to dream in, a white night, full of the moon and the magic of the moon. And so staring at the ugly gleam on the blade, which had assumed the shape of a gigantic eye, he dreamed about the past and the future. He dreamed of a particular piece of black rock, a veritable stone of sorrow, beside a winding pathway in the bleak ranges of the Sulaiman, beneath a starlit, beautiful sky. On this rock he and Kalu sat, talking earnestly, and the soft caressing wind whispered by. Those two figures in his dream did not talk nor did he dream of their glorious childhood, when as children, they used to walk hand in hand, climbing steep uplands, plunging down precipitous slopes, playing hide-and-seek in the gloom of forests, skiping blithely in the wind-swept hills with their curls afloat in the early morning breeze, matching their strength against each other, their innocent cries and hiccups evoking strange, weird echoes from the surrounding hills—a melody of joy and sorrow, of laughter and tears, like the greater melody of Life.

around him was already brimful of shadows which, as he watched, seemed to assume fantastic shapes. He quickened his steps and soon reached home.

At last he reached his red-bricked, unimposing little house in the midst of others like it. It relieved him to see the cluster of houses after the present mental anguish. They seemed more homely, more earthy, more solid than the unreal, ghostly heights of the hills.

He ate his frugal meals and tried to sleep. For the first time in his life, he found that even sleep had deserted him. So taking courage in both hands, he sat in a corner, waiting for sleep and—the Ghost.

Darker and darker grew the evening shadows,—but still he sat in his corner, solemnly considering his strange fate, and forgot his bed. Soon a misty white glory arose out of the gathering blackness, the moon, pallid yet brilliant lifted her strangely sorrowful face over the bleak hill tops and cast a silvery reflection on the grass below. It was a mournful, almost spectral night, as he grimly waited for Kalu's shade. The rising moon cast the magic of her pale loveliness upon the world, and sitting there in a dark corner, he glanced round about him and through the casement at the outside world with an eye that strove to take in the beauty of all things—of hedge, and tree, and winding road, the sheen of water, and the far, soft sweep of hill and dale. Over all these his glance lingered yearningly, for it seemed to him that this look might be the last.

Anon the slanting rays of the rising moon, passing through the open casement, gleamed evilly upon the curved, heavy, long blade of a sword hung on a nail.

the Ninety and nine Names of Allah he would cheat death. He would sleep like a log. And he did.

Death! Why think of it amidst life? The very thought of it chilled him to the marrow. He had a great desire to show a pair a clean heels and it needed an effort of will ere he could curb the panic in him. With an increased pace he walked on through the shadows, past trees that were not trees and bushes that were not bushes; but frightful phantoms, rather lifting menacing arms above his head, and reaching after him with clutching fingers. Ghosts! He suddenly fancied he heard a step behind him, the heavy step of Kalu; he swung round on his heel, with ready stick; but the road stretched away empty as far as he could see Ghosts! Everything was ghostly, the heights of the mountains in the gathering dusk, the goblin-like bushes and spectral rocks. Ghosts!

Why, the road was full of them, they crowded upon his heels, they peered over his shoulders, he felt them brush his elbows, and heard them gibber at him from the shadows. All along the way he was haunted by the glittering eye of the Fakir.

And the sun was setting already! But just before sinking it rose again an instant above the horizon, and like a gignatic molten diamond it flashed forth a beam of light............he stood transfigured in its last rays. It looked like the finger of fate guiding him to his predestined goal.

Involuntarily he hastened his steps but the sun had set ere he reached Dera-Ghazi Khan. Yes, the sun had set, encompassing the Universe in twilight, the space

Djins, Boots and Pareets in the holy book? Since Kalu was dead there must be Kalu's shade. Let him be. But what really interested him was the question: Would the ghost take the trouble to drag him along, against his will, to his own ethereal, intangible shady abode beyond the terrestrial, tangible world of his, as predicted by the fakir? Would a shade, without a body, actually kill him? Would he....................

Suddenly he stooped in his walk. An incredulous expression spread over his face. The fakir had said so, but how in the name of his father the Devil did he know of the little affair on a dark night? Had he any secret power or was it mere guess-work? He must make sure of it at once. Where was the man with the glittering eye? He retraced his steps but the old fakir was nowhere to be seen. Where could be have gone in ten minutes' duration? He seemed to have disappeared into thin air. Or was he, could he be, the ghost? He felt an odd chill as of cold water running down his back and beads of perspiration stood on his brow.

With a hunted expression in his eyes he tried to compose his thoughts. Could there be no escape from death? Was his fate sealed? Should he accept his fate lying down because an old, doddering fool had said so? Was there in him no wish, no determination, to live? By all means, any man with an ounce of brain would prefer life te death. But the question was– was there any chance?

Yes! Why not? Suddenly a smile spread on his lips as he remembered the last words of the Fakir. What had the old fool said? "Beware! If thou wishest to cheat death then sleep the sleep of the just. Begone." Yes, by

Frontier. Evidently the meagre pension paid by the Sirkar was not sufficient to keep his big body, and, mean, little soul together.

"Yes, your days are numbered." The voice of the mendicant cut short his reveries.

"When, tonight, the Naga shall devour the moon and encompass the Universe in sudden darkness, then the spirit of Kalu will awake and stride forth to wreak its vengeance on thee. Beware! If thou wishest to cheat death, then sleep the sleep of the just. Begone."

By now Mohammad Khan was thoroughly frightened and did not wait for a second bidding, but, immediately started for home. Gone was the cynical, come-what-may expression from his face as he hurriedly strode forth in the glory of the setting sun. His brain was in a whirl, there was a lump in his throat which he tried to gulp but could not as he made vain efforts to sort out the past events.

Death on the day of an eclipse of the moon—that, too, at the hands of a ghost! He did not feel like dying. Death had great terrors for him. To be killed on a battle-field or even by the sharp steel of an enemy was something different from the cold, uncanny murder by the spirit of a murdered person.

Could it be that ghosts really existed or were they the creation of a vivid imagination? All this talk of ghost was pure illusion, an eye-wash and mere moonshine to delude and strike fear in the hearts of the weak and the fickle. Revenge of a ghost—pshaw! What true Believer could allow himself to think of, let alone believe in, such folly? Still why not? Did they not speak of

with a strange foreboding. He stooped low and looked with a fascinating interest at a break in one of the lines on his palm which a shrivelled old finger was pointing to him.

On lifting his head he found his companion regarding him with a curious expression on his face. A strange, cruel smile played on his thin lips, and to his distorted vision, it seemed as if his long, bony, crooked nose had taken a further tilt towards the right cheek bone.

The deep sonorous voice continued:—

"Thou shalt not die an ordinary death; thy body shall be sacrificed for the atonement of thy sins. Thou oweth thy life to Kalu, thy former friend, whom thou murdered in cold blood on this very spot, exactly a year ago to the very day".

Mohammad Khan gave an involuntary start, almost a jump, and stared, as the old fakir spoke the dark past. No one knew that Kalu Khan was murdered by him. It was all so very simple. A dark night, a heavy stone and a push over the hill, and no one was the wiser. Poor fools, they thought that Kalu had accidentally slipped down the precipice. Served him right too, the sneaking rogue. Played the spy on him, Mohammad Khan, the Waziri, the secret agitator of the tribes. Well! not a bad job, serving the great Khan from the far-off Germania and befooling the Sirkar. They paid well, those foreigners, and the guns they distributed amongst the tribes for the coming Jehad,—a Holy War for the establishment of a Pan-Islamic Empire and the overthrow of the power of the infidel in India – were as good as the looted rifles from the outlying, far-flung, lonely posts on the Indian

Men Have Their Exits . . . .

A BIZARRE STORY OF INDIA'S FRONTIERS.

THE slanting rays of the setting sun flaming with august fires, lit up a bleak old mountainous track. The winding pathway was empty except for two persons squatting comfortably beneath a bush. A more ill-assorted pair could hardly be imagined. Mohammad, tall and handsome, square-shouldered, deep-chested with an air of jaunty, devil-may-care rakishness on his rather cynical face, seemed visibly perturbed. His companion, quite his opposite in outward appearance -an emaciated body, extremely thin and bony with a big beard wholly incompatible with his exterior and a long drooping nose set very much to one side was saying something in earnest with a good deal of gesticulation—giving his robust companion the 'creeps'. By his attire he looked like a wandering fakir, but what really distinguished him were his eyes, indeed they were a remarkable pair of eyes—glittering and hypnotic with a fixed gaze, like a flashlight intent on looking through his acquaintance's very soul, rooting him to the spot and trying to read his innermost thought.

'Yes Mohammad; I see thee at the end of thy journey, and the time hath come for thee to take the big jump across the beyond. There is a distinct cut in the line of Life. Art thou prepared for it?'' asked the old fakir, after silently observing the dimly discernible lines of the big Afghan's red palm in the struggling rays of the setting sun. The cynical Afghan's eyes sparkled.

Abyssinia. Later in 1938 Germany captured Czecho-slovakia. All these small countries were deprived of their freedom and a war was let loose upon the peaceful world.

In conclusion we can say that the discoveries of science if used in the proper way lead to the happiness and prosperity of man, if abused they lead to the destruction and ruin of man. So that science can be a blessing as well as a curse to humanity.

ASAF ALIKHAN,
II Year Arts.

propaganda. News is distorted and broadcast. For instance, after a bombing raid it is announced that there had been the loss only of a few cups and saucers. Can we believe this?

Science has made man sceptical.

People take delight in killing their fellow beings and great importance is attached to those countries which have advanced in the art of war. The saying that "Battlefields have become altars and Hitlers have become Archbishops" has been proved.

There are many things by which we are benefitted but do not know what they really are. For example, Electricity was discovered and harnessed for our use. But alas, science has taught us to use electricity for the destruction of mankind.

Science has encouraged warfare. If we cast a glance at the pages of History we shall see how wars were fought from time to time.

Asoka after the 'Kalinga War' was so shocked by the useless bloodshed of his fellow-beings that he vowed never again to wage war. But his own sons and succesors started them over again. Harsha also after waging many wars became a Buddhist and gave up his ambitions of further conquests. But even these noble efforts proved a failure. The various international leagues established at different times failed to assure peace in the world.

The League of Nations formed on the 20th of January 1920 failed in 1936 when Italy pounced upon

Another useful invention is the Radio. We can well imagine the number of days Marconi, the great Italian scientist must have toiled to acheive the goal. It was sheer perseverance which brought him success.

We can hear the voice of the people who are thousands of miles away from us. We can appreciate the beautiful music of the great artists and hear the speeches of great men in every walk of life.

The Refrigerator is another great invention. It has great utility specially in the hot season. All vegetables and fruits are kept fresh and cool. Puddings and ice-creams can be prepared with great ease.

The scientific inventions for which scientists toiled arduously to benefit humanity have brought about wars and massacres—nothing but chaos.

Innumerable planes are sent out to bomb the enemy targets. Millions of innocent lives perish and still more perhaps are left ruined. Factories are damaged, railway bridges are blown up, houses are demolished and cottages disappear. So much of one's labour proves worthless and all the hopes of a peaceful life are shattered.

It is Science which has made man pugnacious and has made warfare brutal. Gallantry and bravery are at a discount.

All these inventions help nations to destroy others, help one soldier to kill another and thus destroy humanity. The Radio has become an instrument for

"Science and Human Happiness."

EVERYTHING can be judged in two ways. It may be useful in some ways and useless in others. And the same is the case with Science. Science progresses rapidly, specially in the days of war. Nowadays the country which has the ablest scientists is considered the most powerful. Courage and valour do not count in these days.

Science has made travelling easy. People instead of travelling on foot or on horse-back or on camels, make journeys in trams, trains, motor cars, ships and aeroplanes, and thus economise time. In olden days, travelling was considered very unsafe because people were always afraid of being looted by dacoits, plunderers and marauders. The invention of modern means of travel has minimised danger. One can travel throughout the world without much danger of being looted or kidnapped. One can sit comfortably smoking a pipe or a cigarette.

The beautiful scenery, the fresh air, the sweet scented breeze would certainly enhance the pleasure of travelling. One feels cheerful when one rushes past at full speed casting a glance over the various scenes of nature, the swaying of trees, the sunset of gaudy hues when the world is clad in crimson and gold or the night with a million stars.

to fight but serve, a soldier not to destroy but to construct, a soldier not to spill so much blood of his fellow creatures but to put so much blood into his fellow beings as to resuscitate them, a soldier whose weapons are not guns and rifles with lethal cartridges but love and sacrifice with service—.

G. V. SUDHAKARA,
V Year Arts.

All is showy and tawdry. It is divorced from Nature, from its blessings and beatitudes. Simplicity and decency have quit tne city in shame and horror. Everywhere there is unrest, there is uneasiness; vexations and anxieties have become a matter of course. The people seek escape from them in the theatres, in the cinema, in the Hotels but find no rest or peace of mind. In short there is neither the warmth nor the depth of life.

One evening Rabhira sits in his room with "Leaves from the Jungle" by Verrier Elwin, the book he got as a gift from his professor. He is tired and exhausted because of his hunt for jobs, but he is in quiet and tranquillity of mind. He skips the pages. Suddenly he sees a photograph of two tombs of a German and an American missionary in the midst of the thatched huts of the aboriginals of Central India. The picture murmurs something-audible only to those who care to know what it says. It speaks of love which transcends all geographical limits and boundaries, it speaks of service which extends itself without being solicited, it speaks of sacrifice which says that it knows not what it is. The voice of the picture reverberates in the inner recesses of Rabhira's heart and in the back of Rabhira's mind. In the echo of the voice Rabhira hears that he has a purpose to fulfil, a function to discharge, not in the office but by the side of forlorn villagers, not in the midst of tumult and turmoil of the city but in the peace and tranquillity of the village, not with the avarice and superfluity of city life but with contentment and simplicity. Rabhira could no longer remain in the city. The city had lost its glamour for him. In the hierarchy of life he is a soldier at his post in the village—soldier not

of his mother Durga. Rabhira is dumb-founded, words fail him. He simply follows her to his father's bed-side, but when they reached he was already dead, he who had sacrificed the peace and tranquillity of the village of his birth only because he had pinned his hopes on Rabhira, he who had travelled to the city only to groan under the oppressive weight of poverty and vexation and in the end to have none at his bed-side, even the son, even the wife to utter, the parting words. The same evening Rabhira's mother too fell a victim of that monstrous pestilence. Neither he nor the doctors nor anybody else could save her. The parents departed from the world before they could realise their only ambition in life: to see their son prosper in the world Rabhira was heavy at heart................ He took the Examination and received the Bachelor of Arts degree. It was now for him to come on the stage of the world and play his role. He was left all alone to face the struggle of life. He had to fight single-handed. Now he applies for a post in the government. For the interviews he required to maintain all the modes and formalities, all the artifices and makeshifts. Yet of what avail? He had no rich and influential relatives, no recommendations and no letters of credence. He tramps from office to office in quest of some service. "No Vacancy" stares him in the face, peons at the doors of the offices halt him. He looks into the "wanted" column of the newspapers. But only first class and second class graduates are needed. In his search for jobs Rabhira puts his hand on the pulse of the city. There is so much disparity, so much in-congruity. If there are men who wallow in riches, there are also men in no less negligible number who grovel in the dust; buildings are palatial and spacious but the huts in the slums are squalid and noisy. The life is full of artificiality, full of makeshift.

won a scholarship that relieved the burden of the family to an extent. The same year Rabhira appeared for the entrance examination and to his credit he topped the list. But Rabhira had to solve the problem of his future. Till now, all had gone well. He had his father to think for him, to decide for him; now he should think for himself. He would certainly proceed to higher studies.

Rabhira joined the college with some difficulty. The life here was different, but he was not unhappy. He received respect and welcome from every side. No wonder, he had stood first in the Entrance examination. The fellow-students respected him, they whispered to each other 'He is first class'. Lecturers felt delighted to know his merit. Very soon Rabhira had a lot of friends. He is the very cynosure of the college. But he begins to feel something peculiar, something quaint within, him. He could not afford the fashions of the college life obviously because his parents were poor; they could only get him the minimum necessaries of life. In the inner recesses of his heart a strange feeling toward his parents developed. Many a night he passed with his friends at the cinema, at the theatre and in his friend's house. The parents waited impatiently for his return at night often in vain. But they had the same love, the same affection for their son; nay, their love, their affection is ever on the increase.

Three years elapsed. Rabhira had passed the Intermediate examination but not in the first rank, and he was now in the 4th year, the final year of his college life. One day sitting at his books late in the night at his friend's house, Rabhira hears a faint and distant voice 'Your father longs to have a last glimpse of you, he is dying, Rabhira, dying of the plague!' This is the voice

"The March of Life."

RABHIRA was the only surviving son of his parents. His parents lived in the village Govara beautifully situated on the river Javana. They were poor and subsisted on a plot of land inherited from their ancestors. They had no other incentive to live in the world except for their young boy. Rabhira at the age of five was sent to a village 'guru' who himself knew only a little of his mother tongue. Within two years the boy had learnt all that he could teach. This encouraged the parents. They decided to leave for a city for his higher education. They sold their land and their small cottage for a small sum. Who could have paid more than what they got for the land in that village?

One morning the parents with their child said farewell to the village with tears. Arrived at the great city, Dinaba, the father, had a busy time—he had to find lodgings, he had to earn a living and above all put his son to school. Within a short time he managed cleverly enough the three things. He rented two small rooms in a remote corner of the city but near the school where the boy got admission. Rabhira was studious and the parents without a grudge, without a murmur catered for all his needs. They might retire at night starving and hungry but could never endure even the thought of their son lacking anything.

The years passed, Rabhira became the favourite of his teachers and the envy of his fellow-students. In him was the combination of industry and inspiration. He

acquired among those who have not had the same opportunities as you have. In all your future progress through life, whatever befalls you, remember that the honour and fair name of your University are in your keeping. See that the honour is never stained, that the name is never tarnished. In life, the academic degree you obtain today may or may not be of value to you, but the culture you have acquired and the character you have developed will go with you through life. It is not the certificate that will gain you the respect and confidence of your fellow-men, but it is by your conduct and character that you will secure them.

The Osmania University will shortly be celebrating its Silver Jubilee. May I conclude by wishing it a long successful career of service to the State and to the cause of civilization and progress.

SIR ARDESHIR RUSTOMJI DALAL,
Kt., I.C.S. (*Retd.*).

Industrial Trust Fund out of which industrial enterprise may be encouraged, is a wise and thoughtful measure on which I must tender my respectful congratulations to His Exalted Highness and his advisers. You have already helped in this way to start a number of industries in the State. In the Singareni Coalfields you have a valuable source of power and in the Nizam's State Railways you not only possess a good means of communication but also a large industrial undertaking which could well be the source of a number of engineering industries and the means of training engineers and technicians to staff them. From this point of view may I emphasize the need of devoting the utmost attention to the subject of mechanical and electrical engineering in your Engineering College, so as to equip your students as thoroughly as is done in any other university in India.

You have a large number of flourishing cottage industries, arts and crafts. I should very much like to see a system adopted on the Japanese model by which cottage industries could be integrated to the large industries, so that some of the components of a large industry may be made in the villages and assembled in central towns. For this purpose an extension of communication and of cheap electrical power to the villages would be necessary.

A last and very pleasant duty still remains before me, and that is to offer my congratulations to the Graduates of the year. You have obtained the hall-mark of the University, but may I remind you that you have made certain promises today to the Chancellor in open Convocation. You have promised to pursue truth, to cherish virtue and to disseminate the knowledge you have

* * * * * *

have altered since then, but the disproportion is still as glaring as ever. Even in the field of agriculture which is the primary industry of India, due to the lack of scientific methods and the poverty of the cultivator, the yield of the principal crops is appallingly low, as compared with the yield in other countries. The yield of rice is 0·39 ton per acre as compared with 1·01 in the U.S.A. and 1·61 in Japan; the yield of sugar-cane is 12·66 tons per acre as compared with 20·06 in the U.S.A., and 54·91 in Java; the yield of cotton is ·04 ton per acre as compared with ·11 in the U.S.A., and ·23 in Egypt. Even for an advanced country like Great Britain it was estimated before the war that the application of scientific methods and research could nearly double the produce of the land. Under the pressure of the economic blockade a great deal of progress has been made during the war in the application of scientific methods to British agriculture. If that is the position in a scientifically advanced country like Great Britain, imagine the scope for improvement in a country like India where scientific methods have barely been applied to agriculture in spite of the efforts of Government and of the Imperial Agricultural Research Institute, and where the yields are so poor. Here is a vast field for the student of scientific agriculture animated by a desire to improve the economic condition of the rural population.

You have a Department of Technical and Vocational Education, a Technical College, a College of Arts and Crafts and an Industrial Research Laboratory devoted to these ends. I was shown a building nearing completion which is to accommodate a Polytechnic Institute. All these developments show that you have the industrial development of the State prominently in your mind. The provision of the sum of one crore of rupees as an

Rightly or wrongly, for good or evil, this is the age of the machine and the history of the war has proved and is proving every day that it is only the scientifically developed countries which have highly organised industries which can hope to survive in the struggle for existence. The wonderful resistance of Russia which has evoked the admiration of the whole world has only been rendered possible through its extraordinary scientific and technological development since 1928.

The lesson for India is plain. It must embark upon an intensive programme of scientific and industrial development if it is to attain the position of a great independent country and to maintain it. It will be the duty and the privilege of the young scientists who are being trained in your University to help their country to achieve this position. There is a tremendous leeway to make up. India is primarily an agricultural country with sixty-seven per cent, of its population engaged in agriculture and a bare ten per cent, in industries. Though a certain amount of industrial development has taken place under the impetus of the war, it is small compared to the industrial development of countries like Canada and Australia since the war. The whole economy of a country which depends to such a preponderating extent on agriculture is unbalanced and unsound. Such a country can never achieve a high standard of living. It lacks the amenities of civilization enjoyed by advanced industrial countries and, what is more important, renders itself incapable of self-defence in modern warfare. The average annual income per head of population in India as estimated in 1931 is Rs. 65 as compared with Rs. 980 in the United Kingdom and Rs. 1,387 in the United States of America. The absolute figures of income may

There is no question on which more divergent opinions have been expressed by responsible men in the public life of the country than this--if, and to what extent, students while they are at the university should play an active part in politics. Speaking as one who is neither a politician nor an educationist but simply as one interested in the welfare and progress of the youth of our country, I would ask you to remember that the period of your stay at the university is one of preparation for life. When the preparation is ended and you have passed out of the university, it will not only be your right and privilege but also your duty to take an active part in all movements for the welfare and advancement of your country.

If in India today our political and social problems have become more difficult of solution, if the ugly spirit of communalism is eating into the vitals of our national life, I believe it is partly because the universities of India have in some measure failed to achieve their object of promoting culture, and dispelling not only ignorance but passion and prejudice. It is from the universities of the nation that we have a right to expect the promotion of feelings of toleration, mutual understanding and sympathy between the various elements that compose the national life. And it is from the young men who leave these universities that we may demand a sane and balanced judgment, a just sense of higher values, a broad mental outlook and a universal sympathy. But "if the salt have lost its savour, wherewith shall it be salted?" A university will ultimately be judged by its success or failure in enlarging and liberating the mind of its students and developing in them an outlook that transcends the narrow barriers of race, caste and creed.

* * * * * *

those who enter its portals to enrich those traditions and to foster those feelings of lovs and brotherhood among all communities.

* * * * * *

In pursuance of the aim of the founder to achieve a harmonious blend of ancient and modern culture, you are actively promoting studies and research in oriental languages, Sanskrit as well as Arabic. The Dairat-ul-Maarif which carries on the work of editing and publishing rare Arabic manuscripts has won international reputation for itself. It is this harmonious blend, this happy synthesis not only of ancient and modern culture but of Hindu and Muslim thought and spirit, the achievement of which should be the principal aim and crowning glory of your University.

Synthesis in the spheres of literature, philosophy and science has always formed the hall-mark of Islamic culture. On the one hand, we have a chain of venerable universities which have carried out this task through the ages, thus the University of Cordova combined the thought of Islam, of Spain and of Palestine. The El Azhar University of Cairo united the cultures of Egypt, Greece and Arabia. The famous Nizamia University of Baghdad had perhaps the largest number of students devoted to researches in Greek philosophy. Plato and Aristotle, Galen and Hippocrates were household words in Baghdad. The number of commentaries on Aristotle and Plato written by the alumni of the Nizamia could be counted by thousands.

In the words of a Persain poet:

چنین گفت دانا کہ دانش بسیست
ولیکن پراگندہ با ہر کسیست

* * * * * *

has rendered a unique service to the cause of education not only in his own State but throughout India, has affirmed in the charter founding the University that his purpose was "the inauguration of a University in the State in which the knowledge and culture of ancient and modern times may be blended so harmoniously as to remove the defects created by the present system of education and full advantage may be taken of all that is best in the ancient and modern systems of physical, intellectual and spiritual culture. In addition to its primary object to diffuse knowledge, it should aim at the moral training of students and give an impetus to research in all scientific subjects." The progress of the University since its foundation indicates that this purpose is being fulfilled.

* * * * * *

It redounds greatly to the credit and honour of your gracious sovereign that he transcended the narrow conception of a sectarian university and founded an institution which throws open its portals to all the youth of Hyderabad irrespective of caste or creed in accordance with the catholic ideals of a true university. This principle of toleration, this synthesis of cultures, is expressed even in the architecture of your stately buildings, which are the realisations in stone of the inspirations of your gifted architect, Nawab Zain Yar Jung Bahadur and of M. Jasper. The harmonious fusion of the Ajanta and the Moghul styles in the design of your buildings is a symbol and an object-lesson. It is a symbol of the mutual love and good-will of the two great communities, Hindus and Muslims, who compose the population of the State, and of the tradition of tolerance established and cherished by the Rulers of the Asaf Jahi dynasty. It is an object-lesson of permanent value to all

Convocation Address, 1942.

MAY I begin by expressing my keen appreciation of the great honour His Exalted Highness and the authorities of the University have done me by inviting me to deliver the Convocation Address this year. I do not claim to have made any special study of educational problems or to have achieved any such distinction in the realms of science, literature or politics as to entitle me to the compliment you have paid me.

In the Osmania University you set out to do, and have already succeeded in doing something that is unique in the educational annals of this country. Appreciating the defects inseparable from a system of education through the medium of a foreign language, such as the strain on the students' memory, the stifling of originality and the unbridgeable gulf created between the educated classes and the mass of the population, you have with a vision and a courage worthy of admiration, founded a University imparting education through the medium of Urdu. At the same time, through your Bureau of Translation with its large staff of highly qualified translators, you have succeeded in translating the greater part of the books embracing practically the whole range of university studies and have thus not only freed the students from the shackles of a foreign language but have contributed a great deal to the advancement of Urdu language and literature.

His Exalted Highness, whose name this University bears and who through the foundation of this University

the play-ground he plays with and for his team. In short, *mensa sana in corpore sano* should be literally accepted.

For all this, better economic organization is presupposed. Even if properly educated as children they would as adults be crippled and embittered by the desparate fight for jobs. Only under the aegis of economic security can the intellect bid for the fullest growth. If we could reform education along these lines and at the same time reform economic conditions, we might in a few years produce quite a new world, the envy of even the utopians. The task before educationalists is to use every art and propaganda and reasonable persuation to make all men see that the modern world cannot find peace and prosperity, still less true happiness, till all its citizens are educated in such a way as to call out their full capacity for citizenship and personality.

E. V. RAM REDDI, LL.B.,
(*Previous*).

handicaps, e.g , lack of public sympathy and Government encouragement. Over to 8,2000 have been made literate, including a large number of women. And this improvement must continue. The authorities, should make it a point that all illiterate prisoners shall be educated.

The Double Function of Education.

Education is its own end; still we can ill-afford to ignore its vocational side. The glamour of degrees has brought ruin to Indian students. They issue from the college portals, only to prove complete misfits in the practical world. India sorely needs industrialization. Her sons should be equipped with technical skill. Science is the trump card which is missing from our pack and we get it only on loan from the West. It is indeed a sorry spectacle to see more students in arts than in any other faculty. This state of things should go forthwith.

True education cannot be sacrificed to vocational training either. Literature which makes for accuracy and penetration of thought and delicacy of emotional reaction; Mathematics which whets the intellect, philosophy which supplies the true intellectual corrective to the more blinkered and dogmatic kind of science—can by no means be ignored. Nor can politics and economics be neglected. Biology should be the starting point of a sound curriculam.

Athletics, Debates and other Social Activities.

The value of debates and athletics cannot be exaggerated. On the platform the student unlearns the dread of the audience and learns to be relentlessly critical of his own motives and at the same time imaginatively sympathetic towards the motives of others. On

his teacher's aid and stimulus. He must attach no *a priori* rightness to the teachers' decisions. They are not infallible beings anymore than he is; they are, like himself, open to criticism, though on the whole more experienced and capable. Contradiction is the motive force of all progress.

Adult Education.

The problem of adult education is closely connected with the task of juvenile education Early impressions being difficult to efface, the child should be preserved from an ignorant domestic environment. To imagine that education does not begin at home is foolish. Real education begins at home. At present most children are warped by early home influences, either by the strained relations between parents or by unwise treatment, some spoiled by undue repression. Many torn between love and hate for one parent or both, develop deep-seated complexes. As a result, most children grow up with unsuspected mental kinks, prejudices and phobias, which make it impossible for them to become satisfactory citizens. To prevent such untoward developments parents should be properly educated; in fact, no one should be allowed in the intelligent state to become a father or mother without a licence for parenthood.

Of late many adult education schemes have been proposed, most of them only to sink into oblivion. No pusillanimous attempt will effect any tangible changes. Sustained work alone can wipe out illiteracy and prevent further lapses into ignorance. Tne Bombay Educational Committee which launched its crusade against adult illiteracy four years ago, has done exemplary work; and this in the teeth of considerable

Teaehers, their Status and Relations with Students.

Since the right type of education is necessary for progress, the whole educational system of a country should be more a source of pride than its apparatus of industry and agriculture. These produce only commodities for citizens; education produces the citizens themselves.

The Selection Board must be very fastitidious in the choice of teachers. Nepotism and favouritism are particularly out of place. Only persons of high mental calibre should be allowed to teach; and only those who have also a special uptitude for the profession. An adequate system of education requires a great host of young, vital and well-trained men and women to carry on the important work of evoking personality, organizing sentiment and imparting information in such a way as to stimulate intelligence.

Everything should be done to preserve the young from the influence of tired, and therefore fossilized brains. Teachers who have attained the age limit should be given posts in the Civil Service, where they will still be able to do good work without damaging any.

The teaching profession must be given as much autonomy as possible, since educators alone can appreciate the importance and difficulties of education. History-text books should be very strictly supervised by the international authority.

Not only this. If education is to proceed rightly the student must have the right kind of relation with his teachers. He must not be spoonfed, instead he must be made to feel that he is educating himself, though with

imagined. Under the existing system of education the student has to learn his dull lessons in a language with an entirely different genius. It is now accepted that the child should be instructed in all stages of his education in the language in which he learnt to lisp. But our educationalists are still conniving at this anomaly. English is still the medium of instruction in almost all the Universities of India. Although latterly it has lost favour, yet it retains its position as the medium of instruction. Here the Osmania University has done pioneer work. Whatever be its defects—and, one has to admit, there are many –, it has got one redeeming feature. It has taken the bull by the horns by introducing Urdu as the medium of instruction even in the higher stage. Recently on the occasion of its Silver Jubilee, Mahatma Gandhi took the Benares University to task, when he criticised its medium of instruction. The process of introducing vernaculars as the media of instruction and examination should, however, be slow and gradual.

Whether co-education makes for the healthier development of boys and girls is still a debated point. Its advocates say that since education is a preparation for life, co-education provides one of the best means of attaining that end. To train the sexes apart, they say, and then throw them together in society on the chance of their realizing harmonious co-operation, is at best a gambler's game. They maintain that the boys' standard of manners and courtesy is raised; the girls gain in freedom and width of outlook. However, after witnessing the appalling prevalence of divorce and other violations of the sacred bond of marriage in the West, which is largely due to co-education, we cannot but turn our back on this system and seek our salvation somewhere else.

action; to act, men need faith; to keep faith, men need reason; to direct all these, men need a vision of excellence. This vision of excellence cannot be cultivated except through education. As such all the children, boys and girls, rich and poor, should receive a certain measure of rudimentary education. At present children are herded into factories at the age of 13 and even earlier, when education has scarcely begun to attract them. Any capacity which they may have, is starved. No scheme which does not admit of compulsory primary education can meet the requirements of the hour. It doubtless makes a heavy demand on the country's resources. If Government cannot bear the burden of Compulsory Elementary Education, unofficial agencies should share the cost of it. However generous the government, unless public response is forthcoming, the aim is impossible of realization. The Government itself can stint no expenditure and spare no effort in the liquidation of illiteracy.

Certain Anomalies in Our Educational System.

At school and as college the students are not encouraged to develop their innate capacities and to use intelligence. Instead, they are trimmed into an approved their pattern, stuffed with information and trained to tender correct responses to the stimuli of patriotism and religion. Consequently they are reduced to robots. They are not taught to do any pioneer work in any branch of knowledge. Uunless this process is reversed, there is little hope of salvation.

Indian students are labouring under an additional handicap and its seriousness is now little questioned. It is the foreign medium of instruction. What untold harm it has done to the wretched Indians can only be

a sound educational policy, all the gains might be at once set off by the foolish educational system. What a puissant part education plays in the moulding of a people's mentality many be rightly gauged by Lenin's words,--'Give me four years to teach the children, and the seed I have sown will never be uprooted.'

We cannot, therefore, proceed with the building of the future world except in the perspective of the realization that much of the successor otherwise of our task will in a great measure depend on the type of the education which will replace the one that now obtains. As such the present sytem must go lock, stock and barrel Education must be recast in method as well as content. Many a hoary idol of the market place has to be discarded. The new education will make for the growth of international sentiments so as to set against the recrudescence of national ambitions. The future citizens will be taught to look beyond patriotism. In the post-war world width of view will be the least sacrificed to intensity to gaze. Our *sin qua non* will be the eschewal of the things that disunite and the prizing of things that unite. But an only informed and effective will for reform can usher in the long-looked for era.

Universal Education

What is wrong with the world today is most emphatically not too much education, as some would suggest, but too little and that little too bad. In India and other backward countries where ignorance is still astride of the masses, the problem of universal education assumes serious proportions. Citizenship has been defined as the contribution of one's instructed judgment to the public good. Remember: to develop, men need

Educational Problems.

BLUE prints for a better and saner world are being pains-takingly devised by the United Nations The visions of a 'brave new world order' form the warp and woof of the their propaganda. Unfortunately, however, one of the weighty problems, nay in some respects the most important one, has hardly, if ever, come under the microscope for study. This indifferent attitude to the whole subject of education is highly regretable. One fails to see why any serious thought has not been bestowed on the educational problem. It must be noted that moral and aesthetic phenomena are not by-products of economic events, mere flotsam and jetsam cast upon the waves Has not this war which had its source in Germany been the logical consequence of its educational policy move them of anything else? Why is it that aggressive nationalism is so inextricably be implanted in the German Youth? We must chain this devil human civilisation is not to suffer shipwreak. Inaugurating a world broadcast on "The Reshaping of Man's Heritage," Mr. Wells said, "The supreme test before an awakening mind is the reeducating the world. Given world unity and of world sanity that would now be an easy task." The desire to make the diseased world healthier and nearer to the hart's desire of human kind is universal; but the correctives so far suggested do not touch the disease. There is an intimate connection between the right kind of education and a democratic order. However nice the blue prints might be, if they are not grounded on

nothing, and hence I am quite prepared to submit myself to the decision of this enlightened and cultured House (Cheers).

PRESIDENT:

Ladies and Gentlemen! The motion will now be put to vote. Those of you who are in favour of the subject will please hold up their hands (Counts the votes). Thanks.

Now those of you who are against the motion should please raise your hands (Counts the votes)....................

I feel a great pleasure in making the anouncement that the proposal has been defeated by an overwhelming majority (Loud cheers).

Now the meeting is dissolved.

MOHAMED BIN OMER, M.A.,
(*Osmania*).

But every member of the House would admit that this industry, inspite of all the unfriendly flings and vindictive remarks of the Hon'ble speakers, has become popular during the last few years. In this short period we cannot expect it to attain a very high standard of perfection to match Hollywood. This is neither reasonable nor even desirable. It is all the more surprising and creditable that under such circumstances, it has made tremendous progress, to command universal respect and applause. It has shown to us avenues of progress in every branch of life, and opened new channels of activity. It has introduced thoughts of equality, fraternity, righteousness and equity. It has painted every shape of character from a begger to a prince and from a fool to a sage. It is of no use for the Hon'ble speakers from the other side of the House, to hide their heads like ostrichs from these genuine facts (laughter) and think that none is observing them! If even now they are bent upon supporting the motion, then I can only say that reason is to them what pictures are to the blind and music to the deaf! (Laughter and Cheers).

PRESIDENT:

As no member of the House is coming forward, I call upon the Hon'ble Proposer to put up the rejoinder.

MR. NAIDU:

Mr. President, What I said in my speech in the beginning has not been disputed by any speaker from the side of the Opposition and whatever has been so blindly and illogically refuted by them, I am sure, I never alleged. Their objections were so absurd and contradictory that they automatically cancelled themselves out, leaving

PRESIDENT:

Order, Order, Order! (perfect silence).

.........The speaker may now continue his speech.

Mr. MURTI:

Sir, when we examine these so-called films, we find that most of them have the same plot, consisting of a chivalrous young man falling in love at first sight, with a conquettish maid. The monotany is here and there broken by villains, buffoons and tyrants. The actors and actresses sing many a time, in and out of season. There are films, Sir, in which heroes and heroines sing highly melodious and sweet songs while undergoing all the agonies and tortures of death (laughter).

These films instead of making us conscious of the present needs of the country make us luxurious and idle, and lead us into a fairy land of enchantments, superstitions and mysteries (cheers).

PRESIDENT:

Miss Sarojini will none oppose the Motion............
Miss Sarojini.

MISS SAROJINI:

Mr. President I breathed a sigh of relief when the Hon'ble speaker resumed his seat not because of the fact that he surpassed himself in the art of speaking............ without speaking at all on the subject but because of the fact that he knew nothing about the subject! (laughter).

He simply seemed to deliver an insipid homily......... like a doting priest, on the abuses of the Indian film Industry, without perhaps, having seen a single film in his whole life (laughter).

unworthy of a Mover of a debate, has made up his mind to deliver a fatal blow at this highly flourishing and purely indigenous industry (cries of "Shame).

Many Indian Film Companies, particularly, the New Theatres and Bombay Talkies have produced a number of films which along with genuine beauties of characterisation, plot, acting and representation of human life, have not a little helped in exposing the evils and weaknesses of Indian social life and delivering death blows at our degenerate habits, conventions and traditions. In short, Sir, these films have undoubtedly worked a great deal towards rural uplift, economic improvement, diffusion of knowledge, religious toleration and social reconstruction among the people of this country, in the most charming, delightful and commendable manner (cheers).

PRESIDENT:

Mr. Murti will now speak for the Proposition.........
Mr. Murti.

MR. MURTI:

Mr. President, I confess, I rather sat uneasily throughout the whole speech of the Hon'ble Leader of the Opposition, with feelings of misgiving about the soundness of his judgement and the sanity of his understandings! (laughter).

His whole speech was full of misstatements of fact, malignant remarks, perverted notions, and childish insinuations not worthy of the Hon'ble Leader of the Opposition!

(Prolonged cheers, cries of shame and some confusion).

has made a wonderful statement about the function of the Film Industry............that it should make the masses educated, cultured and civilized. This is indeed a startling discovery and he should be awarded a.. ...consolation prize for it! (laughter) I am afraid, Sir, the moment this Industry begins to perform such functions, all the theatres and cinema halls will be deserted........ of course with the solitary exception of my friend! The proper place for these functions is an educational institute or a cultural centre, where, incidentally, I wish to see the Hon'ble Proposer, when he may at least learn clever thinking, brevity of expression, sense of judgment and the art of debate! (cheers).

MR. NAIDU:

On a point of order, Sir! The Hon'ble Leader of the Opposition is making highly objectionable and irrelevant remarks.

MR. ASAF ALI:

Mr. President, my remarks have not been more objectionable and irrelevant than his own; and I am confident that no amount of interruption or interference in my speech, on his part, can deter me from exposing his his blunders and howlers (cries of "Hear, hear!").

My Hon'ble friend from the other side of the house, seems to possess no knowledge about the development of the Indian Film Industry during the last ten years. May I inform him, Sir, through you, that the Indian films have not only displaced Western Films in every part of the country; but they have also won a number of prizes in foreign Film Exhibitions and Competitions But the tragedy is that my Hon'ble predecessor, with information

An analysis of the various Indian Films will reveal the fact that they excel each other not so much in the educational, social or economic improvement of the masses as in misrepresentation of facts, racial animosity, hatred of modern life, and appreciation of all that is brutal, lawless and unreal in nature. Instead of exposing our superstitions, decrying harmful conventions and traditions and condemning the evils of Indian society, they present scenes, characters and dialogues that are as remote from reason and commonsense as my friends from the other side of the House! (cheers).

Our Indian films often eulogise foolish miscreants, ruthless adventurers, cruel potentates, effeminate heroes with fictitious characteristics and manly heroines with imaginary attributes. The incidents and events of the story have nothing to do with dramatic propriety, nor does the development of the plot pay attention to dramatic unity.

Thus we see that these films not only fall short of the present needs of Indian society but they definitely fall short of reality and truth; human life and human character. (cheers).

PRESIDENT:

Mr. Asaf Ali will now lead the opposition..........

Mr. Asaf Ali.

MR. ASAF ALI:

Mr. President. The hon'ble speaker has committed such blunders in a few minutes that it will take me years to correct them, and now, I am convinced of the fact that more absurdities can be committed in a few minutes than can be got rid of in a lifetime! The Hon'ble Proposer

I am sure, Sir, that even the Hon'ble Leader of the Opposition cannot deny the fact that the Film Industry occupies a prominent place in the educational, social and political progress of the West. nor that this characteristic is conspicuous by its absence in the Indian Film Industry.

I do not know with what ulterior motives the Hon'ble Leader of the Opposition has accepted the responsibility of paying a tribute to this degenerate industry in presence of so many factors against it. It is perhaps due to his enormous capacity for self-deception. ......which, however, seems to be his signal merit! It is perhaps due to that peculiar morbidity of mind which considers ignorance as bliss! But, Sir, neither self deception nor ignorance can hide the fact from the Hon'ble members of this enlightened House, that the most sacred duty of the Indian Film Industry is to educate the masses ....and most flagrantly it has been violating that sacred trust! (cries of Shame!) It should acquaint them with the history and greatness of the country, the industrial, economic and social needs of the people. It has so far done nothing of the kind. It should create moral and cultural values. But it has made the people more fashionable, extravagant, luxurious, and fond of all the follies presented on the silver screen.

There can be no nobler task for the Industry than to enhance the knowledge and learning of the people, and make them enlightened, cultured and civilised. When we consider the Indian Film Industry from this point of view, we are sorely disappointed......and yet the Hon'ble speakers from the other side of the House have pledged themselves to oppose the motion, against all the principles of sanity, justice and righteousness! (cries of Shame!).

A College Debate.

SUBJECT :—

That in the opinion of this House, The Indian Film Industry has failed to meet the present needs of the country.

SPEAKERS : -

1.	Proposer	Mr. Naidu.
2.	Opposer	Mr. Asaf Ali.
	For the motion ...	Mr. Vazir Hasan.
	Against the motion	Miss Sarojini.
5.	Rejoinder	Proposer.
6.	Conclusion	Mr. President.

THE PRESIDENT:

Ladies and Gentlemen, The subject for discussion is that in the opinion of this House "The Indian Film Industry has failed to meet the present needs of the country." It is indeed a very interesting subject, and I hope that the speakers will do full justice to it. Now I call upon Mr. Naidu, the Hon'ble Proposer, to place the subject before the House..............Mr. Naidu.

MR. NAIDU:

Mr. President, Sir, I have to propose that in the opinion of this House, The Indian Film Industry has failed to meet the present needs of the country.

what the weather was like in a long past August, and the name of the provincial hotel at which he had a vile meal during the summer.' Rose Macaulay writes wittily on Choosing a Religion: 'We are more interested in choosing a toothpaste than in choosing a religion,' she complains. After discussing various religions and sects, she concludes: 'I do not know, either, that you will gain much by being a Buddhist or a Confucian though these religions have their advantages. Some people are Theosophists, and have many successive lives; others are Mormons and have simultaneous wives; others are Pagans suckled in a creed outworn, and have many curious gods; others are Pantheists and worship in the Temple of Nature. It all depends on what you want. The choice is wide, and the only really dull thing is to have no religion at all.' Of topical interest is the way the essayist writes about war and peace: Hear Mr. Lynd: 'The world at peace was always beautiful in May and June, but it seems doubly beautiful when we gaze on fragments of it in a world at war. Never did the song of birds sound more restful in its sweetness............Yet even lovelier than the song of the bird is the courage one sees all about one—the courage of soldiers and the courage of those who love them and grieve to see them go.' And thinking of all the noble cities laid waste by the horrors of modern war, we may recall the words of Gardiner in writing about the ruins of Ypres, after the last war: 'One day it will rise from its ashes, its streets will resound once more with jest and laughter, its fires will be relit, and its chimneys will send forth the cheerful smoke. But its glory throughout all the ages will be the memory of the days when it stood a mound of ruins on the plain with its finger pointing in mute appeal to Heaven against the infamies of men.'

M. S. DORAISWAMI.

writing articles for a living, you will know that sometimes the difficulty is not writing the article, but choosing a subject It is not that subjects are few; it is that they are so many. It is not poverty you suffer from, but an embarassment of riches.' So as the Walrus said to the Carpenter; the modern essayist begins to talk of many things,

Of shoes — and ships and sealing-wax - -
Of cabbages - and kings -
And why the sea is boiling hot —
And whether pigs have wings!

The essayist will talk of food and drink wisely and well, as for instance Mr. Milne on Lunch: 'An invitation to dinner is formal, to tea unnecessary, to breakfast impossible, but there is a casualness about invitations to lunch, very friendly and pleasant.' Or, of lunch in the train: 'The panorama flashes by outside, nearer and nearer comes the beautiful West; you cross rivers and hurry by little villages, you pass slowly and reverently through strange old towns....................inside, the waiter leaves the potatoes next to you, and slips away.' Mr. Belloc discusses Tea and concludes humorously: '*In vino veritas.... In aqua satietas....... In........* What is the Latin for Tea? What? Is there no Latin word for Tea? Upon my soul, if I had known that, I would have left the vulgar stuff alone!' People complain of memory. Mr. Lynd is surprised at the things we remember: 'Modern man remembers even telephone numbers. He remembers the addresses of his friends. He remembers the dates of good vintages. He remembers appointments for lunch and dinner. His memory is crowded with the names of actors and actresses, cricketers, footballers and murderers. He can tell you

probably arises from our enjoyment of other people's mistakes. If we did not make mistakes, there would be nothing in the world to laugh at. Hence, if we regard laughter as a blessing, we should pay a tribute to error'! One of his volumes is entitled *The Pleasures of Ignorance.* He will write in defence of idleness exactly in the style and manner of Stevenson's Apology for Idlers. His latest volume of essays called *Life's Little Oddities* was published only in 1941. It shows him still the humorous and kindly observer of men and things. The essays are full of references to life in England today, and there are frequent allusions to war's alarums and excursions, to air-raids and sirens and rationing of meat. One essay is on Hess's Chicken and deals with the storm of public protest which followed the announcement that Herr Hess when he landed in Scotland was given roast chicken, while patriotic Englishmen and women starved and pinched. Mr. Lynd argues the case: 'The general theory seems to be' he says 'that you should not give a bad man chicken.........But a proverb tells us to give the devil his due.........Do not complain if he gets a little chicken. To do so is a waste of that excellent emotion, moral indignation.'

The modern essayist is concerned with life, with men and manners. He is a humorous commentator on life and often he brings in a good deal of philosophy and thought into the little sketch. The subject may be 'serious or trifling, about God and Spinoza, or about turtles and Cheapside.' 'Let us write essays on a stray cat or a coloured cloud' is the counsel of Chesterton. 'Let us talk about, well, anything, you will. Goldfish, for instance,' says A. A. Milne. Says A. G. Gardiner: 'I wanted a subject for an article. Now if you are accustomed to

Gardiner's work is notable for its quiet humour and humanity, its cheerfulness and his fine sense of style. He, too, shows a variety in subject and in treatment: He will write essays On Choosing a Name, On Catching the Train, On Talking to Oneself, On Umbrella Morals, (where he houmorously discusses the ethics of exchanging your umbrella for a better one in the hall-stand!) On Living Again with its fine philosphical conclusion: 'We are all glad to have come this way once. It is the thought of a second journey over the same ground that chills us and gives us pause......Yet if life is to be lived here again, it must be lived on the same unknown terms in order to be worth living. We must come as we came before, like wanderers out of eternity for the brief adventure of time.' What can be more fitting than the conclusion to his essay On Falling in Love: 'In short there is no formula for falling in love. Each one does it as the spirit moves.'

E. V. Lucas, editor and biographer of Lamb, has brought back the spirit of Elia into the modern essay. He is in many ways different from his hero; he lacks his wit and whimsicality, his quaintness and his archaism of thought and style. Yet his essays are marked by fancy and delicate sentiment, a light vein of humour and charm. Lucas has also given us a new and original type of writing, a blend of the novel and the essay in what he calls his 'entertainments' in books like *Over Bemerton's* and *Listener's Lure.*

Mr. Robert Lynd is among the most popular of modern essayists. His charm consists in his 'familiar. discursive and humorous style' and in his whimsicality derived and imitated from Charles Lamb. He will defend lost causes; he will argue in praise of mistakes, saying 'All comedy

'humorous dogmatic statement and the brilliant and effective use of paradox.' Here is an example: 'Most people either say that they agree with Bernard Shaw or that they do not understand him. I am the only person who understands him, and I do not agree with him.' His subjects are various. He writes on Pigs as Pets, On Running after One's Hat, On a Piece of Chalk, On Lying in Bed. In his volume *As I was Saying* there are essays About Poetry, About Blondes, and About Coleridge. A little group further down includes essays About Morris, About Widows and About Relativity!

This variety of subject-matter is the mark and characteristic of all modern essay literature. What shall we say of Hilaire Belloc whose successive collections of essays appeared under the titles *On*, *On Something*, *On Everything*, *On Anything* and even *On Nothing*. He defends the last title by saying that 'There is in Nothing some-thing so majestic and so high that it is a fascination and spell to regard it!' And this volume *On Nothing and Kindred Subjects* contains essays on Tea, On Railways and Things, On a Dog and a Man also, on Lords, On the National Debt, On Death and On Coming to an End.

A. G. Gardiner made his mark by his sketches of his distinguished contemporaries in the Saturday Daily News. These were collected together in two volumes as *Prophets, Priests and Kings* and *Pillars of Society*. Later volumes of Mr. Gardiner contained essays which had originally appeared in the Star and were entitled *Alpha of the Plough*, (the pseudonym under which he wrote for many years), *Pebbles on the Shore* (a volume of essays written during the last war, 'pebbles gathered on the shore of a wild sea' as he calls them,) *Leaves in the Wind* etc,

In spite of all this, however, it seems likely that some of the work is such as 'the world will not willingly let die.' The list of great modern English essayists begins with Mr. Max Beerbohm and includes many of the most famous contemporary men of letters—G. K. Chesterton, Hilaire Belloc, H. G. Wells, A. G. Gardiner, E. V. Lucas, Robert Lynd, C. E. Montague and literary critics like Augustine Birrell, Austin Dobson, Edmund Gosse, Middleton Murry and J. B. Priestley.

Max Beerbohm produced in 1896 his first volume under the impressive title of *Works of Max Beerbohm* and in 1912 he wrote his inimitable parodies of his contemporaries like Shaw, Wells and Conrad in *A Christmas Garland*. His volume *And Even Now* contains his excellent sketch of Swinburne and Watts-Dunton in the essay, *No. 2 The Pines*. It was really Mr. Beerbohm who revived the essay of personal comment and intimate revelation, so characteristic of Charles Lamb's *Essays of Elia*. And in style as in subject, Beerbohm showed his originality and his charm. After Beerbohm, we might mention G. K. Chesterton, who, besides writing poems, plays, novels, short stories, history, biography and criticism, still produced 'copy' for the newspapers and periodicals and collected his essays in more than thirty volumes! The titles show their inconsequence: *As I was Saying*, *Generally Considered*, *Tremendous Trifles* etc. His essays are critical, descriptive or argumentative and it is in the last type of writing that he particularly excels. He declared that 'the gloomy pleasure of his life had been defence of orthodoxy and the pursuit of heretics.' In volume after volume he defends Catholicism and the glory and greatness of the Middle Ages. The two qualities of his style have been well defined as

The Modern English Essay.

'ALWAYS the journalist writing for the day only,' was the comment of one of his biographers on Gilbert Keith Chesterton. The verdict may be passed on the whole group of writers of the essay in modern English; yet it would be unfair considering how much of their work is likely to endure. Of course it is not easy to write day after day, week after week, 'to write for busy people catching trams or trains in the morning or for tired people coming home in the evening' and still maintain a high quality of subject-matter and of style. Mr. Milne lets us engagingly into the secret of how much of the writing is done: 'Sometimes when the printer is waiting for an article which really should have been sent to him the day before, I sit at my desk and wonder if there is any possible subject in the whole world upon which I can possibly find anything to say.' Mr. Lynd has been writing the 'middle' article in the *New Statesman* for more than twenty years every week on the appointed day at the appointed hour, and the lot of other contemporary essayists has not been much better. Many have written for newspapers and periodicals and written regularly for years, not always because they were bursting with something to say but because 'they had to suck their sustenance through the quill.' Chesterton, in the preface to one of his volumes of essays collected from periodicals, says: 'It is a collection of crude and shapeless papers upon current or rather flying subjects......... They were written, as a rule, at the last moment; they were handed in the moment before it was too late.'



MR. KHAJA MOINUDDIN B. A. (OSMANIA).

"He has written a number of books on international affairs. He has started an institution for coaching the candidates who wish to appear at H. C. S. competitive Examination. I understand that this institution has achieved good success under his direction". Says our P. V. C. about him.



MR. MAHMOOD ALI KUTBI,

B. A. LL. B. (OSMANIA).

He is one of the most brilliant students of our University. He has obtained the highest marks amongst the first class candidates of LL. B. this year.



MR. QAZI AHMED KABEERUDDIN,
B. A. (OSMANIA).

He is a prominent student of our University. Now he has been selected as Civil Gazetted Officer on His Majesty's Ordnance Services.



MR. SYED MOHAMED ALI,
B. A. (OSMANIA).

He is an all round Sportsman and first class athlete ... the Inter college and Inter ... Sports champion ... respectively this year. He is also ... of the ...

Editorial

WITH this issue, our Magazine nears the completion of the sixteenth year of its life.

We received with joy and pride an unprecedented number of articles for the second issue this year and offer our hearty thanks to our contributors for their keen interest in the Magazine, but as the number of the articles received was far more than what we could include, many of them have had to be withheld for sheer want of space. We request our contributors to wait patiently till the next issue, when some of them may see themselves in all the glory of print.

We deliberately refrain from comments on the articles published, lest we should be accused of the proverbial vanity and self-conceit of literary critics; therefore we leave the task of evaluating the merits and demerits, should there be any, of the articles to the critical faculty of the readers themselves.

For long, a rather unhappy feature of our Magazine has been the scarcity of contributions from the Zenana College despite several reminders. That there is no dearth of talent in the Women's College has been amply demonstrated by examination results. We are, hence, at a loss to understand the silence of the lady students, but we hope we will have, now, no occasion to repeat this complaint.

SAEED AHMED MEENAI,
M.A., (*Previous*).

Contents

Annual Subscription.

1.	Present Students, Osmania University	4
2.	Old Boys, Members of the Teaching Staff	5
3.	General Subscribers	6
4.	Single Copy	2

Note:—**Registration and V. P. Charges Extra.**

Can be had of:

OSMANIA MAGAZINE OFFICE

OSMANIA UNIVERSITY

HYDERABAD-DECCAN.

The Osmania Magazine

Vol. XVI. No. 2.

THE

OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

The Osmania University

HYDERABAD-DECCAN.

Managing Editor:
MOHAMED ALI NAYYER, M.A. (Final).

Editor:
K. R. REDDY, M.A.
(Final)

Asst. Editor:
SAEED AHMED MEENAI, M.A.
(Previous)

Vol. XVI. 1943 No. 2.



Mana[illegible] Edi[illegible]

MOHAMMED ALI [illegible]AYY[illegible]R, M.A. [illegible]

DUE DATE

Cl. No. __________ *Acc. No.* __________

Late Fine Ordinary Books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night Book Re. 1/- per day.
